زیب ملیح آبادی

دُنیا کی تاریخی و رُومانی داستانیں

زیب ملیح آبادی

دُنیا کی تاریخی و رُومانی داستانیں

زیب ملیح آبادی

الحق پبلشرز۔ لاہور

تاریخ اشاعت : فروری ۲۰۰۳ء

دُنیا کی تاریخی و رومانی داستانیں

زیب طبع آبادی

ناشر : محمود عاصم
سرورق : ذاکر
کمپوزنگ : الاشراق کمپوزنگ سنٹر لاہور اداہ خرم آرٹس لاہور
خطاطی : عبدالحمید حیدر
پروف ریڈنگ : ڈاکٹر خالد پرویز ہاشمی
طابع : چودھری طاہر حمید پرنٹرز۔ لاہور
تعدادِ اشاعت : ۵۰۰
قیمت : ۳۰۰/- روپے

لیگل ایڈوائزر: نوید عباس سیّد (ایڈووکیٹ ہائیکورٹ)

یکے از مطبوعات:
الحق پبلشرز فرسٹ فلور پنجاب پلازہ، نیو اُردو بازار لاہور

اِنتِساب

درویش صفت اور منکسر المزاج

جناب شاہد احمد بھٹہ

کے نام

جن کا علمی شغف اور ادب دوستی میرے لئے وجۂ افتخار ہے

زیب مَلیح آبادی

ترتیب

☆ ☆ ☆

پہلی بات

ہمارے دور کا ایک شاعر حیران ہو کر یوں پکار اٹھتا ہے۔

نہ جانے کہاں کھو گئی ہے محبت
بڑی دور تک تو مرے ساتھ آئی

مقصد یہ کہ محبت نے انسان کے ساتھ صدیوں مطابقت کی اور قدم قدم پر اسے محبت کا درس دیا ہے کہ یہ ایک آفاقی جذبہ ہے اور بلاتخصیص ہر قوم و نسل اور طبقے میں اس کی نشوونما ہوتی رہی ہے۔ مشرق اور مغرب کا کوئی امتیاز یا رنگ و نسل کا کوئی فرق اس کی آفاقیت اور ہمہ گیریت کو متاثر نہیں کر سکا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں کی لیلیٰ ہو یا ایرانیوں کی شیریں، مغلوں کی نور جہاں اور انار کلی ہو یا مغرب کی قلوپطرہ اور میری مارتھا اسی طرح بنگال کی حور محل ہو یا ہندوؤں کی شکنتلا ان سب کا جذبہء محبت بلا استثنا آفاقی اور مثالی حیثیت رکھتا ہے، جس کو کسی خاص سرزمین سے وابستگی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جذبہء محبت کو ہر فرد نے کسی تخصیص کے بغیر قابلِ قدر جانا اور مثالی قرار دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہانی کے دروبست نے ان کرداروں کو روایتی اور قدرے یکسانیت عطا کی ہے جس سے یہ کردار اپنے ایثار و قربانی کی وجہ سے ایک جیسے سمجھے جاتے ہیں اور مولانا حالی کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ

قیس ہو، کوہ کن ہو یا حالؔی — عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

جذبہء محبت ہمہ گیر ہے اور یہ انسانی سرشت اور عشقیہ کہانی کے لیے ایک لازمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بنت میں روایات کو خاصا دخل ہے اور اسے یکساں انسانی جذبے کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہر کہانی اور عشق سے منسوب ہر داستان ایک جیسی لگتی ہے۔

زیرِنظر کتاب کے کردار بھی ہر چند کہ عشق و محبت سے وابستہ ہیں لیکن ان سے منسوب ہر جذبہ ایک جیسی دلچسپی رکھتا ہے۔ بہ ایں ہمہ ان سب میں انفرادیت اور دلچسپی برقرار نظر آتی ہے۔ یہی اوصاف مشرق و مغرب کی عشقیہ داستانوں کو اپنی پوری یکسانیت کے باوجود دوام بخشتے ہیں اور یہی ان کا طرہ امتیاز ہے جو انہیں آفاقیت عطا کرتا ہے تاہم اس کتاب کے کرداروں میں اگر قارئین یکسانیت محسوس کریں تو اسے محبت کے امر جذبے کا معجزہ قرار دیا جانا چاہیے کہ اقبالؔ کے لفظوں میں ؎

محبت خویشتن بینی، محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

کہنا یہ ہے کہ کہانی کو کہانی سمجھا جائے اور اس میں واقعہ کی سچائی تلاش نہ کی جائے اور نہ ہی اس کتاب میں تاریخی حقائق کو کھوجا جائے، واقعہ اور اس سے منسوب جذبے کی کشش اس کی دلچسپی کی بنیاد ہے۔ کسی حقیقت پسند شاعر نے واقعہ اور قصہ کے فرق کی نشان دہی یوں کی تھی۔

تمام احتیاطِ محبت کو سامنے رکھ کر
انہوں نے قصے سنے میں نے واقعات کہے

ان صفحات میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ قصے سے ہم آہنگ ہے، تاریخ کی صداقت سے مملو سمجھنے والے اس کی جزئیات میں حوالے تلاش کر کے ذہنی پریشانی کا باعث بنیں کہ یہ تاریخ سے زیادہ افسانے سے قربت رکھتے ہیں اور یہ تو سب سے بڑی صداقت ہے کہ افسانہ زیادہ دلچسپ اور ذہن و قلب سے زیادہ قریں ہوتا ہے۔

(ناشر)

یمن کی عظیم المرتبت

ملکہ بلقیس سبا

یمن کی عظیم المرتبت ملکہ بلقیس اور حضرت سلیمانؑ کی ایمان افروز کہانی

بی بی بتشبع نے حضرت داؤد سے فرمایا۔ ''آپ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ تخت و تاج کا وارث...... اور بنی اسرائیل کا آئندہ بادشاہ میرا بیٹا سلیمان ہوگا۔''

حضرت داؤد علیہ السلام اپنی چہیتی بیوی کی بات پر چونک پڑے، پھر نرمی سے بولے۔ ''بتشبع! مجھے بھی سلیمان سب بیٹوں سے زیادہ عزیز ہے اور میری بھی یہی خواہش ہے کہ میرے بعد سلیمان ہی بنی اسرائیل کی شہنشاہی کی باگ ڈور سنبھالے لیکن......''

بی بی بتشبع نے شوہر کی بات کاٹ دی اور ذرا شوخی اور سختی سے کہا۔ ''لیکن ویکن کچھ نہیں، آپ دوٹوک فیصلہ کیجیے۔ کیا آپ کے تمام بیٹوں میں سلیمان سب سے زیادہ عقلمند اور دلیر نہیں۔''

''ضرور ہے۔ میں انکار تو نہیں کرتا۔'' حضرت داؤدؑ نے بتشبع کی بات کی تصدیق کی۔

''کیا وہ سب سے زیادہ انصاف پسند نہیں اور کیا آپ اس کے فیصلوں کو پسند نہیں کرتے؟'' بی بی بتشبع نے دوسری دلیل پیش کی۔

حضرت داؤدؑ نے بی بی بتشبع کی اس رائے سے بھی اتفاق کیا تو وہ بولیں۔ ''اور کیا آپ کو یاد ہے کہ جب میرا سلیمان پیدا ہوا تھا تو ناتن نبی نے آپ کو خوشخبری سنائی تھی کہ یہ بچہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے؟''

''مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔'' حضرت داؤدؑ نے سنجیدہ لہجے میں فرمایا۔

''تو پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ ناتن نبی نے یہ بھی کہا تھا کہ اللہ نے اس بچے کا نام یدبدیاہ تجویز فرمایا ہے۔'' بی بی بتشبع دلیلوں پر دلیلیں دے کر حضرت داؤدؑ کو زچ کرنا چاہتی تھیں۔ تاکہ وہ صاف الفاظ میں حضرت سلیمان کی ولی عہدی کا اعلان کر دیں۔

حضرت داؤدؑ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''بتشبع! ہمارا سلیمان سب سے زیادہ خوبصورت' دلیر اور منصف مزاج ہے۔ مجھے اس سے محبت بھی زیادہ ہے لیکن یہ ایک ملکی اور انتظامی معاملہ ہے۔ مجھے اور بھی بہت سی باتیں دیکھنا ہیں۔ سلیمان کے بہت سے بھائی بہن ہیں۔ میں چاہتا ہوں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔''

بی بی بتشبع بڑی عاقلہ تھیں۔ فوراً بولیں۔ ''تخت و تاج کا وارث ہمیشہ وہ ہوتا ہے جس میں دوسروں کی نسبت زیادہ خوبیاں ہوں۔ جسے زیادہ لوگ پسند کرتے ہوں اور پھر آپ کے فیصلے سے کون انکار کر سکتا ہے؟''

''بتشبع! ضد نہ کرو۔'' حضرت داؤدؑ نے پھر سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ ہمیں اپنی محبت کی وجہ سے سلیمان کی خامیاں نظر نہ آتی ہوں۔ اس کے لیے سرداروں سے مشورے کی ضرورت ہے۔ سلیمان کے دوسرے بھائیوں کے حق پر بھی غور کرنا ہے۔''

مورخین نے بی بی بتشبع کا نام کئی طریقوں سے لکھا ہے۔ کسی نے باتشبا لکھا ہے تو کہیں باطشبہ اور بنت سبع درج ہے۔ بی بی بتشبع سے حضرت داؤدؑ نے بیت المقدس (یروشلم) میں پہنچ کر عقد کیا تھا۔ حضرت داؤدؑ کی دوسری خاص خاص بیگمات کے نام اخنوعم' محکہ 'ابی طال' حجیت اور عجلقہ ہیں۔ بعض تاریخوں میں ایک اور بیوی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جن کا نام ابی غائل تھا۔

بی بی بتشبع نہایت خوبصورت اور حسین خاتون تھیں۔ ان کے باپ کا نام انعام اور پہلے شوہر کا نام اوریا تھا۔ حضرت داؤدؑ نے اوریا کی شہادت کے بعد بتشبع سے نکاح کیا تھا۔

روایت ہے کہ بی بی بتشبع کے ساتھ' آپ نے خواہش نفسانی کے تحت نکاح کیا تھا- اس لیے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا اور حضرت داؤدؑ پر عتاب نازل فرمایا- حضرت داؤدؑ نے بڑی توبہ استغفار کی تب جا کے آپ کو معافی ملی- بتشبع تمام بیگمات سے زیادہ خوبصورت اور عقلمند تھیں- اس لیے وہ حضرت داؤدؑ کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی تھیں- چونکہ آپ پر ان کے سلسلے میں ایک بار عتاب نازل ہو چکا تھا- اس لیے اس شدید چاہت کے باوجود حضرت داؤدؑ بتشبع کے معاملے میں بڑی احتیاط برتتے تھے کہ کہیں ان سے پھر کوئی ایسی غلطی نہ ہو جائے جس کی وجہ سے انہیں دوبارہ خدا کے عتاب کا سامنا کرنا پڑے-

بی بی بتشبع نے بڑی کوشش کی- طرح طرح کی دلیلیں دیں' خفا بھی ہوئیں لیکن اس شب حضرت داؤدؑ نے حضرت سلیمانؑ کو ولی عہد بنانیکا وعدہ نہیں کیا- کہتے ہیں کہ عورت کو جب کسی بات کی دھن لگ جائے تو وہ اس میں کامیابی حاصل کر کے چھوڑتی ہے- بی بی بتشبع بھی حضرت داؤدؑ پر برابر زور دیتی رہیں کہ وہ سلیمانؑ کو ولی عہد بنا دیں-

پھر سلیمان میں قدرت نے وہ تمام خوبیاں سمودی تھیں جو ایک ایسے بشر میں ہوتی ہیں جسے خداوند تعالیٰ نبوت پر سرفراز کرنا چاہتا ہے- ان محاسن اور خوبیوں کا اظہار سلیمان سے ہوتا رہتا تھا- آخر حضرت داؤدؑ نے کچھ بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر کچھ حضرت سلیمان کی غیر معمولی باتوں اور ذہانت سے مجبور ہو کر انہیں ولی عہد بنانے کا وعدہ فرمالیا-

حضرت داؤدؑ نے وعدہ تو فرمالیا لیکن دل میں ڈرتے رہے کہ ان کا یہ فعل کہیں خدا کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور پھر وہ کسی بلا میں گرفتار نہ ہو جائیں- وہ دوسرے بیٹوں کی طرف سے بھی متفکر تھے- حضرت سلیمانؑ عقل و دانش اور شجاعت و سیاست میں ہر چند کہ سب سے افضل تھے پھر بھی انہیں یہ فکر تھی کہ اگر بیٹوں نے ان کا یہ فیصلہ تسلیم نہ کیا تو خواہ مخواہ کا ایک جھگڑا پیدا ہو جائے گا- اس سلسلے میں انہوں نے اپنے سرداروں سے بھی کھل کر مشورہ نہیں کیا

تھا۔

یہ تمام باتیں ایسی تھیں جن کو ذہن میں رکھتے ہوئے حضرت داؤدؑ نے سلیمان کو ولی عہد تو کر لیا لیکن اس کا اعلان نہیں کیا۔ وہ اس سلسلے میں خدا سے رہنمائی کے خواہش مند تھے اور چاہتے تھے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے جس سے حضرت سلیمان کی برتری، تمام بھائیوں پر ثابت ہو جائے اور عوام بھی حضرت سلیمان کو سب سے افضل مان لیں۔

حضرت سلیمان کی قسمت میں نبوت پہلے ہی لکھی جا چکی تھی چنانچہ جب حضرت داؤدؑ نے گڑگڑا کر خدا کے حضور میں سجدے کئے تو ان کی مشکل کو آسان کرنے کے غیب سے سامان پیدا ہو گئے۔ حضرت داؤدؑ کی عمر سو سال سے تجاوز کر گئی تو بی بی بتشبع کا اصرار اور بڑھا کہ سلیمان کو ولی عہد بنانے کا اعلان کر دیا جائے تا کہ بعد میں ہنگامہ نہ کھڑا ہو۔ حضرت داؤدؑ اسی تردد میں تھے کہ دریائے رحمت جوش میں آیا عرش اولیٰ پر حضرت جبرائیل کو حکم ہوا کہ اے جبرائیل جاؤ اور میرے نیک بندے کی مشکل آسان کرو۔

حکم خداوندی ہوتے ہی حضرت جبرائیل زمین پر تشریف لائے...... حضرت داؤدؑ اس الجھن میں سر بسجود تھے اور رہنمائی کی دعا مانگ رہے تھے۔ اسی وقت ان کے کانوں میں حضرت جبرائیلؑ کی آواز پہنچی۔

''اے خدا کے نبی! سجدے سے سر اٹھائیے۔ خداوند قدوسی نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔''

حضرت داؤدؑ نے سجدے سے سر اٹھایا۔ آپ کی آنکھوں میں بوجہ رقت آنسو لرز رہے تھے۔ قاصد آسمانی کو سامنے پایا تو دل باغ باغ ہو گیا۔

حضرت جبرائیلؑ نے کہا۔ ''ذات باری تعالیٰ نے عرش اعلیٰ سے ایک تحفہ آپ کے لئے بھیجا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے حضرت جبرائیلؑ نے ایک صندوقچہ حضرت داؤدؑ کی طرف بڑھا دیا۔

حضرت داؤدؑ نے صندوقچہ حضرت جبرائیلؑ سے لے کر آنکھوں سے لگالیا اور اسے کئی بوسے دیئے پھر پوچھا۔

''اے مکین عالم بالا! اس کے اندر کیا ہے اور اس حقیر و گنہگار کے لئے خالق دو جہاں کا کیا حکم ہے؟''

حضرت جبرائیلؑ بولے۔ ''حکم باری ہے کہ آپ اپنے تمام بیٹوں کو بلوائیں۔ رؤسائے سلطنت اور اراکین سلطنت کو بھی حاضری کا حکم دیں پھر اس صندوقچے کو سب کے سامنے رکھ کر ہر لڑکے سے باری باری سوال کریں کہ وہ بتائیں' اس صندوقچے میں کیا ہے؟ آپ کا جو لڑکا' اس صندوقچے کے مضمرات سے پردہ اٹھائے اور اس میں موجود چیزوں کی تفصیل اور اثرات بیان کرے وہی بنی اسرائیل کا بادشاہ اور خدا کا برگزیدہ نبی ہوگا۔''

یہ سنتے ہی حضرت داؤدؑ پھر سجدے میں گر پڑے اور خدا کا شکر بجالائے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا اور فکر و تردد سے نجات مل گئی۔

سجدے سے سر اٹھانے کے بعد حضرت داؤدؑ نے کہا۔ ''اے' مقرب بارگاہ! میں تیرا بھی شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے ایسی خبر پہنچائی ہے جو نور ایمان میں تابانی پیدا کرتی ہے اور جس کی وجہ سے مجھے ایک قدیم ذہنی بوجھ سے نجات مل گئی۔''

حضرت جبرائیلؑ بولے۔ ''بس' اے خدا کے نبی! آپ دیر نہ کیجئے اور تمام لوگوں کو فوراً بلوایئے۔ مجھے حکم ہے کہ تمام کارروائی کے دوران میں موجود ہوں اور آپ کو مشورہ دیتا ہوں۔''

حضرت داؤدؑ نے اپنے بیٹوں کو بلوا بھیجا اور ایک بڑا دربار لگایا جس میں سلطنت کے تمام چھوٹے' بڑے سرداروں اور معززین کو مدعو کیا گیا حضرت داؤدؑ کے سب سے بڑے بیٹے کا نام اسنون تھا اور یہ اخنوعم بزرعیل کے بطن سے تھا دوسرا بیٹا کیلاب' ابی غیل کے پیٹ سے

تھا- تیسرا بیٹا تلمی یا قلمی، شاہ جستور کی بیٹی محکہ سے تھا- چوتھے بیٹے کا نام اوونیاہ اور اس کی ماں کا نام حجیت تھا- پانچویں کا نام سفطیا اور ماں کا نام ابی طال تھا- چھٹا بیٹا شرعام تھا اور یہ عجنتہ کے بطن سے پیدا ہوا تھا- حضرت داؤدؑ کے وہ بیٹے...... جو بیت المقدس میں آ کے پیدا ہوئے، ان میں شموع، سوباب، تاش، سلیمانؑ ایماز، الیوٗنفج، بفیح، الہداع اور الیفط ہیں- ان کے کئی بیٹیاں بھی تھیں- حجیت کا بیٹا اودنیاہ سب سے زیادہ فتنہ پرور اور فسادی تھا- وہ حضرت سلیمانؑ کا جانی دشمن تھا کیونکہ حضرت داؤدؑ حضرت سلیمان کو سب سے زیادہ چاہتے تھے-

جب دربار لگ گیا اور تمام لوگ آ گئے تو حضرت داؤدؑ دربار میں تشریف لائے- ان کے ساتھ حضرت جبرائیلؑ بھی تھے- حضرت جبرائیلؑ سوائے حضرت داؤدؑ کے کسی اور کو نظر نہ آ رہے تھے- وہ، حضرت جبرائیلؑ کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے کیونکہ یہ ہدایت دراصل احکام الہیٰ تھے جو حضرت داؤدؑ کو حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے پہنچائے جا رہے تھے-

حضرت داؤدؑ نے تمام اہل دربار اور اپنے بیٹوں پر نظر ڈالی اور فرمایا...... ''اے میرے بیٹو اور درباریو! میں اب عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں کہ کسی وقت بھی خالق حقیقی سے مل سکتا ہوں- میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں اس عظیم سلطنت اور قوم بنی اسرائیل کا وارث مقرر کر دوں- میرے تمام بیٹے یہاں موجود ہیں اور بحیثیت باپ کے میری نظروں میں سب برابر ہیں- اس لئے یہ مشکل ہے کہ میں کسی ایک کو ولی عہد نامزد کروں-''

حضرت داؤدؑ سانس لینے کے لئے رکے ہی تھے کہ ان کا سب سے بڑا بیٹا اسنون کھڑا ہو گیا اور جلدی سے بولا- ''بابا جان! سب جانتے ہیں کہ عمر کے لحاظ سے میں اپنے تمام بھائیوں میں بڑا ہوں- اس لئے آپ کی وراثت کا سب سے پہلے میں حقدار ہوں-''

اسنون کی بات ختم ہوتے ہی آپ کا چوتھا بیٹا اوونیاہ کھڑا ہو گیا اور تیز لہجے میں بولا- ''بابا جان! شہنشاہی کرنے کے لئے بہادری اور شجاعت سب سے زیادہ ضروری ہے- آپ

جانتے ہیں کہ میں اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ بہادر ہوں- ان میں سے کوئی بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا- اس لئے تخت و تاج کا حقدار میں ہوں-''

آپ کے ایک اور بیٹے کیلاب کو غصہ آ گیا- اس نے کہا- ''تخت اور تاج کے لئے صرف بہادری کافی نہیں- اس کے لئے عقل و دانش پہلی شرط ہوتی ہے اور تمام اہل دربار جانتے ہیں کہ فہم و فراست میں' کوئی بھائی' میری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا-''

دربار میں شور و غل سا مچ گیا- تمام بھائی بولنے لگے- ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے سے افضل بتا رہا تھا صرف سلیمانؑ جو عمر میں سب سے چھوٹے تھے' ایک طرف خاموش بیٹھے اس ہنگامے کو دیکھ رہے تھے حضرت داؤدؑ نے مجبور ہو کر سب کو اشارے سے چپ ہو جانے کا حکم دیا اور آہستہ آہستہ دربار میں خاموشی چھا گئی-

حضرت داؤدؑ نے فرمایا- ''میرے بچو! اس ہنگامے اور فتنے فساد کو ختم کرنے کے لئے میں حکم خداوندی سے تم سے کچھ سوالات کروں گا- میرا جو لڑکا ان سوالات کے صحیح جواب دے گا' وہی میرا ولی عہد ہو گا اور اللہ تعالیٰ اسے نبوت کے درجے پر بھی سرفراز فرمائے گا-''

حضرت داؤدؑ نے اتنا کہہ کر آسمانی صندوقچہ اپنے سامنے رکھا اور بڑے بیٹے سے سوال کیا- ''اسنون! تم میرے بڑے بیٹے ہو' اس لئے سب سے پہلے میں تم سے پوچھتا ہوں- مجھے بتاؤ کہ اس صندوقچے میں کون کون سی چیزیں ہیں؟''

اس زمانے میں سحر اور جادو کا بھی بہت زور تھا اور بڑے بڑے کاہن جادو کے زور پر عجیب عجیب تماشے دکھایا کرتے تھے- حضرت داؤدؑ کے کئی بیٹے ایسے کاہنوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے- اسنون کا کاہن' اس کے پاس ہی بیٹھا تھا- اس نے چپکے سے پوچھا کہ وہ بتائے' اس صندوقچے میں کیا ہے؟ لیکن خدائی طاقت کے سامنے کس کا زور چل سکتا ہے وہ صندوقچہ آسمانی تھا' اس کے اندر جو کچھ تھا' اس کا حال تو خدا ہی جانتا تھا یا پھر وہ شخص جسے خدا

خود مطلع کرے۔

اسنون کا کاہن ناکام ہوگیا تو اس نے کھڑے ہوکر کہا۔ ''باباجان! میں نہیں بتاسکتا کہ اس صندوقچے میں کیا ہے۔''

پھر حضرت داؤدؑ نے دوسرے بیٹے سے وہی سوال کیا۔ ''وہ بھی جواب دینے سے قاصر رہا پھر تیسرا' چوتھا' یہاں تک کہ تمام لڑکوں نے شکست تسلیم کرلی اور کوئی نہ بتاسکا کہ صندوقچے میں کیا راز ہے۔

اب صرف حضرت سلیمانؑ باقی رہ گئے تھے۔ حضرت داؤدؑ نے سلیمانؑ کی طرف دیکھا۔ سلیمانؑ کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اللہ سے لو لگائے ہوئے ہوں اور ان کی نظریں عرش اعلیٰ کا طواف کررہی ہوں۔

حضرت داؤدؑ نے ان سے پوچھا۔ ''سلیمان! اب صرف تم باقی رہ گئے ہو۔ تمہارے تمام بھائی' صندوقچے کے راز سے پردہ اٹھانے میں ناکام ہوچکے ہیں۔ کیا تم بتاسکتے ہو' اس کے اندر کیا ہے؟''

باپ کی آواز حضرت سلیمانؑ کے کانوں میں پہنچی تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور حضرت داؤدؑ کی طرف دیکھا۔ سلیمانؑ کی آنکھوں سے اس وقت عجیب طرح کی ملکوتی شعاعیں منعکس ہورہی تھیں اور انہیں دنیا کی ہر پوشیدہ چیز' آئینے کی طرح نظر آرہی تھی۔

سلیمانؑ بڑے ادب سے بولے۔ ''باباجان! اگر حکم ہو تو میں ناچیز اس راز سے پردہ اٹھاؤں؟''

حضرت سلیمانؑ کے بھائیوں اور درباریوں نے اس کمسن شہزادے کو حیرت سے دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جس راز کو دربار کے بڑے بڑے کاہن نہ سمجھ سکے' اس راز

سے یہ شہزادہ کس طرح پردہ اٹھا سکے گا۔

حضرت داؤدؑ نے فرمایا۔ ''سلیمان بیٹے! یہ میرا سوال ہے۔ اس میں میرے حکم کو دخل نہیں۔ اگر تم بتا سکتے ہو کہ اس صندوقچے میں کیا ہے' تو میری طرف سے اجازت ہے۔''

حضرت سلیمانؑ نے دل میں بسم اللہ کہا اور بڑی متانت سے جواب دیا۔ ''اے' خدا کے نبیؑ اور میرے مشفق باپ! اس صندوقچے میں ایک انگشتری' ایک چابک اور ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا ہے۔ اس کے علاوہ' اس میں اور کوئی چیز نہیں۔''

حضرت داؤدؑ نے سب کے سامنے صندوقچہ کھولا اور اس میں سے سامان نکالا تو اس میں ان تین چیزوں کے سوا اور کچھ نہ تھا حضرت داؤدؑ کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں خدا کا شکرادا کیا جس نے ان کے بتشبع سے کٹے ہوئے وعدے کی لاج رکھ لی۔ حضرت سلیمانؑ کے تمام بھائی شرمندہ اور حیران تھے' کا ہن دانتوں میں انگلیاں دبائے بیٹھے تھے۔

پھر حضرت داؤدؑ نے جبرائیلؑ کے اشارے پر کہا۔ ''سلیمان! تم نے ایک سوال کا جواب تو دیا ہے لیکن تمہارا جواب ابھی نامکمل ہے۔ تمہیں یہ بھی بتانا ہوگا کہ اس تہہ کئے ہوئے کاغذ میں کیا لکھا ہوا ہے؟''

حضرت سلیمانؑ نے اس طرح جواب دیا جیسے وہ کھلا ہوا خط پڑھ رہے ہوں۔ انہوں نے کہا۔ ''باباجان! اس بند خط میں پانچ مسائل تحریر ہیں۔ پہلا مسئلہ ایمان' دوسرا محبت' تیسرا عقل' چوتھا شرم اور پانچواں مسئلہ طاقت کا لکھا گیا ہے۔''

حضرت داؤدؑ نے فرمایا۔ ''سلیمان! یہ جواب اس وقت تک اب بھی نامکمل ہے جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ اس میں سے ہر مسئلے کا قرار' انسان کے بدن کے کس حصے میں ہوتا ہے؟''

حضرت سلیمان نے فوراً جواب دیا- ''اے نبی خدا! ایمان اور محبت کا قرار دل میں ہوتا ہے' عقل کی جگہ سر ہے' شرم کا مقام آنکھیں ہیں اور طاقت' ہڈیوں میں قرار پاتی ہے-''

حضرت داؤدؑ فرط محبت سے اٹھ کھڑے ہوئے- انہوں نے حضرت سلیمانؑ کو سینے سے لگا لیا اور اسی وقت' انہیں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا- حضرت داؤدؑ نے وہ انگشتری آسمانی (سلیمانی انگوٹھی) اپنے دست مبارک سے سلیمانؑ کی انگلی میں پہنا دی اور چابک بھی انہیں عنایت کر دیا- اس کے ساتھ ہی انہوں نے بوجہ پیران سالی' تخت و تاج سے دست برداری کا اعلان کر کے حضرت سلیمانؑ کو بادشاہ بنا دیا- تمام درباریوں نے بظاہر حضرت سلیمانؑ کو بادشاہ تسلیم کر لیا لیکن ان کے بعض بھائی' اس سے خوش نہ تھے-

حضرت جبرائیلؑ کا کام ختم ہو چکا تھا- جانے سے پہلے انہوں نے حضرت داؤدؑ کو بتایا کہ اس انگشتری میں یہ قوت ہے کہ جس انگلی میں یہ ہوگی' اس کی نظروں کے سامنے تمام عالم کے پوشیدہ خزانے عیاں ہو جائیں گے' انگوٹھی کا مالک' دنیا کے تمام درندوں' چرندوں اور پرندوں کی بولی سمجھ سکے گا اور ہوا' اس کے قبضہ قدرت میں ہوگی جب تک انگوٹھی' انگلی میں رہے گی' اس پر کوئی جادو اثر نہ کرے گا اور نہ اس کی بادشاہت پر آنچ آ سکے گی اور اس چابک کے مالک کے حکم سے سرتابی کرے گا تو چابک' اس پر عذاب بن کر گرے گا اور اس کو سزا دے گا-

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ کو بادشاہت بھی عطا فرمائی ہے نبوت کے درجے پر بھی سرفراز کر دیا اب سلیمان' حضرت سلیمان علیہ السلام ہو گئے اور قوم نبی اسرائیل کے زبردست بادشاہ بن گئے جبکہ حضرت داؤدؑ گوشہ نشین ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے لیکن ان کے بعض بیٹوں نے انہیں سکون سے عبادت بھی نہ کرنے دی-

حضرت سلیمانؑ کے تخت نشین ہوتے ہی ان کے چوتھے بھائی ادونیاہ نے علم بغاوت

بلند کیا- اودنیاہ کے ساتھ یوآبؔ اور ابی ثیرؔ کاہن بھی شریک ہو گئے حضرت سلیمانؑ کا ساتھ تائن بنی' نیابا کاہن اور صدون کاہن نے دیا- شاہی لشکر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور جنگ شروع ہو گئی-

چونکہ حضرت سلیمانؑ حق پر تھے- اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیاب اور فتح یاب کیا- یوآب اور ابی ثیر کاہن' دونوں نیابا کاہن کے ہاتھوں مارے گئے- اودنیاہ کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ آیا وہ مارا گیا یا کہیں روپوش ہو گیا-

دشمنوں کا زور ٹوٹ گیا اور حضرت سلیمانؑ کی بادشاہت مستحکم ہو گئی تو حضرت داؤدؑ نے انتقال فرمایا- ان کی پیاری بیوی بتشبع بھی شوہر کے انتقال کے بعد زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں اور انہوں نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا-

☆☆☆

حضرت سلیمانؑ کو جب ملک کے اندرونی خلفشار سے نجات ملی اور حکومت میں استحکام پیدا ہو گیا تو آپ نے مصر کے فرعون پسپ خانو دوم کی لڑکی کے لئے شادی کا پیغام دیا- اس فرعون کا تعلق خاندان کہنہ سے تھا- جس زمانے میں حضرت سلیمانؑ کا پیغام' اس کے پاس پہنچا تو وہ' جزؔر کے بادشاہ سے جنگ کر رہا تھا-

اس کی صرف ایک ہی لڑکی تھی جو بڑی حسین اور ذہین تھی- پسپ خانو دوم' اس کی شادی کسی عالی نسب شہزادے سے کرنا چاہتا تھا جس دن حضرت سلیمانؑ کا پیغام پہنچا' اسی دن اسے فتح حاصل ہوئی- لپسپ نے اسے ایک نیک شگون سمجھا اور فوراً پیغام قبول کر لیا-

حضرت سلیمانؑ اس کی بیٹی کو بڑی دھوم دھام سے بیاہ کر لائے لپسپ نے بیٹی کو بڑے جہیز' سینکڑوں کنیزوں اور غلاموں کے ساتھ رخصت کیا- حضرت سلیمانؑ کی ان زوجہ کے بطن سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں- بڑی لڑکی جس کا نام طافتؔ تھا' کا عقد انبیاؔ واب سے ہوا اور چھوٹی

لڑکی بسحتؔ کی شادی، اخفؔ سے کی گئی - انبیاداؔب اور اخفؔ دونوں، حضرت سلیمانؑ کے گورنر تھے-

اس بیوی سے ایک لڑکا رجعاؔم بھی پیدا ہوا - جو حضرت سلیمانؑ کے بعد تخت پر بیٹھا لیکن قدیم تاریخ بتاتی ہے کہ رجعام، ملکہ بلقیس سبا کے بطن سے تھا - واللہ علم بالصواب۔

کتاب سلاطین اول توریت باب ۱۱ کا یہ اندراج قطعی مہمل اور خلاف عقل ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی ان زوجہ کے علاوہ سات سو بیویاں اور تین سو بیگمات تھیں -توریت شریف میں یقیناً یہ تصرف اور اضافہ کیا گیا ہے یہ تعداد ان کنیزوں اور خادماؤں کی ہے جو محلات شاہی میں مختلف فرائض اور خدمات سرانجام دیتی تھیں - افسوس کہ ان زوجہ کا نام اور تفصیلی حالات کہیں سے دستیاب نہ ہو سکے-

حضرت سلیمانؑ کی دوسری بیگم کا نام جراؔدہ تھا - یہ شاہ صیدون کی ناز پروردہ بیٹی تھی - یہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھیں شاہ میدون جنگ میں مارا گیا اور یہ مسلمان ہو کر حضرت سلیمانؑ کی زوجیت میں آ گئیں، یہ بہت حسین و جمیل تھیں لیکن باپ کی محبت نے انہیں جادۂ حق سے ہٹا دیا - انہیں، شیطان نے مشورہ دیا کہ باپ کا بت بنا کر پوشیدہ طور پر اس کی پوجا کرو تا کہ باپ کا غم باقی نہ رہے - یہ شیطان کے فریب میں آ گئیں اور بت بنا کر اسے پوجنے لگیں لیکن جلد ہی راز کھل گیا اور حضرت سلیمانؑ نے انہیں زوجیت سے خارج کر دیا-

حضرت داؤدؑ نے اپنے دور حکومت میں رہائش کے لئے کوئی خاص محل تعمیر نہ کیا تھا لیکن حضرت سلیمانؑ نے سلطنت میں امن وامان ہوتے ہی ملک صور کے بادشاہ جیرام کو حکم دیا کہ ان کے لئے ایک ایسا قصر معلیٰ تعمیر کیا جائے جس کی مثال دنیا میں نہ ہو-

اس حکم کی تعمیل میں جیرام نے جو وسیع وعریض عمارت تعمیر کی وہ واقعی لاجواب اور عدیم النظیر تھی - اس قصر کا احاطہ چھتیس کوس کا تھا اور دیواروں میں سونے، چاندی کی اینٹیں لگائی گئی

تھیں- اس احاطے کے اندر ایک ہزار محل بنائے گئے- حضرت سلیمانؑ کا محل خاص، بارہ کوس کے رقبے پر مشتمل تھا- اس محل میں آپ تخت پر جلوس فرماتے تھے- روایت ہے کہ آپ کے تخت کا طول تین کوس کا تھا اور پورا تخت، ہاتھی دانت سے تیار کیا گیا تھا- تخت کی مرصع کاری لعل و یاقوت اور زمرد سے کی گئی تھی اور چاروں طرف سونے کی اینٹیں لگائی گئی تھیں- تخت کے چاروں کونوں پر چار، چاندنما درخت لگائے گئے تھے- جن کی ڈالیاں سونے کی اور پتیاں سبز زمرد کی تھیں- ہر ڈالی پر طوطی اور طاؤس بنا کر بٹھائے گئے تھے جن کے پیٹ کے اندر مشک اور دیگر خوشبویات بھری تھیں- درخت کے خوشے انگور کے تھے جو لعل و یاقوت سے بنائے گئے تھے- تخت سے ایک سیڑھی نیچے، سونے کی ایک ہزار کرسیاں رکھی جاتی تھیں جن پر ارکان حکومت بیٹھتے تھے- جب حضرت سلیمانؑ تاج شاہی سر پر رکھ کر اور انگشتری سلیمانی، انگلی میں پہن کر تخت پر قدم رکھتے تو ان کی ہیبت سے تخت لرزنے لگتا تھا اور اس وقت طوطی و طاؤس بحکم خدا اپنے پروں کو پھیلا دیتے اور مشک کی خوشبو سے تمام فضا مہک اٹھتی-

کہتے ہیں، اس تخت پر بیٹھ کر حضرت سلیمانؑ صحیفۂ آسمانی توریت پڑھتے اور مخلوق خدا پر حکمرانی کرتے تھے- آپ ہر پرندے کی بولی سمجھتے تھے- جب تک حضرت سلیمانؑ تخت پر جلوس فرما رہتے، تمام پرندے ہوا میں معلق ہو کر، آپ کے اوپر سایہ کئے رہتے- سفر کے دوران میں بھی پرندے آپ کو اپنے سائے میں لئے رہتے تھے- تخت گاہ کے اس مکان میں صدہا محرابیں تھیں جن میں عابد و زاہد ہر وقت ذکر خداوندی میں مشغول رہتے-

حضرت سلیمانؑ کے قبضے میں تمام جن تھے- یہ جن فرش فروش اور باورچی خانے کے انتظام پر تعینات تھے- کھانے پینے کا تمام سامان لانا اور اسے پکوا کر تقسیم کرنا، ان کے سپرد تھا- روزانہ کئی سو دیگوں میں کھانا پکایا جاتا تھا- یہ دیگیں تانبے کی تھیں- جیسا کہ قرآن میں آیا ہے-

''اور بہادیا ہم نے اس (سلیمانؑ) کے لئے ایک چشمہ' پگھلے ہوئے تابنے کا۔''

اس تمام اہتمام اور شان وشوکت کے باوجود حضرت سلیمانؑ اپنے باورچی خانے سے کھانا نہیں کھاتے تھے۔ یہ تمام کھانا لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ حضرت سلیمانؑ رزق حلال کے لئے اپنے ہاتھ زنبیل (تھیلی) سیتے اور اسے بازار میں فروخت کر کے جو خریدتے تھے جو کو وہ خود ہی پیس کر آٹا بناتے اور اس کی روٹی پکاتے تھے۔ آپ اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی روٹیاں لے کر بیت المقدس میں جاتے اور وہاں روزے داروں اور غریب درویشوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور خدا کا شکر ادا کرتے تھے۔

حضرت سلیمانؑ روزانہ خدائے ذوالجلال کی مناجات کرتے اور فرماتے ''اے خداوند! میں درویشوں کے ساتھ شامل ہوں اور بادشاہوں کے ساتھ بادشاہ بھی ہوں' پیغمبروں کے ساتھ پیغمبر بھی ہوں۔ اے میرے مالک! میں تیری نعمتوں کا کہاں تک شکر ادا کروں۔ تیرا شکر ادا کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں۔''

☆☆☆

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔''وورث سلیمان......''اور وارث ہوا......سلیمانؑ حضرت داؤدؑ کا یعنی نبی اور بادشاہ ہوا' اپنے باپ کی جگہ...... یہ عظمت اور بزرگی حاصل کرنے کے بعد حضرت سلیمانؑ نے لوگوں سے فرمایا۔

''اے لوگو! سکھائی گئیں ہمیں بولیاں ہر جانور کی اور دیئے گئے ہم ہر چیز سے۔'' یعنی دنیا کی جو چیز درکار ہے وہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے عنایت فرمائی ہے۔

ایک جگہ اور قرآن میں آیا ہے۔''یسلیمان الریح ''اور مسخر کیا واسطے سلیمانؑ کے' ہوا کو صبح کی۔

اس طرح کی بہت سی آیات قرآنی' حضرت سلیمانؑ کے بارے میں آئی ہیں جن کی

تفسیر اور روایت کے حوالوں سے حضرت سلیمانؑ کی شان و شوکت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ......

''جب حضرت سلیمانؑ کا تخت ہوا کہ لہروں پر رواں ہوتا تو پرندے جھنڈ کے جھنڈ آپ کے تخت کے اوپر اپنے پروں کا سایہ کرتے اور انسانوں کی فوج دائیں جانب اور جنوں کی بائیں جانب ہوتی- اس تخت رواں کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ شام سے یمن تک کا فاصلہ آدھے دن میں طے ہوتا- آپ جس راستے سے گزرتے' وہاں کی زمین آواز دیتی کہ اے سلیمانؑ! جو دفینے مجھ میں ہیں' وہ اٹھوالو اور انہیں اپنے کام میں لاؤ- آپ جنوں کو حکم دیتے کہ زمین کے خزانے سمیٹ لو- یہ جن' سمندر اور خشکی سے آپ کے لئے موتی اور جواہرات اکٹھا کرتے تھے- اس طرح حضرت سلیمانؑ کے خزانے کی کوئی حد و انتہا نہ تھی-

ایک بار تخت سلیمانؑ ہوا کہ دوش پر رواں دواں تھا کرسیوں پر ہزاروں اراکین سلطنت بیٹھے تھے- وزیر اعظم آصف ابن برخیا کی کرسی تمام اراکین سے آگے تھی- جن و انس' تخت کے گرد اپنی اپنی جگہ پر مودب کھڑے تھے- پرندے' چپ راست' پیش و پس' تخت سلیمانی پر سایہ کئے ہوئے تھے- اس وقت حضرت سلیمان کے کانوں میں فرشتوں کی تسبیح کی آواز آئی- فرشتے کہہ رہے تھے-

''اے رب! تو نے حضرت سلیمانؑ کو جیسا جاہ و جلال و حشم عطا فرمایا' کسی اور جن و بشر کو نہیں دیا-''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا- ''اے فرشتو! میں نے سلیمان کو ہفت اقلیم کی بادشاہت عنایت کی ہے اور اس کو نبوت سے بھی سرفراز کیا لیکن اس کو غرور تکبر ذرا بھی نہیں- اگر وہ غرور کرتا تو اسے ہوا پر لے جا کر زمین پر ڈال دیتا اور پھر اس کو نیست و نابود کر دیتا-''

حضرت سلیمانؑ کے کانوں میں یہ آواز آئی تو آپ خدا کے حضور میں فوراً سجدہ بجا

لائے پھر آپ نے تخت کو زمین پر اترنے کا حکم دیا ہوا' تخت سلیمانی کو آہستہ آہستہ زمین پر لے آئی۔

یہ بستی' چیونٹیوں کی تھی جیسا کہ خدا نے فرمایا۔''حتیٰ اذا.....'' یہاں تک کہ جب پہنچے حضرت سلیمانؑ چیونٹیوں کے میدان پر.....کہا' ایک چیونٹی نے.....اے چیونٹیوں! گھس جاؤ' اپنے گھروں میں تاکہ نہ پیس ڈالے تم کو سلیمانؑ اور اس کا لشکر اور پھر ان کو خبر بھی نہ ہو۔

حضرت سلیمانؑ نے شاہ مور (چیونٹیوں کے بادشاہ) کی یہ بات سنی تو مسکرا کر کہا۔''یہ بھی اپنی رعیت پر شفقت اور مہربانی کرتی ہے۔''

پھر حضرت سلیمانؑ نے شاہ مور کو زمین سے اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور دریافت فرمایا۔ ''اے شاہ مور! تم نے اپنے لشکر سے یہ کیوں کہا کہ سلیمان آتا ہے' تم اپنے بلوں میں گھس جاؤ؟ تم نے میرا کیا ظلم دیکھا؟''

شاہ مور نے ادب سے جواب دیا۔''اے اللہ کے نبی! بے شک' آپ نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن یہ ممکن تھا کہ غلطی سے آپ کے لشکریوں کے پیروں کے نیچے ہمارا لشکر آجاتا اور اس طرح آپ کو خبر بھی نہ ہوتی اور ہم ہلاک ہو جاتے میں نے یہ بات حفظ ماتقدم کے طور پر کہی تھی۔''

حضرت سلیمانؑ نے پوچھا۔''اے شاہ مور! کیا ہمیشہ ہی ان پر ایسی شفقتیں کرتے ہو؟''

شاہ مور نے جواب دیا۔''جی ہاں' اے اللہ کے نبی! ان کی خوشی' میری خوشی اور ان کا غم' میرا غم ہے۔ ان کی غم خواری اور دلداری مجھ پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی واسطے ان کا بادشاہ بنایا ہے۔ اگر میری ایک چیونٹی بھی مر جائے تو جب تک میں اسے اٹھا کر' اس کے مسکن تک نہیں پہنچا دیتا' مجھے چین نہیں ملتا۔''

حضرت سلیمانؑ نے دریافت فرمایا- ''اے شاہ مور! تمہارے ساتھ ہر وقت کتنی چیونٹیاں رہتی ہیں؟''

شاہ مور نے بتایا- ''اے نبی! چالیس ہزار چیونٹیاں' ہردم میرے ساتھ ہوتی ہیں-''

حضرت سلیمانؑ نے پوچھا- ''ا' شاہ مور! یہ تو بتاؤ کہ تمہاری سلطنت بہتر ہے یا میری؟''

شاہ مور نے بے دھڑک کہا- ''اے نبی! میری سلطنت آپ کی سلطنت سے بہتر ہے- یہ ایک حقیقت ہے جس کا میں نے بے خوف اظہار کیا ہے-''

حضرت سلیمانؑ بولے- ''ہر بات کا ثبوت اور دلیل ہوتی ہے..... تمہارے پاس' اس کی کیا دلیل ہے کہ تمہاری سلطنت' میری سلنطت سے بہتر ہے؟''

شاہ مور نے جواب دیا- ''اے نبی! میری سلطنت آپ کی سلطنت سے اس لئے بہتر ہے کہ آپ کے تخت کو ہوا اٹھاتی ہے اور تخت آپ کو اٹھاتا ہے- آپ تخت پر تشریف رکھتے ہیں- یہ کتنے بڑے تکلف اور شان وشوکت کا اظہار ہے-''

حضرت سلیمانؑ شاہ مور کے اس جواب سے بہت حیران ہوئے انہوں نے پوچھا- ''اے شاہ مور! تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ تمہیں یہ کس نے بتایا کہ میرے تخت کو ہوا اٹھاتی ہے؟''

شاہ مور بولا- ''اے حضرت سلیمانؑ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقل و دانش دی ہے لیکن یہ عقل صرف آپ ہی کو نہیں دی گئی ہے بلکہ اس سے ہم جیسے نحیف وناتوانوں کو بھی سرفراز کیا گیا ہے-''

حضرت سلیمانؑ اور زیادہ حیران ہوئے- شاہ مور نے حضرت سلیمانؑ کو حیران دیکھا تو بولا- اے نبی خدا! اگر اجازت ہو تو میں آپ سے کچھ مسائل پوچھوں-''

حضرت سلیمانؑ شاہ مور کی گفتگو سے بڑے متاثر تھے۔ انہوں نے اسے اجازت دے دی۔

شاہ مور نے عرض کیا۔ ''اے حضرت سلیمانؑ! آپ نے خداوند تعالیٰ سے سوال کیا تھا' قال رب ......اے پروردگار! مغفرت کر میری اور بخش مجھ کو۔ ایسا ملک نہ ملا ہو کسی کو میرے پیچھے تو ہے سب سے زیادہ بخشنے والا......تو اے' نبی! آپ کے اس سوال سے حسد کی بو آتی ہے۔ نبیوں اور پیغمبروں کو حسد نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بات ان کی شان کے خلاف ہے۔ آپ' اس سے پوری طرح واقف ہیں کہ اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں کا مالک ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ اس سے یہ کہنا کسی طرح مناسب نہیں کہ اے' میرے پروردگار! تو میرے سوا کسی اور کو بادشاہی نہ دے۔ وہ مالک اور خالق جس کو جو چاہے دے۔ نبی کی شان سے ایسی حسد کی باتیں اچھی نہیں لگتی۔''

حضرت سلیمانؑ کو شاہ مور کی زبان سے یہ باتیں چھوٹا منہ اور بڑی بات معلوم ہوئیں۔ آپ کو شاہ مور کی گفتگو اور نصیحت ناگوار گزری۔ شاہ مور نے اس کا اندازہ آپ کے چہرے سے لگالیا اور کہا۔

''اے پیغمبر! آپ کو میری باتوں سے بیزار نہیں ہونا چاہئے کیونکہ میں نے جو کچھ کہا ہے' وہ درست ہے اور درست بات پر خفا ہونا بے جا ہے۔''

شاہ مور کی باتیں درست تھیں۔ حضرت سلیمانؑ کا غصہ تو ٹھنڈا ہو گیا مگر وہ خاموش رہے۔

شاہ مور بولا۔ ''اے'' نبی! آپ خفا نہ ہوئیے اور مجھے ایک بات بتائیے کیا آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو انگشتری دی ہے' اس کا کیا راز ہے؟''

حضرت سلیمانؑ نے جواب دیا۔ ''مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔ اگر تم جانتے ہو تو

ضرور بتاؤ۔''

شاہ مور نے حضرت سلیمانؑ کو بتایا۔''اے پیغمبر خدا! اللہ نے آپ کو سلطنت دی ہے۔ قاف سے قاف تک لیکن اس پوری سلطنت کی قیمت' ایک نگینے سے زیادہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پیش نظر یہ بات رہے کہ اس دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔''

شاہ مور کی ہر بات سے حضرت سلیمانؑ کی حیرانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کی خفگی ختم ہو گئی۔

شاہ مور نے دوسرا سوال کیا۔''اے' سلیمان علیہ السلام! خدا نے ہوا کو آپ کے تابع کر دیا ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ اس میں کیا راز ہے؟''

''میں اس راز سے بھی واقف نہیں۔'' حضرت سلیمانؑ نے جواب دیا۔ کیا تم اس بات سے آگاہ ہو؟''

تو سنئے' اے نبی خدا! شاہ مور نے بتایا ''اس کا مطلب ہے کہ موت کے وقت یہ دنیا آپ کو ہوا کے مانند معلوم ہو گی۔''

حضرت سلیمانؑ شاہ مور کی یہ بات سن کر رونے لگے اور اللہ کے حضورؐ میں توبہ و استغفار کی پھر بولے۔''اے' شاہ مور! تم نے ٹھیک کہا۔ یہ دنیا ہوا کی مثال ہے۔''

شاہ مور نے پھر کہا۔''اے سلیمان علیہ السلام! کیا آپ' سلیمان کے معنی جانتے ہیں؟''

حضرت سلیمانؑ نے کہا۔''اے شاہ مور! اس کے معنی بھی تم ہی بتاؤ۔ میں نہیں جانتا۔''

شاہ مور نے کہا۔''اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی زندگی میں دل مت لگایئے کیونکہ موت ہر ساعت ہے۔''

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا۔''اے شاہ مور! میں تمہاری عقلمندی کا قائل ہو گیا۔ مجھے تم

کچھ نصیحت کرو اور نیک کام بتاؤ-"

شاہ مور نے کہا- "اے پیغمبر خدا! اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت پر سرفراز فرمایا اور دنیا کی بادشاہی دی ہے- آپ کو چاہئے کہ اپنی رعیت کی نگہبانی کریں- عدل وانصاف فرمائیں تا کہ رعایا خوش رہے- مظلوم کی دادرسی کریں اور ظالم کو سزا دیں- میں غریب' ضعیف اور مسکین ہوں لیکن ہر دم رعیت کا خیال رکھتا ہوں' ان کا بار اٹھاتا ہوں' کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا-"

حضرت سلیمانؑ شاہ مور کی ایمان آموز اور ایمان افروز باتیں سن کر بہت خوش ہوئے اور بولے-

"اے شاہ مور! تمہاری باتوں سے میرا دل بہت خوش ہوا اور میں نے تم سے بہت کچھ حاصل کیا- تمہارا بہت بہت شکریہ! اب مجھے آگے جانے کی اجازت دو-"

شاہ مور بولا- "اے' حضرت سلیمانؑ! آپ میرے مہمان ہیں اور مہمان کو بغیر کچھ کھائے' پیئے جانے دینا کسی طرح مناسب نہیں...... ہمیں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دال دلیا دیا ہے' اس میں سے آپ اور آپ کا لشکر تناول فرمائیں پھر آگے کا قصد کریں-"

حضرت سلیمانؑ نے بلا عذر شاہ مور کی دعوت قبول کر لی- شاہ مور حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ سے اتر کر بل میں گیا اور ٹڈی کی ایک ٹانگ لا کر حضرت سلیمانؑ کے سامنے رکھ دی-

حضرت سلیمانؑ ہنس کر بولے- "اے' شاہ مور! میرا اور میرے لشکر کا ٹڈی کی اس ایک ٹانگ سے کیا بھلا ہوگا؟"

شاہ مور نے کہا- "اے حضرتؑ! آپ اس ٹانگ کو کم نہ سمجھئے- اس میں بڑی برکت ہے- آپ بسم اللہ کیجئے اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے-"

روایت ہے کہ ٹڈی کی اس ٹانگ سے حضرت سلیمانؑ اور پورا لشکر کھاتا رہا اور جب سب کا پیٹ بھر گیا تو اس کا کچھ حصہ پھر بھی باقی رہ گیا-

حضرت سلیمان یہ حال دیکھ کر بہت حیران ہوئے اور فوراً سجدے میں گر گئے اور عرض کیا۔ ''اے پروردگار! تیری قدرت بے انتہا ہے اور بے شک تو ہی عظمت اور بزرگی کے لائق ہے۔''

☆☆☆

جس وقت حضرت سلیمانؑ کا تخت اترا اور حضرت سلیمانؑ شاہ مور سے گفتگو کرنے لگے تو وہ تمام پرندے جوان کے تخت پر سایہ کئے ہوئے تھے' آرام کرنے کے لئے درختوں کی شاخوں پر بیٹھ گئے تاکہ اس وقت تک تھکن دور کریں جب تک حضرت سلیمانؑ اور شاہ مور میں گفتگو ہوتی رہے۔

روایت ہے کہ ہد ہد کو یہ تاج' حضرت سلیمانؑ نے خوش ہو کر عطا فرمایا تھا ہد ہد پرندہ' سیر و سفر میں حضرت سلیمانؑ کے ساتھ رہتا تھا۔ اس پرندے سے ایک کام تو نامہ بر اور قاصد کا لیا جاتا تھا اور دوسرا کام پانی کی تلاش کا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے بہت تیز نظر دی تھی۔

جب حضرت سلیمانؑ کے لشکر کو دوران سفر' پیاس لگتی اور پانی کی ضرورت پڑتی تو حضرت سلیمانؑ ہد ہد کو پانی کی تلاش میں بھیجتے ہد ہد ہوا میں بلند ہو کر چاروں طرف دیکھتا۔ اسے جہاں بھی زمین کے اوپر یا اندر' پانی دکھائی دیتا' وہ واپس آ کر حضرت سلیمانؑ کو پانی کی جگہ نشاندہی کر دیتا۔ حضرت سلیمانؑ اپنے تابع جنوں کو پانی لانے کا حکم دیتے جن فوراً ہد ہد کے بتائے ہوئے مقام پر پہنچ کر کنواں یا تالاب کھودتے اور لشکر کو پانی مہیا کر دیتے۔

تمام پرندے تو شاخوں پر بیٹھ کر آرام کرنے لگے مگر حضرت سلیمانؑ کے ہد ہد کو کچھ اور ہی سوجھی۔ اس نے سوچا جب تک حضرت سلیمانؑ اور شاہ مور میں گفتگو ہو رہی ہے کیوں نہ میں ادھر ادھر کی سیر کر لوں' چنانچہ ہد ہد ہوا میں بلند ہوا اور چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ معاً اس کی نظر اپنے ایک ہم جنس پر پڑی جو ایک باغ کی دیوار پر بیٹھا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے ہد ہد

نے فوراً ہوا میں غوطہ لگایا تا کہ اجنبی ہدہد کے پاس پہنچ کر کچھ دیر گپ شپ کرے۔

اجنبی ہدہد نے اپنے ہم جنس کو دیکھا تو بہت خوش ہوا اور سلام ودعا کے بعد پوچھا۔

''اے ہم جنس! تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

حضرت سلیمانؑ کا ہدہد مسکرایا اور بولا۔''اے بھائی! شاید تم اجنبی ہو اور کسی دور دیس سے آئے ہو؟''

اجنبی ہدہد نے جواب دیا۔''اے برادر! تمہارا خیال درست ہے لیکن پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟''

حضرت سلیمان کے ہدہد نے کہا۔''اجنبی دوست! میں شہنشاہ سلیمانؑ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ میں ان کا نامہ بر بھی ہوں اور ضرورت پڑنے پر پانی کی تلاش کی خدمت بھی بجالاتا ہوں۔''

اجنبی ہدہد نے دریافت کیا۔''یہ سلیمانؑ کس ملک کے بادشاہ ہیں؟''

حضرت سلیمانؑ کے ہدہد نے کہا۔''بھائی تعجب ہے کہ تم شاہوں کے بادشاہ حضرت سلیمانؑ کو نہیں جانتے۔ وہ ہفت اقلیم کے بادشاہ ہیں اور ان کی حکومت بشر کے ساتھ جنوں پر بھی ہے۔ ملک شام میں ایک مقام یروشلم ہے۔ وہاں حضرت سلیمانؑ کا اتنا بڑا اور عالیشان محل ہے کہ تم دیکھو تو دیکھتے ہی رہ جاؤ۔''

اجنبی ہدہد نے ہنس کر کہا۔''اے دوست! تم اپنے بادشاہ کی شان اور شوکت کا حال بیان کر رہے ہو لیکن اگر تم میری ملکہ کا ملک اور اس کی سطوت اور دبدبہ دیکھو تو دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاؤ۔ اس دنیا میں اس کا ثانی موجود نہیں۔''

''کیا نام ہے تمہاری ملکہ کا؟''

''ملکہ بلقیس سبا۔''

''یہ کس ملک کی ملکہ ہے؟''

اجنبی ہدہد نے بتایا- ''ملک یمن میں ایک سرزمین صنعآء ہے یہی سلطنت سبآ ہے اور اس کا دارالخلافہ شہر مآرب میں ہے-''

حضرت سلیمانؑ کے ہدہد کے تجسس بڑھا- اس نے پوچھا کتنی فوج اور لاؤلشکر ہے تمہاری ملکہ کے پاس؟''

اجنبی ہدہد نے بتایا- ''میری ملکہ بلقیس سبا کے پاس بارہ ہزار سردار ہیں اور ہر سردار کے ماتحت ایک ایک لاکھ کا لشکر ہے-'' (یہ بات مبالغہ معلوم ہوتی ہے شاید اجنبی ہدہد نے اپنی ملکہ کا رعب ڈالنے کے لئے لشکر کی تعداد بڑھا چڑھا کر بتائی ہوگی)

حضرت سلیمانؑ کا ہدہد کچھ سوچتے ہوئے بولا- ''بھائی! تم نے جو باتیں اپنی ملکہ کے بارے میں بتائی ہیں اگر یہ سچ ہیں تو تمہارا ملک اور تمہاری ملکہ واقعی دیکھنے کے قابل ہیں-''

اجنبی ہدہد نے کہا- ''میرے دوست! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ابھی میرے ساتھ چلو- دودھ کا دودھ' پانی کا پانی ہوجائے گا- مجھے' تمہاری مہمان نوازی کر کے بڑے خوشی ہوگی-''

حضرت سلیمانؑ کا ہدہد بولا- ''دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ تمہارا ملک اور ملکہ دیکھوں لیکن مشکل یہ ہے کہ شاہ سلیمانؑ کہیں روانگی کا حکم نہ دے دیں- اس وقت میری تلاش ہوگی-''

اجنبی ہدہد نے کہا- ''اس میں فکر کی کیا بات ہے؟ میرا ملک دور ہی کتنا ہے- بس یوں گئے اور یوں آئے-''

''ملک یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''آدمیوں کے لئے پیدل کا سفر تو ایک ماہ کا ہے لیکن ہم تم پرندے ہیں- صرف چند گھنٹے لگیں گے' آنے جانے میں-''

حضرت سلیمانؑ کے ہد ہد کے دل میں ملک یمن اور ملکہ بلقیس سبا کو دیکھنے کا زبردست شوق پیدا ہوا- اس نے یہ بھی سوچا کہ میں اس ملکہ اور ملک کو دیکھ آؤں اور واپس آ کر اس کا حال حضرت سلیمانؑ کو سناؤں تو وہ یقیناً خوش ہوں گے-

کچھ اپنے جذبہ شوق سے مجبور ہو کر اور کچھ اجنبی ہد ہد کے اصرار پیہم کے تحت' وہ ملک یمن جانے پر آمادہ ہو گیا اور اجنبی ہد ہد کے ساتھ یمن کی طرف پرواز کرنے لگا-

شامت اعمال دیکھئے کہ حضرت سلیمانؑ شاہ مور کی گفتگو اور ضیافت سے جلدی فارغ ہو گئے اور انہوں نے مراجعت کا قصد کیا- اراکین دولت اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور ہوا نے تخت سلیمانی کو بلند فضاؤں میں پہنچا دیا تمام پرندے اپنے پروں سے تخت سلیمانی پر سایہ کئے ہوئے تھے یکایک حضرت سلیمانؑ کو آفتاب کی تمازت محسوس ہوئی- آپ نے اوپر کی طرف دیکھا اور بہت عمیق نظر کی تو تمام پرندے نظر آئے مگر ہد ہد دکھائی نہ دیا-

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا-"(قرآن حکیم) **وتفقد الطیر......**' اور خبر لی' حضرت سلیمانؑ نے اڑتے ہوئے پرندوں کی پس کہا کہ کیا ہے مجھ کو کہ نہیں دیکھتا ہوں میں' ہد ہد پرندے کو یا وہ' مجھ سے غائب ہو گیا ہے اگر اس نے ایسا کیا ہے تو البتہ میں عذاب کروں گا اس کو اور عذاب سخت یا ذبح کروں گا میں' اس کو یا پھر لاوے گا میرے پاس کوئی دلیل ظاہر-

پھر اسی وقت حضرت سلیمانؑ نے عقاب کو حکم دیا کہ وہ جائے اور ہد ہد جس جگہ ہو' اسے تلاش کر کے' ان کے سامنے حاضر کرے- عقاب نے اپنے پر کھولے اور تیزی سے بلند ہوتا چلا گیا- اس نے اوپر جا کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں- جنوب کی سمت اسے ایک پرندہ اڑتا نظر آیا جو اسی طرف آ رہا تھا- عقاب نے جھپٹ کر غوطہ لگایا اور فوراً اس پرندے کے پاس پہنچ گیا وہ پرندہ حضرت سلیمانؑ کا ہد ہد تھا جو تیزی سے اڑتا ہوا یروشلم کی طرف آ رہا تھا-

عقاب نے اس کے قریب پہنچ کر کہا-"اے کمبخت! تو کہاں مر گیا تھا شہنشاہ ہفت اقلیم کو

تیری تلاش ہے اور وہ سخت ناراض ہیں۔ مجھے تیری تلاش میں بھیجا ہے۔ فرمار ہے تھے کہ اگر تو نے اپنی غیر حاضری کی کوئی معقول دلیل پیش نہ کی تو تجھے عذاب میں ڈالا جائے گا۔''

ہدہد نے اسی طرح اڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھ سے یہ غلطی ضرور ہوئی کہ میں شہنشاہ کو بغیر بتائے غائب ہو گیا لیکن میں جس جگہ سے آ رہا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے' جب اس کا ذکر اور تفصیل بیان کروں گا تو مجھے امید ہے کہ ان کی ناراضگی دور ہو جائے گی اور کیا عجب کہ مجھے انعام و اکرام سے سرفراز فرمائیں۔''

عقاب نے ذرا بگڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو اب دربار ہی میں جا کر معلوم ہوگا کہ حضرت سلیمانؑ تجھے انعام دیتے ہیں یا ذبح کراتے ہیں۔''

اس موضوع پر باتیں کرتے ہوئے دونوں' حضرت سلیمانؑ کے دربار میں پہنچ گئے۔

حضرت سلیمانؑ نے ہدہد کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ''تو ہماری مرضی کے بغیر کہاں چلا گیا تھا؟''

ہدہد بولا۔ ''میں ایک چیز کی خبر لایا ہوں۔''

حضرت سلیمانؑ نے دریافت کیا۔ ''تو کہاں سے خبر لایا ہے؟''

ہدہد نے جواب دیا۔ ''اے شہنشاہ ہفت اقلیم! میں یمن کی ایک سلطنت سبا سے خبر لایا ہوں۔''

حضرت سلیمانؑ نے توقف فرماتے ہوئے پوچھا۔ ''تو وہاں کس طرح گیا اور کیا خبر لایا ہے؟ اسے تفصیل سے بیان کر۔''

ہدہد نے جواب دیا۔ ''اے نبی اللہ! جس وقت آپ کا تخت شاہ مور کی بستی میں اترا تھا' اس وقت میں نے ہوا میں بلند ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے اپنا ایک ہم جنس ایک باغ کی دیوار پر نظر آیا میں اڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟

میں نے بتایا کہ میں ملک شام سے آ رہا ہوں اور حضرت سلیمانؑ میرے آقا ہیں- اس نے آپ کے بارے میں دریافت کیا- تو میں نے کہا کہ حضرت سلیمانؑ اس وقت شہنشاہ ہفت اقلیم اور بادشاہ جن وانس، وحوش وطیور اور جمیع مخلوقات ہیں پھر میں نے اس سے دریافت کیا کہ تم کس ملک سے آئے ہو اور تمہارا بادشاہ کون ہے؟ تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ ملک یمن، سلطنت سبا کا رہنے والا ہے اور وہاں کی حاکم بلقیس نامی ایک خاتون ہیں جن کے تابع بارہ ہزار سردار اور ہر سردار کے ماتحت ایک ایک لاکھ کا لشکر ہے- مجھے اس کی بات پر بڑا تعجب ہوا- اس نے مجھے حیران دیکھ کر اپنے ملک چلنے کی دعوت دی تا کہ میں خود اپنی آنکھوں سے وہ تمام چیزیں دیکھ سکوں جن کا اس نے ذکر کیا تھا- میں نے بہت عذر کیا کہ میرے آقا مجھے غیر حاضر پا کر ناراض ہوں گے اور سزا دیں گے مگر وہ اصرار کرتا رہا- میرے دل میں بھی تجسس پیدا ہوا اور میں اس کے ساتھ سلطنت سبا چلا گیا-''

حضرت سلیمانؑ اور تمام اراکین ہدہد کی باتیں بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے- ہدہد خاموش ہوا تو حضرت سلیمانؑ نے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ آگے بیان کر-

ہدہد نے کہا- ''میں نے شہر سبا پہنچ کر ملکہ بلقیس کو دیکھا کہ وہ عظیم تخت پر بیٹھی ہے- اس کے شاہی تخت کا طول وعرض تیس گز ہے اور وہ تمام کا تمام جواہرات سے مرصع ہے- اس کا کوئی شوہر نہیں ہے اور وہ بے دین ہے-''

حضرت سلیمانؑ نے اسے ٹوکتے ہوئے دریافت کیا- ''سب باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن تو نے یہ کیسے جانا کہ وہ بے دین ہے؟''

ہدہد نے حضرت سلیمانؑ کو جواب دیا- ''میں نے پایا اس صورت بادشاہی کرتی، اپنی قوم کی اور اس کو ہر چیز عنایت کی گئی اور میں نے وہاں یہ بھی دیکھا کہ اس کی قوم اس کو سجدہ

کرتی ہے اور وہ سب کے سب سورج کو سجدہ کرتے تھے اور اسی کو خدا مانتے تھے۔ حقیقی خدا کو کوئی نہیں جانتا تھا۔"

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا۔"ہم دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹا ہے۔"

ہد ہد نہایت احترام سے بولا۔"اے نبی خدا! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ بے شک اس کی تصدیق فرمالیں۔"

حضرت سلیمانؑ نے ہد ہد سے کہا تو ہمارا خط بلقیس کے پاس لے جا۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے"اور کہا حضرت سلیمانؑ نے کہ میرا خط لے جاؤ اور وہ خط لے جا کر اس کی طرف ڈال دو اور پھر اس کے پاس سے چلے جاؤ اور دیکھو وہ کیا جواب دیتی ہے۔"

پھر حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس کے نام ایک خط لکھا' اس پر مہر سلیمانی لگا کر ہد ہد کے حوالے کیا کہ اسے شہر سبا پہنچ کر بلقیس کو پہنچائے۔

ہد ہد نے خط کو چونچ میں دبایا اور ہوا میں بلند ہو کر سلطنت سبا کی طرف چلا۔ اسے راستہ پہلے ہی معلوم تھا اس لئے اسے سبا پہنچنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی وہ سیدھا بلقیس کے شاہی محل میں پہنچا ملکہ سبا اس وقت اپنے خاص کمرے میں استراحت فرما تھی۔ کمرے کے تمام دروازے بند تھے لیکن کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ہد ہد کھڑکی کے ذریعے بلقیس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ملکہ بلقیس کو سوتے پایا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد خط کو ملکہ کے سینے پر رکھ کر چپکے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد ملکہ بیدار ہوئی تو اپنے سینے پر خط رکھا دیکھ کر بڑی حیران ہوئی۔ اس کے کمرے کے تمام دروازے بند تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خط اس کے پاس کیسے پہنچا اور اسے لے کر کون آیا۔ جب اس نے بند خط کو دیکھا تو اس پر حضرت سلیمانؑ کی مہر لگی ہوئی تھی۔ مہر سلیمانی کو دیکھ کر بلقیس بہت ڈری اس نے تمام محافظوں اور کارپردازوں کو بلا کر

پوچھا۔ کہ انہوں نے کسی اجنبی کو اندر آتے جاتے دیکھا ہے؟

کسی نے دیکھا ہوتا تو بتاتا۔ ہر ایک نے نفی میں جواب دیا۔ اس لئے خط وہاں تک پہنچنے کا راز کسی طرح نہ کھل سکا۔

ملکہ بلقیس نے حضرت سلیمانؑ کا خط پڑھا تو اور زیادہ خوفزدہ ہوئی۔ اس نے اسی وقت اپنا دربار لگایا۔ جب تمام وزیر اور امیر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے تو ملکہ بلقیس حضرت سلیمانؑ کا خط انہیں دکھاتے ہوئے کہنے لگی "اے درباریو! مجھے بتاؤ کہ میرے پاس یہ خط کس طرح پہنچا ہے اور وہ خط بڑی عزت وعظمت کا ہے اور وہ ہے' حضرت سلیمانؑ کی طرف سے اور اس خط کو شروع بھی اللہ کے نام سے کیا گیا ہے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے اور اس میں لکھا ہے کہ تم اپنی سلطنت پر مت زور دکھاؤ اور مسلمان ہو کر میرے پاس چلی آؤ اے دربار والو! مجھ کو جواب دو کہ میں اپنے کام میں کوئی کام' تم پر مقرر نہیں کرتی' جب تک تم حاضر نہ ہو۔"

یہ سن کر بلقیس کے درباریوں نے کہا "ہم صاحب قوت اور صاحب جنگ ہیں اور یہ کام تیرے اختیار میں ہے سو تو دیکھ لے جو حکم کرے۔"

ملکہ بلقیس نے کہا "حضرت سلیمانؑ نے مجھے اسلام کی دعوت دی ہے اور لکھا ہے کہ تم' آفتاب پرستی چھوڑ کر پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اگر میں ان کی یہ بات نہیں مانوں گی تو وہ میری ساری سلطنت کو برباد کر دیں گے۔ بادشاہ جس وقت کسی بستی یا ملک میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس بستی کو خراب کر دیتے ہیں چنانچہ اگر میں نے انکار کیا اور اسی طرح ہمارے ملک میں داخل ہوئے تو پورے ملک کو خراب کر دیں گے۔"

ایک سردار نے کہا۔ "اے ملکہ! اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے آپ ہی کوئی تدبیر کیجئے۔"

ملکہ بلقیس بولی۔ "میں بھیجنے والی ہوں ان کی طرف ہدیے (تحائف) پھر میں دیکھتی

ہوں کہ وہ کس چیز کے ساتھ واپس آ تا ہے اگر سلیمانؑ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں تو پھر ان کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ میں ہدیہ بھیج کر آزمائش کرتی ہوں۔ اگر وہ خدا کے پیغمبر ہیں تو وہ ہدیہ نہیں لیں گے اور میرے اسلام نہ لانے کے کسی طرح سے راضی نہ ہوں گے۔"

بلقیس کے وزیر باتدبیر نے کہا۔ "اے ملکہ بلقیس! تمہاری جو سمجھ اور مرضی میں آئے وہ کرو ہم تو تمہارے حکم کے پابند ہیں۔"

ملکہ بلقیس کا قصہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھ ساتھ تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اس کا جستہ جستہ ذکر آسمانی صحیفوں اور تاریخوں میں موجود ہے۔ روایتوں کا تو یہ حال ہے کہ ان کا بیان بھی مشکل ہے بہرحال ملکہ سبا بلقیس اپنے حسن و جمال اور شاہانہ دبدبے کی وجہ سے ضرب المثل بن گئی ہیں اور ان کا قصہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔

ملکہ بلقیس کا سلسلہ نسب' مورخین نے اس طرح بیان کیا ہے بلقیس بنت یشرع بن قیس بن صیفی بن یشجب بن یعرب بن قحفان' لیکن بعض مورخ' ان کا شجرہ یوں بتاتے ہیں۔ بلقیس بنت یشرح بن تیغ بن تیغ ذی المنار بن تیغ ذی الرائش ہے اور لقب ہدٓاد ہے کچھ ان کے والد کا نام حارث بن سبا بتاتے ہیں۔ بعض کے خیال میں وہ' شیبان کی بیٹی تھیں اور بعض کے نزدیک شرافیل کی دختر نیک اختر تھیں ان کی والدہ کا نام رواحہ یا ریحانہ بنت سکن تھا۔

ملکہ بلقیس کے والدین کے سلسلے میں یہ حدیث بہت مشہور ہے۔ انا ھدی ابوی بلقیس کان جنیا (بلقیس کے ماں' باپ میں سے ایک شخص جنی تھا)

اس حدیث کی رعایت سے تذکرہ نویسوں نے بلقیس کی ماں کو جنیہ بنایا ہے۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ بلقیس کا باپ بغیر وصیت کئے مر گیا تھا۔ اس کے بعد بلقیس کا چچازاد بھائی تخت پر قابض ہو گیا مگر اس کی بدعنوانیوں سے رعیت تنگ آ گئی اور اسے

قتل کر کے بلقیس کو ملکہ بنا دیا- ایک خیال یہ بھی ہے کہ بلقیس کا باپ بادشاہ نہیں وزیر تھا- وہ بادشاہ بہت بدکار تھا- جب بلقیس کا باپ مر گیا اور وہ جوان ہوئی تو بادشاہ نے اسے اپنے تصرف میں لانا چاہا-

بلقیس جس قدر خوبصورت تھی' اتنی ہی عاقل و دانا بھی تھی- اس نے حکمت عملی سے کام لیا اور بادشاہ کو قتل کرا دیا- رعیت پہلے ہی بدکار بادشاہ سے بیزار تھی- اس نے بلقیس کو ملکہ سبا بنا دیا-

ملکہ بلقیس کے متعلق ہزاروں روایتیں تاریخ کے صفحات پر بکھری ہوئی ہیں لیکن ان میں بیشتر ایسی ہیں جنہیں عقل قبول نہیں کرتی - بہرحال تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ بلقیس حسن و جمال اور عقل و فراست کا ایک اعلیٰ پیکر تھی- اس کی جوانی ایسی نہ تھی کہ کوئی ایک بار دیکھے تو دوبارہ دیکھنے کی آرزو نہ کرے وہ دھیمے لہجے میں گفتگو کرتی اور سنجیدہ سے سنجیدہ گفتگو کے دوران بھی مسکراتی رہتی- اس کی اس خوبی کی وجہ سے اس کا مخاطب سحر زدہ ہو جاتا اور اس کی بات بغیر کسی دلیل کے تسلیم کر لیتا-

ملکہ سبا بلقیس کے جاہ و جلال' افواج اور حدود مملکت کے بارے میں بھی بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے- ایک جگہ بلقیس کی فوج کی تعداد صرف چالیس ہزار اور امیروں' وزیروں اور ارکان شوریٰ کی مجموعی تعداد تین سو بیان کی گئی ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ وہ بڑے جاہ و جلال سے حکومت کرتی تھی اور اس کے خزانے مال و دولت اور ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تھے- اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت سلیمانؑ اپنے قاصد کے ذریعے خط بھیج کر اسے اسلام کے دائرے میں لانے کی کوشش نہ کرتے-

ملکہ سبا بلقیس نے اپنے وزیروں' امیروں اور درباریوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا پھر وہ ان تحائف کے انتخاب میں مصروف ہوئی جو حضرت سلیمانؑ جیسے جلیل القدر بادشاہ کے حضور میں

بھیجے جانے تھے۔ وہ ایک تحفہ پسند کرتی پھر اسے یہ کہہ کر رد کر دیتی کہ یہ حضرت سلیمانؑ کے شایان شان نہیں ہر انتخاب کے موقع پر حضرت سلیمانؑ کی تحریر اس کی نظروں کے سامنے آ جاتی۔ دراصل وہ چاہتی تھی کہ حضرت سلیمانؑ کو ایسے تحائف بھیجے جو ایک طرف تو حضرت سلیمانؑ کو پسند آ جائیں اور دوسری طرف ان سے اس کی دولت وامارت کا بھی مظاہرہ ہو جائے۔

بڑے سوچ بچار کے بعد سات پردے زربفت کے اور سات سات اینٹیں سونے چاندی کی بلقیس نے یہ سوچتے ہوئے منتخب کیں کہ یہ اس کی عظمت کی غمازی کریں گی اور حضرت سلیمانؑ کے شایان شان بھی ہوں گی۔

پھر ملکہ بلقیس نے ایک نیک ساعت اور دن دیکھ کر یہ تحفے ایک ایلچی کے ہاتھ حضرت سلیمانؑ کے دربار یروشلم کی طرف روانہ کئے۔ ایلچی کو زبانی یہ بھی پیغام دیا کہ حضرت سلیمانؑ کو اس کی طرف سے ادب سے سلام پہنچائے اور پھر اس حقیر نذرانے کو قبول کرنے کی درخواست کرے۔

ایلچی تحائف لے کر تیزی سے یروشلم کی طرف روانہ ہوا لیکن جنوں اور طیور نے ایلچی کے ملک سبا سے روانہ ہوتے ہی حضرت سلیمانؑ کو خبر پہنچا دی اور یہ تفصیل بھی بتائی کہ ملکہ سبا بلقیس نے سات پردے زربفت اور سات اینٹیں سونے اور چاندی کی آپ کے لئے بطور نذر روانہ کی ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کہ یہ سات پردے زربفت اور سات سات اینٹیں سونے اور چاندی کی بالکل اسی طرح کی محل کی دیواروں سے حاصل کی جائیں اور وہ دربار میں ایلچی کے آنے سے پہلے ہی پہنچا دی جائیں۔

کچھ دن بعد ملکہ سبا بلقیس کا ایلچی تحائف لئے حضرت سلیمانؑ کے محل کے پاس پہنچا تو محل کے در و دیوار کو دیکھ حیران رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ محل کی تمام دیواریں سونے اور

چاندی کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں اس نے سوچا جس محل کی دیواریں ایسی ہیں، اس کے اندر کیا کچھ ہوگا اور یہاں کا بادشاہ کیسی شان وشوکت کا مالک ہوگا- غرض یہ کہ وہ محل پر نظر ڈالتے ہی ایسا مرعوب ہوا کہ اسے اپنی ملکہ بلقیس کے بھیجے ہوئے تحائف حقیر نظر آنے لگے-

ایلچی نے صدر دروازے پر پہنچ کر محافظوں کو اپنا نام اور پتہ بتایا پھر اپنے آنے کا مقصد بیان کیا- محافظوں کو ایلچی کے آنے کی خبر پہلے ہی دی جا چکی تھی- انہوں نے ایلچی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور نہایت عزت واحترام سے اندر لے گئے-

محل کے اندر کی آن بان دیکھ کر ایلچی کے ہوش اڑ گئے- ناگاہ اس کی نظر ایک دیوار پر پڑی جہاں سے سات اینٹیں سونے کی اور سات اینٹیں چاندی کی اکھڑی ہوئی معلوم ہوتی تھیں- ان اینٹوں کا حجم اور وزن تقریباً اتنا ہی تھا جتنا اس کی اینٹوں کا تھا- وہ دل میں ڈرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ تحائف پیش کرے تو حضرت سلیمانؑ اس پر چوری کا الزام لگائیں اور کہیں کہ یہ چیزیں، تم نے ہمارے محل سے چوری کی ہیں- زربفت کے جو پردے وہ اپنے ساتھ لایا تھا، بالکل اسی طرح کے ہزاروں پردے محل کے دروازوں پر پڑے تھے- یہ دیکھ کر وہ اور ڈرا کہ حضرت سلیمانؑ کی نظروں میں ضرور چور سمجھا جائے گا- بہرحال اب تو آ ہی گیا تھا اور تحائف پہنچانا بھی ضروری تھا- اس لئے اس نے حضرت سلیمانؑ کو اپنے آنے کی اطلاع دلوائی اور باریابی کی اجازت چاہی-

حضرت سلیمانؑ نے دربار لگوایا- ایک ہزار سونے چاندی کی کرسیوں پر اس کے امیر اور وزیر بیٹھ گئے- غلامان جن اور انس کی قطاریں اپنی اپنی جگہ کھڑی ہوگئیں پھر حضرت سلیمانؑ نے اپنے لمبے چوڑے اور حیرت انگیز تخت پر جلوس فرمایا اور ایلچی کو حاضری کی اجازت دی-

ملکہ سبا بلقیس کا ایلچی، تحائف لے کر دربار میں حاضر ہوا تو دربار کی سجاوٹ اور تخت

سلیمانی کو دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہو گیا- دیر تک وہ حیران اور پریشان ایک ایک چیز کو دیکھتا رہا- جب حواس درست ہوئے تو اس نے حضرت سلیمانؑ کو سلام عرض کیا اور ملکہ سبا بلقیس کے تحائف ان کے سامنے پیش کر کے ملکہ کی طرف سے نذر قبول کرنے کی درخواست کی-

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا- (بقول قرآن) ''پس جب آیا' سلیمانؑ کے پاس بلقیس کا قاصد تو سلیمانؑ نے فرمایا کہ تم کیا مدد دیتے ہو' میرے لئے اپنے مال سے پس جو کچھ دیا ہے مجھ کو اللہ تعالیٰ نے وہ بہتر ہے اس چیز سے کہ دیا ہے تم کو اور جاؤ' تم اپنے اس تحفے سے خوش رہو اور ان کو یہ تحفے واپس کر دو اور پھر تم ان کے پاس واپس چلے جاؤ اور ان کو اب ہم نکال دیں گے بے عزت کر کے اس شہر سے پس وہ ذلیل ہو جائیں گے-''

ایلچی حضرت سلیمانؑ کے جاہ وجلال سے پہلے ہی مرعوب ہو چکا تھا- اب جو اس نے ان کی زبان سے یہ سنا تو اس پر ہیبت و دہشت سے لرزہ طاری ہو گیا- اس نے جلدی جلدی تحائف سمیٹے اور ایسا سر پر پیر رکھ کر بھاگا کہ دربار بلقیس ہی میں جا کر دم لیا-

ملکہ بلقیس کو معلوم ہوا کہ اس کے تحائف حضرت سلیمانؑ نے واپس کر دیئے ہیں تو جی میں بہت ڈری اور قاصد کو دربار میں بلا بھیجا- قاصد پر حضرت سلیمانؑ کی ایسی ہیبت طاری تھی کہ وہ دیر تک بات کرنے کے قابل نہ ہو سکا-

ملکہ بلقیس نے پوچھا- ''اے قاصد! تو اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟ کیا تجھ پر کوئی ظلم ہوا؟''

قاصد نے حواس درست کرتے ہوئے کہا- ''اے ملکہ سبا! مجھ پر حضرت سلیمانؑ کے کسی آدمی نے ظلم نہیں کیا- انہوں نے میری بڑی خاطر مدارات کی لیکن حضرت سلیمانؑ کے محل کی شان و شوکت اور دربار کی سج دھج ایسی تھی کہ میرے پاس اس کے بیان کے لئے الفاظ نہیں- آپ نے سات' سات اینٹیں سونے اور چاندی کی بھیجی تھیں- ان کے محل کی

فصیل ہی ایسی اینٹوں سے تیار ہوئی ہے اور فصیل بھی ایسی کہ اس کا طول اور عرض تیس کوس ہے- آپ کے سات پردے زربفت کے وہاں کیا حقیقت رکھتے ہیں جہاں کے ہزاروں دروازوں پر ایسے ہی پردے آویزاں نظر آتے ہیں اے ملکہ! میں وہاں کا حال کیا بیان کروں؟ حضرت سلیمانؑ کے تخت کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے- صرف ہزار کرسیاں سونے اور چاندی کی ان کے امیروں کے لئے بچھائی جاتی ہیں- غلاموں کی تعداد کا میں اندازہ نہیں کر سکا-"

ملکہ نے دبی آواز سے پوچھا-"پھر ہمارے تحائف کے بارے میں انہوں نے کیا فرمایا اور کیوں واپس کر دیئے؟"

قاصد نے کہا-"اے ملکہ! انہوں نے آپ کے تحفے یہ کہہ کر واپس کر دیئے کہ ان کے خدا نے اتنا کچھ انہیں دیا ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتیں اور پھر بڑے جلال کے ساتھ فرمایا کہ اب وہ ہمارے ملک پر لشکر کشی کریں گے اور ہمیں ذلیل کر کے ملک سبا سے نکال دیں گے-"

ملکہ لرز اٹھی اور بولی-"حضرت سلیمانؑ نے تم سے میرے بارے میں کچھ پوچھا تھا-؟"

قاصد نے جواب دیا-"جی نہیں- انہوں نے آپ کے یا آپ کے ملک کے بارے میں کوئی بات نہیں کی- وہ صاحب حیثیت بادشاہ ہیں اور نبوت کے درجے پر سرفراز معلوم ہوتے ہیں کیونکہ میں نے جنوں کو ان کے دربار میں درباری کرتے دیکھا ہے-"

ملکہ سبا بلقیس بولی-"بے شک وہ نبی ہی ہوں گے لیکن میں پوری پوری تحقیق کروں گی- میں ان سے معجزے کی فرمائش کروں گی کیونکہ پیغمبری کی اصل دلیل معجزہ ہوا کرتی ہے اگر انہوں نے معجزہ دکھایا تو میں ضرور ان پر ایمان لے آؤں گی-"

قاصد نے ملکہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اے ملکہ ان سے معجزے کی فرمائش کرنا ضروری نہیں کیونکہ ان کا محل تخت اور وہاں کی ایک ایک چیز معجزے سے کم نہیں۔ محل ودربار کی ہر چیز ایسی ہے جسے انسانی ہاتھ اور طاقت تیار کر ہی نہیں سکتے۔''

ملکہ بلقیس نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور رخصت کر دیا۔

ملکہ بلقیس' رات بھر اس بارے میں سوچتی رہی اور حضرت سلیمانؑ کی نبوت کو آزمانے پر غور کرتی رہی۔ صبح ہوئی تو اس نے حکم دیا کہ ایک سو کم عمر کنیز زادیاں اور ایک سو نونہال نازک بدن غلام بچے حاضر کئے جائیں۔ اس کے حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور دو سو بچے بچیاں جن کی دور سے شناخت کرنا قطعی ناممکن تھا۔ بلقیس کے سامنے پیش کئے گئے ملکہ نے دوسرا حکم دیا کہ ان سب کو ایک ہی طرح کے لباس پہنائے جائیں۔ جب اس کے حکم کی تعمیل ہوئی تو ملکہ خود ان کی جنس معلوم کرنے سے قاصر رہی۔

دوسرا کام' اس نے یہ کیا کہ ایک سونے کی ڈبیہ میں ایک درناسفتہ (بغیر چھید کا موتی) بند کر کے رکھ دیا سونے کی ایک صندوقچی میں اس نے ایک خالی ساغر رکھ کر بند کر دیا پھر اس نے چند بچھڑیاں منگوائیں اور انہیں ایک ساتھ باندھ دیا۔

اس کام سے مطمئن ہونے کے بعد' اس نے حضرت سلیمانؑ کے دربار میں بھیجنے کے لئے ایک سفارت ترتیب دی۔ اس سفارت میں اس نے اپنے دربار کے ذہین ترین آدمیوں کو شامل کیا جن کی عقل ودانش کو وہ پہلے بھی آزما چکی تھی۔

روانگی سے پہلے بلقیس نے اپنے ان دانشوروں کو اپنے پاس بلا کر خوب اچھی طرح سمجھایا اور کہا۔ ''اے دانشورو! اس بات کا خیال رکھنا کہ تم دنیا کے عظیم ترین بادشاہ اور ایک آسمانی پیغمبر کے دربار میں جا رہے ہو خبردار! تم سے کوئی ایسی غلطی نہ سرزد ہو جائے تو ان کی ناراضگی اور میری شرمندگی کا سبب بن جائے۔ اپنے سر جھکائے رکھنا مگر آنکھیں اور کان

کھلے رکھنا۔ اس لئے کہ مجھے حضرت سلیمانؑ کی نبوت کا امتحان منظور ہے ان سے کہنا۔

''اے بادشاہ! اگر آپ نبی ہیں تو غلام بچوں اور بچیوں میں امتیاز کیجئے۔ اگر کسی طرح وہ ان کی شناخت کر لیں تو ان سے پوچھنا کہ ان بچھڑوں اور بچھڑیوں کی شناخت کس طرح کی جاسکتی ہے اگر وہ اپنی نبوت کے زور پر یہ کام بھی کر دیں تو پھر درنا سفتہ کو سفتہ کر دکھائیے یعنی اس میں اس طرح سوراخ کیجئے کہ نہ تو آہن استعمال کیا جائے اور نہ الماس سے کام لیا جائے کیونکہ صرف انہی دو چیزوں کی مدد سے یاقوت میں سوراخ کیا جاسکتا ہے۔ اگر حضرت سلیمانؑ اپنی خفیہ طاقتوں کے ذریعے یاقوت میں سوراخ کر دیں تو پھر صندوقچے میں بند ساغر کو انہیں دینا اور کہنا کہ اسے ایسے پانی سے بھر دیجئے جو نہ تو زمین سے نکلا ہو اور نہ آسمان سے برسا ہو۔''

ملکہ سبا نے سفارت کو ہدایات دے کر حضرت سلیمانؑ کے دربار روانہ کیا مگر دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں حضرت سلیمانؑ اس آزمائش سے ناراض ہو کر ملک سبا پر حملہ نہ کر دیں۔

ملکہ بلقیس کا وفد حضرت سلیمانؑ کے محل پر پہنچا تو اس کی اسی طرح خاطر و مدارات کی گئی جیسے قاصد کی ہوئی تھی۔ محل اور دربار کی شان و شوکت اور عظمت و جلالت دیکھ کر یہ وفد بھی حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا وفد نے وہاں کی ہر چیز کو تخیل و تصور سے بلند پایا۔

وفد کی پذیرائی کے لئے حسب سابق ایک بار پھر دربار آراستہ ہوا۔ حضرت سلیمانؑ تخت پر رونق افروز ہوئے اور وفد کو باریابی کی اجازت دی وفد کے اراکین نے ملکہ بلقیس کا سلام و پیام حضرت سلیمانؑ کو پہنچایا اور معجزہ دکھانے کے سلسلے میں جو چیزیں وہ ساتھ لائے تھے انہیں پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ حضرت سلیمانؑ نے اجازت دے دی۔

وفد نے سب سے پہلے کنیز اور غلام بچے بچیوں کو حضرت سلیمانؑ کے حضور میں پیش

کیا- ان سب کے لباس ایک رنگ اور ایک ہی تراش کے بنے ہوئے تھے- انہیں دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں کون لڑکی ہے اور کون لڑکا-

حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ ہاتھ دھونے کا آفتابہ لا کر ان سب کے ہاتھ دھلوائے جائیں- آفتابہ لایا گیا اور ایک ایک کر کے سب بچے اور بچیوں نے ہاتھ دھونا شروع کئے- ان میں نصف تعداد ایسی تھی جنہوں نے صرف انگلیاں دھوئیں اور بقیہ نصف نے آستینیں چڑھا کر اپنے ہاتھ اوپر تک دھوئے-

حضرت سلیمانؑ نے وفد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا- ''اے ملکہ سبا کے دانشورو! جاؤ اور دیکھو کہ جس جس نے آستینیں چڑھا کر ہاتھ دھوئے ہیں وہ سب لڑکیاں ہیں اور جنہوں نے صرف انگلیاں دھونے پر اکتفا کیا وہ سب لڑکے ہیں- کیونکہ مرد اور عورت کی فطرت اور عادت میں بنیادی فرق یہی ہے-''

حضرت سلیمانؑ کے غلاموں نے انہیں الگ کر دیا تھا- وفد کے اراکین نے جب ان کے پاس جا کر پڑتال کی تو حضرت سلیمانؑ کی بات سچ نکلی- وفد کے دانشور، حضرت سلیمانؑ کی فراست کے قائل ہو گئے-

پھر حضرت سلیمانؑ نے در ناسفتہ کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر ایک کیڑے کو حکم دیا کہ اس میں سوراخ کر دے کیڑے نے فوراً حضرت سلیمانؑ کے حکم کی تعمیل کی کیونکہ حضرت سلیمانؑ بادشاہ جمیع مخلوقات تھے حضرت سلیمانؑ نے یاقوت وفد کے حوالے کر دیا- وفد کے اراکین اس میں سوراخ دیکھ کر حیران رہ گئے-

حضرت سلیمانؑ کے حکم سے بچھڑوں اور بچھیریوں کو سامنے میدان میں لایا گیا- آپ نے حکم دیا کہ ان سب کے سامنے چارہ ڈالا جائے- جانوروں کے آگے چارہ ڈال دیا گیا- ان میں سے کچھ نے فوراً ہی کھانا شروع کر دیا اور کچھ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر سر جھٹکنے کے بعد

بڑی بے دلی سے چارے کی طرف راغب ہوئے- حضرت سلیمانؑ کے غلاموں نے انہیں بھی الگ الگ کر کے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا-

حضرت سلیمانؑ نے وفد سے فرمایا ''اے بلقیس کے درباریو! ایک قطار میں تمام کی تمام بچھڑیاں ہیں کیونکہ انہوں نے فوراً چارے میں منہ ڈال دیا تھا اور دوسری قطار میں بچھڑے ہیں- انہوں نے کھانے میں توقف کیا اور بے دلی سے کھانا شروع کیا-''

بلقیس کے وفد نے میدان میں جا کر تصدیق کی تو حضرت سلیمانؑ کے قول کو سچا اور درست پایا-

وفد کے ارکان نے ساغر والی سونے کی صندوقچی حضرت سلیمانؑ کے سامنے لا کر رکھ دی-

حضرت سلیمانؑ نے صندوقچی سے ساغر نکال کر امیر وفد کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا- ''تم لوگ اپنے گھوڑوں کو میدان میں دوڑاؤ- ان کے جسم سے جو پسینہ ٹپکے' اسے ساغر میں بھر لو- وہ ایسا پانی ہوگا جو نہ تو زمین سے نکلا ہو اور نہ آسمان سے برسا ہے-''

وفد کے ارکان حیرت زدہ رہ گئے- انہوں نے حضرت سلیمانؑ کے حکم کی تعمیل کی اور گھوڑوں کو بھگایا- بھاگنے دوڑنے سے ان کے جسم سے پسینہ خارج ہو کر ٹپکنے لگا اور اس پسینے سے ساغر بھر لیا گیا-

وفد کے ارکان نبوت کے یہ کرشمے دیکھ کر بوکھلا گئے- اب انہیں وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہ تھی- انہوں نے واپسی کی اجازت چاہی تو حضرت سلیمانؑ نے انہیں عزت سے رخصت کیا-

☆☆☆

ملکہ بلقیس کا وفد واپس شہر سبا پہنچ گیا- بلقیس' وفد کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی

تھی- اس نے ارکان وفد کو فوراً دربار میں طلب کر لیا- وفد کے ارکان لرزاں و ترساں دربار میں حاضر ہو کر تعظیم بجالائے-

ملکہ بلقیس نے پوچھا-''تم لوگ گھبرائے ہوئے اور پریشان معلوم ہوتے ہو؟ دربار سلیمانؑ کی دہشت تم پر بھی سوار ہے مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ حضرت سلیمانؑ کس کس آزمائش سے اور کیونکر گزرے؟''

وفد کے سربراہ نے جواب دیا-''اے ملکہ! دربار سلیمانؑ کا کیا کہنا ایسا دربار ہم نے کبھی دیکھا نہ سنا- وہاں کی ہر چیز اعلیٰ و افضل ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے- آپ ان کی آزمائش کو کہتی ہیں- انہوں نے تو ہر مسئلے اور ہر سوال کو یوں حل کر دیا جیسے بچے گنتی گنتے ہیں-

حضرت سلیمانؑ نے آپ کا درناسفتہ ہتھیلی پر رکھا اور مجھے واپس کر دیا- یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ درناسفتہ نہیں بلکہ سفتہ تھا- ان کے ہاتھ کے لمس سے اس میں آپ ہی آپ سوراخ ہو گیا- یہ معجزہ نہیں بلکہ معجزے سے بڑھ کر کوئی چیز ہے- کنیز' غلام بچوں اور بچیوں کی شناخت میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی بچھڑے اور بچھڑیاں ان کے حکم سے جیسے آپ ہی آپ الگ ہو کر قطاروں میں جا کھڑے ہوئے' آپ کے بھیجے ہوئے ساغر کو انہوں نے گھوڑوں کے پسینے سے بھروا کر اعلیٰ ترین ذہانت کا مظاہر کیا- وہ نبی اور برحق پیغمبر ہیں- میں ان کی گواہی دینے کو تیار ہوں-''

ملکہ بلقیس نے اپنے وزیر سے پوچھا-''اے وزیر باتدبیر تیرا کیا خیال ہے-؟''

وزیر نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا-''اے ملکہ سبا! عقل و دانش اور فہم و فراست میں تیرا مقام ہم سے برتر ہے- ہم تجھے کیا رائے دے سکتے ہیں بلکہ ہم تو خود تیرے مشورے کے خواستگار ہیں-''

ملکہ بلقیس فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''تو' اے درباریوں! سنو میں حضرت سلیمانؑ کی نبوت کی دل سے قائل ہوئی میں چاہتی ہوں کہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کرلوں۔''

وزیر نے جواب دیا۔ ''ملکہ نے بڑی عقلمندی کا فیصلہ کیا ہے۔ اگر ہم نے حضرت سلیمانؑ سے جنگ کا ارادہ کیا تو ان کے کہنے کے مطابق ضرور تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے آپ اس دربار اعلیٰ میں پہنچ کر ملک سبا اور رعیت کے لئے امان حاصل کیجئے۔''

ملکہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میں کل ہی دربار سلیمانؑ کی طرف روانہ ہو جاؤں گی۔ تم میرے اس تخت شاہی کو ہفت در بند تہہ خانے میں پہنچوا دو اور اس پر سخت پہرہ لگوا دو تا کہ کوئی دشمن اسے حاصل نہ کر سکے کیونکہ تخت شاہی' بادشاہت اور حکومت پر دلالت کرتا ہے میں واپس آ کر اسے نکلوالوں گی۔''

وزیر نے کہا۔ ''آپ اطمینان سے تشریف لے جایئے۔ ہم تخت کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کریں گے۔ دور' دور تک پہرہ لگا دیا جائے گا تا کہ پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔''

ملکہ بلقیس نے دربار برخاست کر دیا اور روانگی کے انتظام میں مصروف ہوئی۔ اس کے وزیر نے بلقیس کا تخت شاہی دربار سے اٹھوا کر ہفت در بند تہہ خانے میں پہنچوا دیا۔ اس کے ساتوں دروازے اچھی طرح مقفل کرائے اور صدر دروازے پر زبردست پہرہ لگا دیا جس عمارت میں ہفت در بند تہہ خانہ تھا' اس کے چاروں طرف بھی سوار اور پیادے مقرر کر دیئے۔

دوسری صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی ملکہ سبا بلقیس بڑی آن بان سے دربار حضرت سلیمانؑ کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک لشکر جرار تھا۔ دائیں بائیں' لونڈی غلام زرق برق لباس میں پروانہ وار چل رہے تھے۔

ادھر تو ملکہ بلقیس کا لشکر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا' ادھر حضرت سلیمانؑ کی تابع اور فرمانبردار ہوا' دربار سلیمانؑ میں پہنچی اور ملکہ بلقیس کی ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ' اس طرف آنے کی خبر حضرت سلیمانؑ و پہنچائی۔

ہوا کے آنے سے پہلے ایک جن نے یہ خبر حضرت سلیمانؑ کو پہنچا دی تھی وہ جن شاید ملکہ بلقیس کا مخالف تھا اور اسے ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ھا۔ اس نے بلقیس کی آمد کی خبر کے ساتھ' حضرت سلیمانؑ کو یہ بھی بتایا کہ بلقیس کی ساقوں (پنڈلیوں) پر گھنے سیاہ بال ہیں۔ ساقوں پر بال ہونا' عورت کے لئے بڑا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔

جن نے یہ بتا کر حضرت سلیمانؑ کو دراصل بلقیس کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ جن بلقیس کے اس لئے خلاف تھا کہ بلقیس کی ماں رواحہ جو جنیہ تھی' اس کا' اس جن سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا جس کا بدلہ وہ بلقیس سے لینا چاہتا تھا۔

حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ شاہی تخت کے سامنے ایک خوبصورت حوض بنایا جائے اور اس میں طرح طرح کی رنگ برنگی مچھلیاں ڈالی جائیں پھر اس حوض کے اوپر بلقیس کے آنے والے راستے میں شیشے کا ایک پل پانی کی سطح کے برابر بنایا جائے لیکن وہ اس طرح کا ہو کہ دکھائی نہ دے اس سے مقصد یہ تھا کہ جب بلقیس تخت کے پاس آنے کے لئے حوض کی طرف بڑھے گی تو اس کے راستے میں پانی حائل ہو گا۔ شیشے کا پل اسے نظر نہیں آئے گا اس لئے وہ پائنچے چڑھا کر حوض کو پار کرے گی۔ اس طرح اس کی پنڈلیوں کا عکس پانی میں پڑے گا اور یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس کی ساقوں پر بال ہیں یا نہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے حکم کی دیر تھی کہ فوراً حوض تیار کیا گیا اور اس پر شیشے کا پل اس طرح بنایا گیا کہ کسی کو بھی نظر نہ آیا۔

اس کے بعد حضرت سلیمانؑ نے درباریوں پر نظر ڈالی اور فرمایا۔ (قرآن

مطابق) ''کہا حضرت سلیمانؑ نے کہ اے درباریو! تم میں کوئی ہے کہ لے آوے میرے پاس تخت بلقیس کا پہلے اس سے کہ وہ آوے میرے پاس کہا ایک جن نے جنوں میں سے کہ لے آؤں گا آپ کے پاس اس کا تخت پہلے اس سے کہ آپ اٹھیں اپنی جگہ سے اور (تحقیق) میں البتہ اس پر زور آور ہوں بامنت اور باامانت اس واسطے کہا۔''

حضرت سلیمانؑ کا وزیر آصف بن ربخیا جو دربار میں پہلی کرسی پر بیٹھتا تھا کھڑے ہو کر بولا (قرآن) ''کہا' اس شخص نے کہ نزدیک اس کے علم تھا (یعنی اسم اعظم وہ اللہ تعالیٰ کا جانتا تھا) میں لے آؤں گا آپ کے پاس تخت بلقیس کا پھر آوے طرف آپ کے نظر آپ کی (یعنی نظر گھمانے کے وقفے کے دوران گویا پلک جھپکاتے)''

چنانچہ حضرت سلیمانؑ کے حکم دیتے ہی آصف بن برخیا نے اسم اعظم پڑھا اور صرف ایک پل میں بلقیس کا وہ تخت جسے بلقیس کے آدمیوں نے ہفت در بند تہہ خانے میں رکھ کر پہرہ لگا دیا تھا حضرت سلیمانؑ کے پاس پہنچ گیا۔ بلقیس کا یہ تخت نہایت بیش قیمت تھا اور اس میں طرح طرح کے جواہر لگے ہوئے تھے۔

حضرت سلیمانؑ نے فرمایا۔ (قرآن) ''روپ بدل کر دکھاؤ' اس عورت کو اس کا تخت تا کہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ اس میں سوجھ بوجھ ہے یا نہیں یا ان لوگوں میں اس کا شمار ہے جن میں سوجھ بوجھ نہیں۔''

ملکہ بلقیس کا تخت' جواہرات سے مرصع تھا حضرت سلیمانؑ کے حکم سے تمام ہیرے جواہرات اکھاڑ دیئے گئے اور پھر انہیں از سر نو دوسرے قرینے سے مرصع کیا گیا ہیروں اور جواہرات کی جگہ بدل جانے سے اس تخت کا روپ ہی بدل گیا تھا۔ اس سے مقصد بلقیس کی عقل کی آزمائش تھی اور پھر اپنا معجزہ دکھانا مقصود تھا۔

کچھ دن بعد ملکہ سبا بلقیس اپنے لشکر کے ساتھ حضرت سلیمان کے محل پر پہنچی تو محل کی

تعمیر وتزئین سے بڑی حیران ہوئی اور دل میں سوچا کہ جو کچھ لوگوں نے مجھے بتایا وہ بے شک ٹھیک تھا- یہ شان وشوکت ایک شاہ ہفت اقلیم اور نبی ہی کی ہوسکتی ہے وہ دل ہی دل میں ان کی نبوت کی قائل ہوکر مسلمان ہوگئی-

بلقیس جب سر دربار پہنچی تو حضرت سلیمانؑ کو تخت شاہی پر رونق افروز دیکھا- جڑاؤ تخت اور سونے چاندی کے درختوں اور پرندوں کی چمک دمک دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں-

وہ آگے بڑھی تو تخت سلیمانؑ اور اپنے درمیان پانی سے بھرے حوض کو حائل دیکھا- جس سے اسے دوسری طرف جانے کا کوئی راستہ نظر نہ آیا تو اس نے پائنچے گھٹنوں تک چڑھا لئے تاکہ لباس نہ بھیگے حضرت سلیمانؑ کی نظریں اس کی ساقوں پر پڑیں تو انہیں معلوم ہوا کہ وہاں بال بالکل نہیں ہیں اور جن کا یہ کہنا غلط ہے کہ بلقیس کی ساقوں پر بال ہیں-

بلقیس نے حوض میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو شیشہ ہے وہ اپنی کم عقلی پر شرمندہ ہوئی اور پل سے گزر کر حضرت سلیمانؑ کے سامنے آئی اور ان کی تسلیم وتعظیم بجالائی- معاً بلقیس کی نظر ایک چھوٹے تخت پر پڑی جو تخت سلیمانؑ کے سامنے رکھا تھا- اسے دیکھ کر بلقیس بڑی حیران ہوئی اس نے باوجود تبدیلی کے اپنا تخت پہچان لیا-

قرآن حکیم میں آیا ہے کہ جب بلقیس، حضرت سلیمانؑ کے پاس آئی تو کسی نے اس سے کہا- ''ایسا ہے تیرا تخت؟''

تب وہ اپنے تخت کے پاس جا کر بولی- ''گویا یہ وہی تخت ہے اور معلوم ہوچکا ہے ہم کو کسی ذریعے سے اور ہم تو مسلمان ہوچکے ہیں-''

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بلقیس پہلے ہی دل میں ایمان لاچکی تھی- اس لئے اسے تخت کو پہچاننے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی- اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بلقیس عقلمند اور

ہوشیار تھی۔

اس واقعے کے متعلق ایک اور روایت بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ بلقیس کے ساقوں پر بکری جیسے بال تھے۔ جب وہ پائنچے اٹھا کر حوض سے گزرنے لگی تو حضرت سلیمانؑ کو اس کا علم ہوا...... پھر حضرت سلیمانؑ نے بال دور کرنے کی ایک دوا تجویز فرمائی۔ اس دوا کا نام ''نورہ'' لکھا گیا ہے یہ دوا بہت مشکل سے تیار ہوتی تھی۔

ملکہ سبا بلقیس ایمان لا چکی تھی۔ اس نے حضرت سلیمانؑ کی بادشاہت اور نبوت کو تسلیم کر لیا اور ان کی اطاعت کا اعلان کر دیا حضرت سلیمانؑ نے ملکہ بلقیس سے عقد فرمایا اور اس کے لئے ایک نہایت عالیشان محل تعمیر کرایا۔

☆☆☆

قرآن حکیم اور دیگر آسمانی کتب میں ملکہ سبا بلقیس اور حضرت سلیمانؑ کے نکاح کا ذکر موجود نہیں ہے بعض کا قول ہے کہ جب بلقیس نے اسلام قبول کیا تو حضرت سلیمانؑ نے اسے حکم دیا کہ وہ کسی سے نکاح کرلے بلقیس نے نکاح کرنے سے انکار کیا۔ اس پر حضرت سلیمانؑ نے اسے سمجھایا کہ اسلام میں نکاح ایک ضروری چیز ہے۔

چنانچہ بلقیس رضامند ہو گئی اور خود بلقیس کے کہنے پر اس کا نکاح ہمدان کے بادشاہ ذاتبع سے کر دیا گیا۔ نکاح کے بعد بلقیس اپنے وطن سبا چلی گئی اور حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بھی سبا پر بدستور حکومت کرتی رہی۔ اس کی حکمرانی کی مجموعی مدت چالیس سال بتائی جاتی ہے۔

لیکن زیادہ تر علمائے کرام اور مفسرین و مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ملکہ سبا بلقیس کا عقد حضرت سلیمانؑ سے ہوا تھا۔ ان کے خیال میں یہ دلیل درست نہیں کہ جس بات کا ذکر کتب آسمانی میں موجود نہ ہو اس سے انکار کر دیا جائے کیونکہ خدا تعالیٰ کتب آسمانی میں

صرف اسی قدر قصہ بیان فرماتا ہے جس کی حصول عبرت کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔قرآن حکیم جامع ہے اوراس میں غیر ضروری باتیں درج نہیں۔

مورخین اور مفسرین نے بعض ایسی اہم روایتیں بیان فرمائی ہیں جن سے حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا بلقیس کا عقد ثابت ہوتا ہے۔مورخین نے اس سلسلے میں روایت بیان کی ہے کہ ایک دن ملکہ سبا بلقیس نے حضرت سلیمانؑ سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے تخت پر بٹھا کر اس جزیرے کی سیر کرائیں جہاں اڑنے والے دریائی گھوڑے ہوتے ہیں حضرت سلیمانؑ نے بلقیس کو تخت پر بٹھایا اور ہوا کو اس جزیرے میں پہنچانے کا حکم دیا' جہاں کی بلقیس نے فرمائش کی تھی۔ ہوا نے حسب الحکم' تخت سلیمانی کو اس جزیرے میں پہنچایا جو سات دریاؤں کے درمیان واقع تھا یہ جزیرہ بڑا سرسبز اور شاداب تھا۔ یہاں کے سبزے اور آب رواں کی بہار دیکھ کر ملکہ بلقیس بہت خوش ہوئی۔اس نے وہاں دریائی گھوڑے دیکھے جو پانی میں نہا رہے تھے اور اٹکھیلیاں کر رہے تھے حضرت سلیمانؑ کے تخت کو دیکھ کر یہ گھوڑے گھبرا گئے اور پرندوں کی طرح اڑ کر فضاؤں میں گم ہو گئے۔

بلقیس اور حضرت سلیمانؑ کو ان کی خوبصورتی بہت پسند آئی آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ ان گھوڑوں کو پکڑ کر حاضر کریں۔جنوں نے حضرت سلیمانؑ کو بتایا کہ ان گھوڑوں کو صرف ایک جن پکڑ سکتا ہے جس کا نام سمندرون ہے سمندرون جن حضرت سلیمانؑ سے باغی ہو کر چھپ گیا تھا۔حضرت سلیمانؑ نے اسے کسی نہ کسی طرح پکڑوا بلایا پھر اس شرط پر اسے معافی دینے کا وعدہ کیا کہ وہ دریائی گھوڑوں کو پکڑ لائے۔

کہتے ہیں' سمندرون جن نے ان گھوڑوں پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور انہیں پکڑ کر حضرت سلیمانؑ کے سامنے پیش کیا۔قرآن حکیم میں مرقوم ہے''جس وقت کہ روبرو لائے گئے سلیمانؑ کے شام کو خاصے گھوڑے پس حضرت سلیمانؑ نے کہا۔ (تحقیق) میں نے

دوست رکھا مال کو اپنے رب کی یاد سے یہاں تک کہ سورج چھپ گیا پردے میں۔"
پھر کہا۔"لاؤ ان گھوڑوں کو میرے پاس پس شروع کیا ہاتھ پھیرنا پیروں اور گردن پر ان گھوڑوں کے۔"

اس کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے کہ حضرت سلیمانؑ گھوڑوں کی لطافت اور خوبیاں دیکھنے لگے۔ یہاں تک کہ نماز عصر قضا ہو گئی اسی وقت حضرت جبرائیلؑ نمودار ہوئے اور فرمایا کہ اے سلیمانؑ تو دنیا کے مال و دولت میں ایسا مشغول ہوا کہ نماز عصر جاتی رہی۔

یہ الفاظ سنتے ہی حضرت سلیمانؑ سجدے میں گر پڑے۔ وہ زار زار روتے تھے اور استغفار کرتے تھے لیکن ان کی اس غفلت پر ان پر عذاب نازل ہوا۔

قرآن حکیم میں اس کا ذکر یوں ہے۔(قرآن" آزمایا ہم نے سلیمانؑ کو اور ڈال دیا ہم نے اوپر کرسی اس کی کے ایک دھڑ...... پھر اس نے رجوع کیا۔"

قرآن حکیم کی اس آیت کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے...... کہ حضرت سلیمانؑ کی ایک کنیز کا نام یمینہ تھا۔ جب حضرت سلیمانؑ رفع حاجت کے لئے تشریف لے جاتے تو انگوٹھی اتار کر اسے پکڑا جاتے تھے۔ انگوٹھی پر اسم اعظم تحریر تھا۔ اس لئے اس کے احترام میں آپ گندی جگہ اس کو نہ لے جاتے تھے۔ جب فارغ ہو کر آتے تو انگوٹھی یمینہ سے لے کر انگلی میں پہن لیتے اور تخت پر بیٹھ کر حکومت کرتے۔

ایک صبح ایسا ہوا کہ آپ انگوٹھی یمینہ کے حوالے کر کے رفع حاجت کے لئے گئے لیکن یمینہ نے دیکھا کہ حضرت سلیمانؑ فوراً ہی واپس آ گئے ہیں۔ اس قدر جلدی آنے کا پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا مگر یمینہ کو کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا اور چپ چاپ انگوٹھی ان کے حوالے کر دی پھر حسب معمول اپنے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

ابھی تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ یمینہ کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے پوچھا۔

''یمینہ ! تم میری اجازت کے بغیر وہاں سے کیوں چلی آئیں؟''
یمینہ نے اس شخص کو نہ پہچانا اور پوچھا- ''تم کون ہو اور مجھ سے اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو؟''
اس شخص نے کہا- ''یمینہ ! تجھے کیا ہو گیا ہے تو اپنے آقا سلیمانؑ کو نہیں پہچانتی' بتا میری انگوٹھی کہاں ہے؟''
یمینہ کو اس شخص کی باتوں پر بڑی حیرانی ہوئی- اس نے کہا ''اے بھائی! تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا- حضرت سلیمانؑ تو اپنے تخت پر بیٹھے حکومت کر رہے ہیں اور تو اپنے آپ کو حضرت سلیمانؑ بتا رہا ہے-''
اس شخص کو (جو حضرت سلیمانؑ تھے) یمینہ کی بات پر بڑا غصہ آیا اس نے ڈپٹ کر کہا- ''کیا بکواس کیے جا رہی ہے؟ وہ میری انگوٹھی کہاں ہے؟''
کنیز کو بھی غصہ آ گیا- اس نے بگڑ کر کہا- ''پاگل انسان! انگوٹھی جس کی تھی وہ مجھ سے لے گیا تو کون ہوتا ہے مجھ سے پوچھنے والا؟ جا نکل جا ورنہ غلاموں سے کہہ کر نکلوا دوں گی-'' یہ کہہ کر وہ منہ بناتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی-
حضرت سلیمانؑ اس صورت حال سے بہت پریشان ہوئے انہیں یہ تو اندازہ ہو گیا کہ ان میں ضرور کوئی ایسی کمی ہو گئی ہے جس کی وجہ سے ان کی خاص کنیز بھی انہیں پہچاننے سے قاصر ہے پھر انہیں انگوٹھی کا خیال آیا- اس کے ساتھ ہی حضرت جبرائیلؑ کا یہ کہنا کہ جس کے ہاتھ میں یہ انگوٹھی ہو گی وہ دنیا پر بادشاہت کرے گا- انہوں نے دل میں کہا کہ ہو نہ ہو' یہ سب کچھ انگوٹھی کی گم شدگی کی وجہ سے ہوا ہے-
یہی کچھ سوچتے ہوئے حضرت سلیمانؑ دربار میں پہنچے- انہوں نے دیکھا کہ ان کا ایک ہم شکل تخت سلیمانؑ پر بیٹھا ہے' دربار لگا ہوا ہے امیر و وزیر اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہیں

پرندے اس کے سر پر سایہ کئے ہوئے ہیں- یہ دیکھ کر اور حیران ہوئے- انہیں اپنے وزیر آصف بن برخیا پر بڑا اعتماد تھا- حضرت سلیمانؑ اس خیال سے اس کے پاس پہنچے کہ شاید وہ انہیں پہچان لے-

آصف بن برخیا کی نظر ان پر پڑی تو بگڑ کر بولا- ''تم کون ہو اور دربار میں کس طرح گھس آئے ہو؟''

حضرت سلیمانؑ نے کہا- ''اے آصف! تو بھی مجھے نہیں پہچانتا میں تیرا آقا سلیمان اور خدا کا نبی ہوں خدا کے لئے مجھے پہچان اور میری تحقیر نہ کر-''

کچھ اور سرداروں نے بھی حضرت سلیمانؑ کی یہ بات سنی تو تمسخر کیا ایک نے کہا- ''اس پاگل کو دربار سے نکالو-''

دوسرا گویا ہوا- ''دفع کرو اس کو- اگر حضرت سلیمانؑ کو معلوم ہو گیا کہ یہ تخت کا دعویدار ہے تو مفت میں مارا جائے گا-''

دربار، سرکار محل اور دروازہ حضرت سلیمانؑ ہر جگہ چکر لگاتے رہے اور ایک ایک سے اپنی شخصیت بیان کرتے رہے مگر کسی نے انہیں نہ پہچانا- آخر مایوس ہو کر وہ محل سے نکل کر شہر میں آ گئے انہیں سخت بھوک لگ رہی تھی- انہوں نے ایک گھر پر پہنچ کر روٹی مانگی مگر وہ عتاب الٰہی میں تھے اس لئے انہیں کسی نے کھانا نہ کھلایا- حضرت سلیمانؑ بھوک سے نڈھال تھے چلا نہ جاتا تھا- اسی طرح گرتے پڑتے وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے وہاں مچھیروں کی بستیاں تھیں اور مچھیرے مچھلیاں پکڑ رہے تھے-

حضرت سلیمانؑ ان کے پاس پہنچے اور بولے- ''بھائی! مجھے اپنے ساتھ کام پر لگا لو- بس روٹی دے دیا کرنا مجھے-''

مچھیروں کو آپ کے حال زار پر رحم آ گیا- ان کے سردار نے پوچھا ''اے بندہ خدا!

تجھ پر کیا افتاد پڑی اور تو کہاں سے آ رہا ہے؟''

حضرت سلیمانؑ نے کہا۔''بس کیا بتاؤں بھائی! اللہ کا ایک گنہگار بندہ ہوں۔ حال یہ ہے کہ کئی دن سے ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہیں گئی ہے۔''

سردار کو ان پر بڑا ترس آیا اور انہیں کام پر لگا لیا۔

حضرت سلیمانؑ دن بھر مچھلیاں پکڑتے رہے اور خدا کا شکر ادا کرتے رہے۔ شام ہوئی تو انہیں کام کے عوض دو مچھلیاں ملیں۔ آپ مچھلیاں لے کر بستی کے بازار گئے۔ ایک مچھلی دے کر روٹی حاصل کی اور دوسری کو بھون کر اس کے ساتھ روٹی کھائی جسم میں توانائی آئی تو بیت المقدس کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر سجدے میں گر گئے۔ تمام رات توبہ و استغفار کی صبح ہوتے ہی دربار پر پہنچے اور کام میں لگ گئے وہ اسی طرح صبر و شکر سے مچھیروں کی بستی میں دن گزارنے لگے۔

حضرت سلیمانؑ کو اس بستی میں رہتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا۔ ایک دوپہر حضرت سلیمانؑ کام سے تھک کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے تھکن کی وجہ سے ان پر نیند کا غلبہ ہوا اور آپؑ بے خبر ہو گئے اس دن گرمی زیادہ تھی۔ آپؑ کا چہرہ اور بدن پسینے سے بھیگ گیا ناگاہ ایک طرف سے ایک کالا ناگ نمودار ہوا۔ وہ آپ کے قریب آیا اور درخت کا ایک پتہ منہ میں دبا کر آپ پر پنکھا کرنے لگا۔

مچھیروں کے سردار کی ایک دختر نہایت حسین تھی وہ روز دوپہر کو اپنے باپ کا کھانا لے کر آتی تھی۔ اس دن جو وہ وہاں سے گزری تو اس کی نظر حضرت سلیمانؑ پر پڑی وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئی کہ انسان کا جانی دشمن منہ میں پتہ دبائے' انسان کو پنکھا جھل رہا ہے۔ لڑکی عقلمند تھی' سمجھ گئی کہ یہ شخص کوئی بڑا بزرگ ہے جس کی خدمت سانپ کر رہا ہے۔

لڑکی نے کھانا لے جا کر باپ کو کھلایا اور چلتے وقت کہا۔''اے باپ تو میری شادی اس

شخص کے ساتھ کردے جو سامنے درخت کے نیچے سو رہا ہے۔"

اس کے باپ کو علم تھا کہ وہاں مفلوک الحال اجنبی پڑا ہے۔ اس نے کہا۔"نا سمجھ لڑکی! تیرا گزارہ، اس مفلس، قلاش کے ساتھ کیسے ہوگا؟ اسے تو صرف دو مچھلیاں مزدوری کی ملتی ہیں۔"

لڑکی ضد پکڑ گئی بولی "نہیں میں تو صرف اسی سے شادی کروں گی ورنہ پھر شادی ہی نہ کروں گی۔"

باپ نے لاکھ سمجھایا مگر لڑکی نہیں مانی۔ اس نے تنگ آ کر کہا۔"اچھا چل اس سے پوچھتے ہیں اگر وہ راضی ہوگیا تو میں دخل نہ دوں گا۔"

دونوں باپ بیٹی حضرت سلیمانؑ کے پاس آئے وہ اس وقت تک بیدار ہو چکے تھے۔ لڑکی کے باپ نے کہا۔"اے اجنبی! میں چاہتا ہوں کہ اپنی بیٹی کی شادی تیرے ساتھ کردوں۔"

حضرت سلیمانؑ گھبرا کر بولے۔"سردار! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے مزدوری میں صرف دو مچھلیاں ملتی ہیں۔ اس میں میرا ہی گزار مشکل سے ہوتا ہے میں اس کا بار کیسے اٹھاؤں گا اور مہر کہاں سے لاؤں گا۔ میں تمہاری لڑکی کو مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔"

لڑکی کے باپ نے کہا۔"لڑکی اپنا مہر طلب نہیں کرتی۔ رہا تمہارے گزر اوقات کا سوال تو اس کا ذمہ بھی میں لیتا ہوں۔ اب تو تمہیں کوئی عذر نہیں؟"

حضرت سلیمانؑ گھبرا گئے اور سوچنے لگے کہ اگر انہوں نے انکار کیا تو یہ مزدوری بھی ختم ہو جائے گی اور پھر پتہ نہیں کہاں کہاں ٹھوکریں کھانا پڑیں انہوں نے فوراً رضامندی ظاہر کردی۔

سردار، حضرت سلیمانؑ کو اپنے ساتھ بستی میں لے گیا اور شام کو بستی والوں کو اکٹھا کر کے

اپنی لڑکی ان کے ساتھ بیاہ دی- اس نے ان دونوں کے لئے ایک الگ جھونپڑی بھی بنوادی اور دو مچھلیوں کے بجائے تین مچھلیاں یومیہ مزدوری مقرر کر دی-

☆☆☆

حضرت سلیمانؑ کے تخت پر غاصبانہ قبضہ کرنے والا ایک جن تھا' جس کا نام صخرہ بیان کیا گیا ہے وہ حضرت سلیمانؑ کی شکل بنا کر' اس وقت یمینہ کے پاس پہنچا تھا جب حضرت سلیمانؑ رفع حاجت کے لئے گئے تھے اور یمینہ نے اسے حضرت سلیمانؑ سمجھتے ہوئے بلا عذر انگوٹھی دے دی تھی-

صخرہ نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہنی اور جا کر حضرت سلیمانؑ کے تخت پر بیٹھ گا- انگوٹھی کے زیر اثر تمام وحوش وطیور اور جن وانس اس کے مطیع ہو گئے- دربار لگ گیا اور پرندوں نے بلند ہو کر اس کے اوپر اپنے پروں کا سایہ کر دیا- اس طرح صخرہ حضرت سلیمانؑ کا روپ دھار کر ہفت اقلیم پر حکومت کرنے لگا-

جن و بشر کی عادات اور حرکات وسکنات میں فرق ہوا کرتا ہے- صخرہ کے تخت پر بیٹھنے کے پہلے ہی دن سے درباریوں کو اس پر شبہ ہونے لگا مگر وہ اپنے شبہے کا اظہار ایک دوسرے سے کرتے ڈرتے تھے کہ مبادا ان کا شبہ غلط ہو اور حضرت سلیمانؑ ان سے ناراض ہو جائیں-

حضرت سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیا کے دل میں سب سے زیادہ شبہ تھا لیکن وہ بھی بغیر تحقیق کئے کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا وہ دربار میں بناوٹی سلیمان پر نظریں جمائے رکھتا اور اس کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا-

چالیس دن گزرنے کے بعد آصف بن برخیا' حضرت سلیمانؑ کی حرم سرا پر گیا- پہلے اس نے ملکہ بلقیس سے ملاقات کی اور حضرت سلیمانؑ کے بارے میں دریافت کیا- بلقیس نے بتایا کہ اس نے ایک مہینے سے حضرت سلیمانؑ کو نہیں دیکھا ہے پھر وہ دوسرے محل گیا-

وہاں سے بھی اسے اسی قسم کی اطلاع ملی غرض کہ اس نے حضرت سلیمانؑ کی تمام بیگمات سے معلومات حاصل کیں لیکن کہیں سے ان کا پتہ نہ چلا۔

اب تو بات بالکل صاف ہو گئی تھی۔ آصف بن برخیا نے کچھ اور سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا پھر اس نے چالیس ایسے آدمیوں کو بلوایا جو توریت خوانی کرتے تھے پھر ایک دن جب نقلی سلیمان، تخت سلیمانی پر بیٹھا بڑی شان سے شاہی احکامات دے رہا تھا تو آصف بن برخیا نے غلام کو اشارہ کیا۔ وہ بھاگ کر چالیس توریت خوانوں کو بلا لایا۔

توریت خواں تیزی سے تخت سلیمانی پر چڑھ گئے اور انہوں نے توریت شریف کھول کر بڑے لحن کے ساتھ شروع کر دی۔ صخرہ چونکہ جن تھا، اس لئے وہ تخت پر نہ بیٹھ سکا اور اٹھ کر بھاگا۔

آصف بن برخیا نے اپنے آدمی، اس کے پیچھے دوڑائے مگر وہ ہاتھ نہ آسکا، فرار کے دوران صخرا، ایک دریا کے پاس سے گزرا تو اس نے سلیمانی انگوٹھی انگلی سے نکال کر دریا میں پھینک دی تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔

حضرت سلیمانؑ کو بارگاہ ایزدی سے معافی مل چکی تھی۔ اس لئے ان کی بادشاہی اور نبوت کی بحالی کے سامان غیب سے پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ صخرہ جن نے انگوٹھی یہ سمجھ کر دریا میں پھینکی تھی کہ اب یہ کسی کو نہیں مل سکے گی لیکن جیسے ہی انگوٹھی دریا میں گری ایک مچھلی نے اس کو نگل لیا۔

دوسرے دن وہ مچھلی جال میں پھنس کر مچھیروں کے پاس پہنچی اور حضرت سلیمانؑ کے حصے میں آئی۔ دو مچھلیاں لے کر وہ روٹیاں لینے چلے گئے اور تیسری مچھلی بیوی کے حوالے کی کہ بھون رکھے۔

حضرت سلیمانؑ کے بازار جانے کے بعد بیوی نے مچھلی کا پیٹ چاک کیا تو اس میں

سے انگوٹھی نکلی حضرت سلیمانؑ روٹیاں لے کر واپس آئے تو بیوی نے انہیں انگوٹھی دکھائی۔
حضرت سلیمانؑ نے اپنی انگوٹھی فوراً پہچان لی اور بیوی سے لے کر انگلی میں پہنی اور فوراً
سجدے میں گر گئے حضرت سلیمانؑ ابھی سجدے میں گرے اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ
پرندے فرآٹے بھر بھر کر آ گئے اور انہوں نے حضرت سلیمانؑ پر پروں کا سایہ کر دیا اسی وقت
ہوا حضرت سلیمانؑ کا تخت اڑا کر لے آئی۔ بستی والے اتنے بڑے تخت کو اپنی بستی میں دیکھ کر
حیران رہ گئے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کے سردار کا داماد دراصل بادشاہ ہفت اقلیم حضرت
سلیمانؑ ہیں تو وہ خوشی سے ناچنے گانے لگے اور حضرت سلیمانؑ کے سامنے پہنچ کر جو کچھ بھی
ان کے پاس تھا نذرانے کے طور پر پیش کیا۔

حضرت سلیمانؑ مچھیروں کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے انہوں نے برے وقت
میں بیوی کے مہر میں کچھ نہ دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے جنوں کو حکم دیا کہ مچھیروں کی
جھونپڑیوں کی جگہ پکے مکانات بنائے جائیں اور پھر ان سب کو دولت سے مالا مال کر دیا۔

حضرت سلیمانؑ تخت پر سوار ہوئے اپنی مچھیرن بیوی کو ساتھ بٹھایا اور محل واپس آئے۔
وزیر آصف بن برخیا اور تمام لوگوں نے انہیں سلامی دی اور انہیں نہ پہچاننے کی غلطی کے لئے
معافی کے خواستگار ہوئے۔ حضرت سلیمانؑ نے ان سب کو فراخدلی سے معاف کر دیا کیونکہ
وہ جانتے تھے کہ اتنے عرصے تک وہ زیرِ عتاب تھے اور یہ سب کچھ منجانب اللہ تھا۔

حضرت سلیمانؑ دربار سے اٹھ کر محل میں تشریف لے گئے تو تمام بیگمات نے نذریں
گزاریں اور صدقے اتارے۔ مساکین و غرباء میں اجناس اور پارچہ جات تقسیم کئے گئے۔
ان سب کاموں میں ملکہ سبا بلقیس پیش پیش تھی۔

وہبؔ بن منبر نے لکھا ہے کہ ملکہ سبا بلقیس جوانی میں نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔ وہ
لوگوں سے پردہ کرتی تھی اور ہفتے میں صرف ایک بار دربار لگاتی تھی۔ اس کے سامنے

باجگذار بادشاہ، سرنگوں کھڑے ہوتے تھے وہ مظلوم کی فریاد سنتی اور ظالم کو سزا دیتی تھی۔

ملکہ بلقیس، اسلام قبول کرنے کے بعد سات سال اور سات ماہ زندہ رہی اس کا انتقال حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد ہوا اور ارض شام میں تدمر کے مقام پر ایک دیوار کے نیچے دفن کی گئی۔

ملکہ بلقیس کا مدفن اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے زمانے میں دریافت ہوا۔

خلیفہ ولید کے ایک جلیل القدر سردار موسیٰ بن نصیر نے بیان کیا۔

''میں خلیفہ ولید بن عبدالما لک کے دور خلافت میں شہر تدمر کی جانب بھیجا گیا۔ میرے ساتھ خلیفہ کا لڑکا عباس بن ولید بھی تھا ہم تدمر پہنچے تو بارش شروع ہو گئی اور اتنی بارش ہوئی کہ تدمر کی بعض دیواریں گر کر بہہ گئیں ایک دیوار کے گر جانے سے اس کے نیچے سے ایک تابوت نمودار ہوا تابوت کا طول تین گز تھا اور یہ زعفرانی پتھر کا بنا ہوا تھا اس پتھر پر یہ عبارت کندہ تھی

''یہ نیک بخت بی بی بلقیس کا تابوت ہے جو حضرت سلیمانؑ بن داؤدؑ کی بیوی تھی ۲۰ جلوس سلیمانی میں ایمان لائی تھیں۔ ان کا نکاح حضرت سلیمانؑ سے عاشورہ کے دن ہوا تھا اور ماہ ربیع جلوس ۲۷ میں اتوار کے دن ان کا انتقال ہوا اور تدمر شہر میں ایک دیوار کے نیچے رات کو ایسے وقت دفن کی گئیں کہ سوا ان لوگوں کے جنہوں نے انہیں دفن کیا اور کوئی جن وانس ان کے دفن سے واقف نہیں۔''

موسیٰ بن نصیر نے اس واقعے پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے تابوت کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو یوں معلوم ہوا جیسے لاش بالکل تازہ ہے اور وہ آج ہی کی شب دفن کی گئی ہے پھر ہم نے یہ تمام باتیں خلیفہ کو لکھ بھیجیں۔ وہاں سے حکم ہوا تابوت کو اسی جگہ دفن کر دیا جائے اور اس پر سنگ مرمر اور سنگ خارا کی ایک عالیشان عمارت تعمیر کی جائے۔''

ابوحسن محمد بن عبداللہ کسائی کی ''قصص الانبیاء'' میں بھی یہ واقعہ اسی طرح مذکور ہے۔

قطامہ

(ایک کہانی... ایک تاریخ)

ایک حسینہ، ایک قتالہ جس کے غیظ و غضب نے تاریخ کو خونچکاں بنا دیا

منزل دور اور مغرب کی طرف تیزی سے جھکتا ہوا سورج، یہ عبداللہ بن خبابؓ صحابی رسولؐ کے لیے پریشان کن بات تھی وہ کبھی سورج کو دیکھتے تو کبھی کلام اللہ کا ورد کرتے ہوئے اونٹنی پر محمل نشیں بیوی پر نظر ڈالتے۔ وہ اونٹنی کی مہار پکڑے چل رہے تھے۔ جب وہ گھبرا کر اونٹنی کی رفتار سے اپنی رفتار تیز کرتے تو مہار کی ڈوری کو جھٹکا لگتا اور محمل نشین کے کراہنے کی آواز آتی۔ ان کی نیک بیوی پورے دنوں سے تھیں۔

عبداللہ بن خبابؓ کا ناقہ، جسر نہرواں سے گزر رہا تھا۔ جنگ صفین ختم ہو چکی تھی لیکن یہ علاقہ اب تک جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ کسی قدم پر بھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ دشمنانِ اسلام ہر طرف منڈلا رہے تھے۔ انہیں یہ عارضی صلح پسند نہ تھی اور چاہتے تھے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت امیر معاویہؓ ایک بار پھر ٹکرا جائیں اور اسلام کی طاقت پارہ پارہ ہو جائے۔ اپنے حیلوں کے ذریعے حضرت علی کو دھوکہ دینے والے ان خارجیوں کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ وہ خود کو اسلام کا ٹھیکیدار کہتے لیکن مسلمانوں کا خون بہاتے بلکہ مسلمانوں کا خون بہانا تو انہوں نے اپنے عقیدے میں داخل کر لیا تھا۔

یکا یک ناقہ نے پیر روک کر گردن ہلائی تو گردن میں پڑی ہوئی گھنٹیاں ایک چھنا کے

سے بج اٹھیں- یہ کسی نادیدہ خطرے کا اعلان تھا- حضرت ابن خبابؓ نے گھبرا کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں- انہیں ترائی میں کچھ خیمے نظر آئے- جب انہوں نے اور غور کیا تو کچھ اور خیمے بھی نظر پڑے- پھر نظروں کے ساتھ ساتھ خیمے ہی خیمے گویا وہاں خیموں کا ایک شہر سا آباد تھا- خباب ابن خبابؓ تنہا ہوتے تو انہیں کوئی فکر نہ ہوتی مگر اس وقت نحیف و نزار بیوی کا ساتھ' ناقے کو تیز بھی نہ دوڑا سکتے تھے- آخر راضی برضا ہو کر سر جھکا لیا اور آگے بڑھے-

خیموں کے اس شہر سے چند آدمی نکل کر بڑی تیزی کے ساتھ ابن خبابؓ کی طرف بڑھے اور انہیں گھیرے میں لے لیا' اونٹنی زمین پر بیٹھ گئی- ابن خبابؓ کی بیوی نے محمل کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا- انہیں بظاہر چند بزرگ صورتیں نظر آئیں چنانچہ وہ پردہ گرا کر اطمینان سے بیٹھ گئیں-

بزرگ صورتیں' لانبے لانبے گھٹنوں تک لہراتے کرتے' کہنیوں اور پیشانیوں پر نماز کے ڈھٹے- گھٹنے جھاوے کی طرح کھدرے- عبداللہ بن خبابؓ ایک ایک کا منہ حیرت سے تک رہے تھے-

ان ہی سے ایک آگے بڑھا اور ابن خباب کا گریبان پکڑ لیا- ابن خبابؓ کا منہ حیرت سے کھل گیا- کیا یہ رہزن ہیں یا لٹیرے ہیں- صورت سے تو نہیں لگتے- ابن خبابؓ دل ہی دل میں سوچ رہے تھے- انہوں نے گلے میں پڑا ہوا کلام مضبوطی سے پکڑ لیا-

عبداللہ بن خباب کا گریبان پکڑنے والا بڑی رعونت سے بولا-

''میں ہوں امام عبداللہ بن الکوار''

''الحمدللہ میں کوفہ کی مسجد کا پیش امام ہوں-''

عبداللہ بن خباب نے جلدی سے اپنا تعارف کرایا-

ابن الکوار نے کلام پاک کھینچتے ہوئے کہا-

''تمہارے گلے میں جو یہ قرآن ہے' یہ تمہارے قتل کا حکم دیتا ہے۔''

''بھائی! میں بھی مسلمان ہوں۔'' ابن خبابؓ نے لجاجت سے جواب دیا۔ ''میرا نام عبداللہ بن خباب ہے۔''

ابن الکوار نے ایک شیطانی قہقہہ بلند کیا اور لانبا دامن ہوا میں لہرا کر بولا۔

''اچھا کوئی مستند حدیث سناؤ جو تم نے اپنے باپ سے سنی ہو۔'' ابن الکوار کا لہجہ حد درجہ سوقیانہ اور تحقیر آمیز تھا۔

حضرت ابن خبابؓ نے ایک لمحہ سوچا پھر کہا۔

''میرے باپ نے سنایا کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا:

''ایک دن ایسا فتنہ نمودار ہوگا جس میں آدمی کا دل مر جائے گا جیسے اس کا بدن مر جاتا ہے۔ انسان رات کو مومن سوئے گا اور صبح کو کافر اٹھے گا۔ ایسے فتنے میں مقتول ہونا قاتل نہ ہونا۔''

ابن الکوار نے منہ بنایا اور بولا۔

''اچھا! حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟''

''یہ دنوں قابل احترام اور بزرگ خلیفہ تھے۔'' ابن خبابؓ نے سنبھل کر اطمینان سے جواب دیا اور اپنا گریبان چھڑا لیا۔

''تم حضرت عثمان کے ابتدائی زمانہ کے بارے میں کیا کہتے ہو؟'' ابن الکوار نے پوچھا۔

''وہ بہترین عہد تھا۔'' ابن خبابؓ نے مختصر سا جواب دیا۔

''اور علیؓ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' ابن الکوار کا انداز بھونڈا اور تہذیب سے گرا ہوا تھا۔

ابن خبابؓ کے دل کو دھچکا سا لگا اس لیے کہ ابن الکوار نے حضرت علیؓ کا نام بغیر کسی القاب کے بڑی بدتمیزی سے لیا تھا- پس انہوں نے پیش بندی کے طور پر کمر میں لگی تلوار پر اپنا ایک ہاتھ رکھ لیا- پھر متانت سے بولے-

''اے ابن الکوار حضرت علی کرم اللہ وجہہ تمہارے مقابلے میں کتاب اللہ کو زیادہ سمجھتے اور اس پر عمل کرتے تھے-''

''بس تم راہِ راست سے دور ہو گئے اس لے تمہارا قتل ضروری اور جائز ہے-''

یہ کہتے ہوئے ابن الکوار اور اس کے ساتھی ابن خبابؓ پر ٹوٹ پڑے- ابن خبابؓ تلوار بھی نہ نکال سکے اور ان دشمنانِ اسلام نے ابن خباب کو گھسیٹنا شروع کر دیا- کسی نے ہاتھ پکڑے تو کسی نے پیر' تو کسی نے ابن خبابؓ کی گردن پکڑ لی- وہ ابن خبابؓ کو گھسیٹ کر نہر کی طرف لے چلے-

ابن خبابؓ نے اسی حالت میں چیخ کر کہا- ''اے نیک بخت! تو اپنی فکر کر میں تو راہِ حق میں قربان ہونے چلا-''

ابن خباب کی بیوی محمل کے اندر اطمینان سے بیٹھی اپنے آنے والے بچے کے خیال میں ڈوبی ہوئی تھیں- پیارے شوہر کی آواز اس کے کان میں پڑی تو پردہ کھینچ' چیخ مار کر محمل سے باہر آ گئی- اس نے کمر سے خنجر نکالا اور بے تحاشہ ادھر بھاگی جدھر یہ ظالم اس کے شوہر کو لے جا رہے تھے- مگر آخری مہینہ ایک ایک قدم اٹھانا مشکل تھا- وہ غریب تھوڑی ہی دور بھاگی تھی کہ چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی-

وہ بے دین' ابن خبابؓ کو گھسیٹتے ہوئے نہر کے کنارے لے گئے- قرآن حکیم ان کے ساتھ گھسٹ رہا تھا- کبھی زمین پر' کبھی اوپر کبھی نیچے- پھر محرز بن قیس اور اشعث بن رسجا نے ان کے ہاتھ اور سعد بن مذکی اور اشعث بن قیس نے ابن خبابؓ کے دونوں پیر پکڑ کر انہیں

زمین پر پچھاڑ دیا۔

ابن خباب چت پڑے تھے۔ ان کی نظریں آسمان کی طرف تھیں۔ سینے پر عبداللہ بن الکوار سوار ہو گیا۔ اس نے خنجر بلند کر کے ابن خبابؓ پر بھرپور وار کیا۔ خنجر ان کے دل میں اتر گیا۔ ابن خبابؓ نے اف بھی نہ کی۔ زبان ضرور حرکت میں تھی۔ کلمہ طیبہ کے ورد میں زبان اس وقت تک حرکت کرتی رہی جب تک روح قفس عنصری سے نکل کر عالم بالا کی پہنائیوں میں گم نہ ہو گئی۔ ان کے سینے سے خون کا فوارہ اُبلا اور لکیر بناتا نہر کے پانی میں سرخی کی آمیزش کرنے لگا۔

مرتدوں کا دل اب بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ تمام قاتل اس وقت نہر کے کنارے کھڑے رہے جب تک ابن خبابؓ کی لاش ٹھنڈی نہ پڑ گئی۔ پھر وہ واپس ہو کر اس جگہ آئے جہاں ابن خبابؓ کی عفت مآب بیوی غش کھا کے گری تھی۔ ان قاتلوں کے ساتھ عبداللہ بن وہب بھی تھا۔ ابن خباب کی عزت مآب زوجہ چت پڑی تھی۔ ابن وہب نے تلوار کی نوک سے ان کی قمیص کو اوپر کی طرف الٹ دیا۔ پیٹ عریاں ہو گیا۔ ایک ننھی سی جان باہر آنے کے لیے پھڑک رہی تھی۔ ظالم ابن الکوار نے ایک بار پھر شیطانی قہقہہ بلند کیا اور ابن وہب کو اشارہ کیا۔ اس نے تلوار کی انی ابن خبابؓ کی بیوی کے پیٹ میں اتار دی۔

زچہ نے تڑپ کے آنکھیں کھول دیں۔ ابن الکوار نے اپنا پیر زچہ کی گردن پر رکھ کر پورا بوجھ ڈال دیا۔ زچہ کا پیٹ چاک ہو گیا۔ معصوم نومولود دنیا میں آ گیا مگر اس طرح کہ وہ ابن وہب کی تلوار میں چھدا ہوا تھا۔ تلوار اس کے حلقوم میں الجھی تھی اور ابن وہب تلوار کو ہوا میں اٹھا کے لہرا رہا تھا۔

پھر اس طرف زمین پر زچہ نے آخری ہچکی لے کر جسم خاکی کو چھوڑا تو دوسری طرف تلوار میں پرویا ہوا بچہ ہلکا سا ہلا جلا اور اس دنیا کو دیکھے بنا خیر باد کہہ گیا۔ ماں کی روح نے بچے کی

روح کا فضاؤں میں استقبال کیا- بچہ حوروں کی آغوش میں تھا- اس وقت آغوش مادروا ہوئی اور بچہ آغوش حوران بہشتی سے آغوش مادر میں آ گیا- ہوائیں چیخ اٹھیں- فضائیں کانپنے لگیں اور جب یہ دونوں روحیں' عرش اعلیٰ کی طرف محو پرواز ہوئیں تو فرشتوں میں بھاگ دوڑ اور آپا دھاپی مچ گئی- عبداللہ بن خبابؓ کی روح پہلے ہی فریاد کناں تھی- پس عرش تھرانے لگا-

کہتے ہیں کہ شہیدوں کے خون کی زبان ہوتی ہے- یہ خون باتیں کرتا ہے- شہید بھی تو آخر زندہ ہوتے ہیں- پس ان تینوں شہیدوں کا خون یکجا ہوا اور اپنی اپنی داستان سنانے کے لیے بے چین ہو گیا-

ایک تیز رفتار سوار جو خارجیوں کی تلاش میں کوفہ سے آ رہا تھا- اس کا گزر اس شہر کی طرف سے ہوا- خون شہیداں نے اسے آواز دی- سوار کا گھوڑا بھڑکا اور اس نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا- سوار نے گھوڑے کو قابو کرنے کے لاکھ جتن کیے مگر وہ قابو نہ پا سکا- بھلا وہ قابو میں کیسے آتا- خون شہیداں کی پکار اس کے کان کے پردوں سے ٹکرا گئی تھی- چنانچہ سوار کے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی اور گھوڑا اسے نہر کے کنارے حضرت ابن خبابؓ کی لاش پر لے آیا-

سوار نے لاش دیکھی تو کانپ اٹھا- وہ صحابی رسولؐ حضرت ابن خبابؓ کو پہچانتا تھا- پس اس نے جناب ابن خبابؓ کے جسد خاکی کو کھینچ کر ایک گڑھے میں دفن کیا اور اوپر گھاس پھونس ڈال کر ڈھانپ دیا- اس سے فارغ ہو کر سوار نے چاہا کہ کوفہ واپس جائے مگر منہ زور گھوڑا اب بھی باغی تھا- سوار نے گھوڑے کی راسیں ڈھیلی کر دیں- گھوڑا سوار کو لیے ہوئے اس جگہ پہنچا جہاں زوجہ ابن خبابؓ اور ان کے بیٹے کی لاشیں پڑی تھیں- سوار گھوڑے سے اتر کر لاشوں کے قریب پہنچا- وہاں اس نے دیکھا کہ وفادار ناقہ دونوں لاشوں کے درمیان بیٹھا جگالی کر رہا تھا-

سوار نے ان لاشوں کو بھی کسی نہ کسی طرح دفن کیا پھر اس نے ناقہ کی ڈوری گھوڑے کی زین سے باندھی اور آگے بڑھا- آگے چراغاں ہو رہا تھا- خارجیوں نے خیموں کا شہر بسا لیا تھا-جسر نہرواں کا پورا علاقہ خیموں کے احاطے میں تھا- ہر خیمے کے آگے آگ روشن تھی اور اندر چراغ ٹمٹمار ہے تھے-سوار کا سفر ختم ہوا- وہ انہی خارجیوں کی تلاش میں بھیجا گیا تھا- خارجیوں کی چیرہ دستیاں بڑھ گئی تھی اور اس کی خبریں حضرت علیؓ تک پہنچ رہی تھیں- وہ سخت متفکر تھے- خارجیوں کا صحیح مستقر معلوم کرنے کے لیے انہوں نے کئی سوار مختلف اطراف میں روانہ کیے تھے- یہ سوار ان میں سے ایک تھا-

سوار اب خون شہیداں کی کہانی سمجھ چکا تھا- اس کہانی کی کڑیاں خود بخود جڑتی چلی گئی تھیں- اس طرح پوری داستان مکمل ہو گئی تھی- چنانچہ اس نے گھوڑا موڑا اور کوفہ کی طرف واپس ہوا-

☆☆☆

ریگزار عرب شمع اسلام کی کرنوں سے منور ہوا تو یہودیوں کے وقار کا خاتمہ ہو گیا- ان میں مسلمانوں سے مقابلہ کی طاقت نہ تھی- اس لیے انہوں نے زیر زمین رہ کر اپنی سازش کا جال پھیلا دیا تھا- یہودیوں کا سردار اس وقت ملک یمن کا ایک عیار مگر بڑا عالم فاضل یہودی تھا- وہ ایک عالم کا روپ دھار کے عہد عثمان میں مدینہ آیا تھا اور مسلمانوں میں داخل ہو گیا تھا-

اس نے آہستہ آہستہ مسلمانوں کی کمزوریوں سے واقفیت پیدا کی- پھر اپنی خفیہ جماعت قائم کر لی- یہ شخص آگے چل کر عبداللہ ابن سبا کے نام سے معروف ہوا- تاریخ کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عبداللہ بن سبا کی خفیہ جماعت نے حضرت عثمان غنی کو شہید کیا تھا- اس جماعت نے جنگ جمل اور جنگ صفین میں مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر

ہزاروں آدمیوں کو شہید کرادیا تھا- اس جماعت کا اصل مقصد ہی مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنا تھا- یہ لوگ وقت اور موقعہ کے ساتھ ساتھ اپنے اصول ونعرے بدلتے رہتے تھے- یہ کبھی خارجی کہلاتے کبھی معتزلہ تو کبھی قراعطہ- یہ تمام فتنے اس عبداللہ بن سبا کے پیدا کیے ہوئے تھے-جسر نہرواں پر حضرت ابن خبابؓ ان کی زوجہ اور نوزائیدہ بچے کی شہادت اس جماعت کے سرپھروں کے ہاتھوں ہوئی تھی- یہ اپنے آپ کو خارجی کہتے یا کہے جاتے تھے-

کوفہ میں امیرالمومنین حضرت علیؓ کا دربار خلافت لگا ہوا تھا- حضرت علیؓ نے مدینہ سے کوفہ دارالخلافہ منتقل کرلیا تھا- اس لیے کہ یہ شہر سلطنت اسلامیہ کے وسط میں واقع تھا- دربار میں سناٹا تھا- ہر چہرہ اداس اور نظر پریشان تھی- خود خلیفہ حضرت علیؓ سر جھکائے کچھ سوچ رہے تھے-قبیلہ طے کے دو فریادی دربار خلافت میں دست بستہ حاضر تھے- جناب امیرؓ ان کی فریاد سن چکے تھے اور اب ہر نظر اپنے قائد اپنے خلیفہ پر لگی ہوئی تھی-

حضرت علیؓ نے کسی گہری سوچ اور فکر سے سر اٹھایا اور فرمایا:

''اے فریادیو! کیا تمہیں یقین ہے کہ اسلام کی بیٹیوں کی بے حرمتی اور قتل کے ذمہ دار ہماری فوج سے خارج ہونے والے (خوارج) لوگ تھے؟''

ایک ضعیف العمر شخص جس کے آنسو اب تک رواں تھے' پردرد لہجے میں بولا-

''اے امیرؓ! ہم آپ سے دروغ بیانی کس طرح کرسکتے ہیں- میری دونوں بیٹیوں کو خوارج ہی نے قتل کیا ہے- آپ میرے بیٹے سے دریافت فرماسکتے ہیں-''

یہ کہتے ہوئے بوڑھے نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے جوان کی طرف اشارہ کیا- اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا- اس کے ہاتھ کا اگلا حصہ کہنی تک کٹا ہوا تھا- جوان نے کہا-

''یاامیرالمومنین! جنگ صفین میں میں آپ کے لشکر میں تھا- میرا یہ ہاتھ جنگ میں کٹا ہے- میں نے قاتلوں کو پہچان لیا تھا- آپ کے لشکر کے وہ لوگ ہیں جو آپ سے ناراض ہوکر

صفین سے واپسی کے وقت آپ سے الگ ہو گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان قاتلوں میں بنی رباب کا ''شجنہ'' بھی شامل تھا۔''

اس وقت ایک ادھیڑ عمر شخص اپنی جگہ کھڑا ہوا اور چیخ کر بولا۔

''اے امیر المومنین! یہ جھوٹا ہے۔ میں نے تو کوفہ سے باہر قدم تک نہیں نکالا۔ یہ مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔ امیر کے باغیوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

یہ کہنے والا قبیلہ بنی رباب کا ''شجنہ'' تھا۔ اس نے بڑی دیدہ دلیری سے قبیلہ طے کے دست بریدہ جوان کو جھٹلانے کی کوشش کی حالانکہ یہ شخص خارجیوں کے اس گروہ میں شامل تھا جس نے قبیلہ طے کی عورتوں پر حملہ کیا تھا۔ قبیلہ طے کی عورتیں حسب معمول آبادی کے قریب ایک چشمہ پر پانی لینے گئی تھیں۔ اس وقت خارجیوں کا ایک گروہ ادھر آ نکلا۔ وہ لوگ پانی کی تلاش میں تھے۔ چشمے پر پہنچ کے انہوں نے پانی پینا چاہا۔ ان کی بزرگ صورتیں دیکھ کر خواتین نے انہیں اپنے برتنوں میں پانی پلانے کی کوشش کی مگر ان بزرگ صورت لوگوں نے خواتین کو کافر اور بے دین کہہ کر ان کے برتنوں میں پانی پینے سے انکار کر دیا۔

عورتیں اپنی اس تذلیل کو برداشت نہ کر سکیں اور ان عورتوں اور ان پانی پینے والوں میں جھگڑا ہو گیا۔ یہ خارجیوں کا گروہ تھا۔ اس نے بے گناہ عورتوں پر حملہ کر دیا۔ عورتوں نے پانی کی چھاگلوں سے ان کا مقابلہ کیا مگر ان کے مقابل تلواریں نہیں تھیں۔ آخر اس مقابلے میں کئی عورتیں شہید ہو گئیں اور بہت سی زخمی ہوئیں۔ جب تک ان عورتوں کی مدد کو مرد پہنچے اس وقت تک مرتدین کا یہ گروہ بھاگ کھڑا ہوا۔

حضرت علیؓ کو قبیلہ بنی رباب پر پہلے ہی شبہ تھا۔ انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ یہ قبیلہ (بنی رباب) خوارج سے تعلق رکھتا ہے اور کوفہ میں شجنہ کا مکان ان خارجیوں کا مرکز تھا۔ حضرت علیؓ نے شجنہ سے سختی سے پوچھ گچھ کی مگر انہیں کوئی عینی شہادت نہ مل سکی اس لیے وہ ''شجنہ'' کو

سزا نہ دے سکے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ وہ تیز رفتار ہرکارہ جسے خوارج کا پتہ لگانے پر مامور کیا گیا تھا معہ ایک اونٹنی کے اپنا گھوڑا بھگاتا دربار خلافت میں آ گیا۔ وہ ہرکارہ دربار میں اترا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کس کو پتہ تھا کہ یہ کون شخص ہے اور اس کے رونے کا سبب کیا ہے۔ مگر اس کی آہ و زاری ایسی تھی کہ تمام درباریوں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ بعض تو اس کے ساتھ رونے لگے۔

جب اس کے رونے دھونے میں کمی ہوئی تو جناب امیر نے دریافت کیا۔

''اے کعب! ہمیں بتاؤ تم پر کیا گزری اور تم اس قدر بے قراری سے کیوں رو رہے ہو؟''

کعب اس سوار کا نام تھا جو دربار خلافت میں آیا تھا۔ اس نے گھوڑے کی زین سے لٹکا ہوا ایک خون آلود کپڑا کھینچ کر ہوا میں لہرایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''اے امیر المومنین یہ دیکھیے۔ یہ دوپٹہ صحابی رسولؐ حضرت عبداللہ بن خباب کی زوجہ کا ہے۔ انہیں ظالم خارجیوں نے جسر نہرواں پر بے دردی سے قتل کر دیا۔''

یہ سن کر درباریوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ایک کہرام برپا ہو گیا۔ جناب امیرؓ کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔ تھوڑی دیر یہی عالم رہا پھر جناب امیرؓ نے پوچھا۔

''اے کعب یہ بتاؤ کہ حضرت عبداللہ خبابؓ کہاں ہیں؟''

کعب نے اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''یا امیر المومنینؓ! ظالموں نے انہیں بھی شہید کر دیا۔ میری آنکھوں نے جو منظر جسر نہرواں پر دیکھا ہے اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عبداللہ بن خبابؓ کا سینہ خنجروں سے چھلنی تھا۔ ان کی زوجہ کا پیٹ چاک کیا گیا تھا اور ایک نومولود بچے کی لاش ان کے پاس پڑی

تھی- بچے کے نازک جسم سے تلوار کی نوک آر پار کر دی گئی تھی-

کعب بیان کر رہا تھا اور دربار خلافت میں کہرام مچا ہوا تھا- لوگ اس قدر بے تحاشہ اور زور زور سے رو رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی- ہر شخص شدت غم سے پچھاڑیں کار رہا تھا- دربار میں نوحہء غم کی آوازیں اس قدر بلند ہوئیں کہ راہ چلتے لوگ بھی دربار خلافت میں داخل ہو گئے اور دربار میں مجمع سا لگ گیا- کوفہ کے لوگوں کو جب ابن خبابؓ اور ان کی زوجہ اور بچے کی دردناک موت کا علم ہوا تو ان کی چیخ و پکار اور آہ وزاری سے زمین و آسمان ہل گئے- حضرت ابن خبابؓ کے خاندان والوں کا حال تو دیکھا نہ جاتا تھا- دربار امیر اور شہر میں کئی گھنٹے تک ماتم ہوتا رہا- جناب امیر حضرت علیؓ اس قدر روئے کہ ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی- پھر دربار میں "انتقام- انتقام" کی آوازیں بلند ہوئیں- عام جوانوں کا خون گرم ہو گیا- انہوں نے تلواریں بے نیام کر لیں اور جناب امیرؓ سے درخواست کی کہ انہیں انتقام لینے کی اجازت دی جائے- جناب امیرؓ کو خدشہ پیدا ہوا کہ اگر ان جوانوں کے جوش پر قابو نہ پایا گیا تو یہ کوئی غلط قدم اٹھا سکتے ہیں- سب سے زیادہ خیال اس بات کا تھا کہ خارجیوں کے بہت سے عزیز و اقارب کوفہ میں موجود تھے- ان کی حفاظت جناب امیر پر عائد ہوتی تھی کیونکہ وہ بظاہر بے خطا تھے اور کوفے کے باشندے تھے جن کی حفاظت امیر کوفہ کا فرض تھا-

یہ بات امیرؓ کے ساتھیوں کو بھی شدت سے پریشان کر رہی تھی- چنانچہ قعقاع بن عمرو نے بہت سوچ سمجھ کر کہا- "یا امیر المومنینؓ! میرا خیال ہے کہ اس وقت خارجیوں کے فتنے کو ختم کرنے کی طرف فوراً توجہ دینی چاہیے-

یزید بن قیس نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا-

"یا امیر المومنین! ہم آپس کی لڑائی تو بعد میں بھی لڑ سکتے ہیں لیکن اس وقت خارجیوں

نے جو اودھم مچا رکھا ہے اس کا خاتمہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جناب امیرؓ جواب نہ دینے پائے تھے کہ عدی بن حاتم طائی نے لب کھولے۔ عدی اس قبیلے کا سردار تھا جس کی خواتین کی خوارج نے بے عزتی کی تھی اور کئی ایک کو قتل کر ڈالا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''یا امیر المومنین! اگر ہم ان خوارج کو ختم کیے بغیر آگے روانہ ہو گئے تو ظالم ہمارے گھروں کو لوٹ لیں گے اور عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالیں گے۔ میں امیر المومنینؓ سے درخواست کرتا ہوں کہ پہلے ان مرتدوں کا خاتمہ کیا جائے۔''

ابھی حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے دل صاف نہیں ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی اپنی فوجوں کو از سر نو آراستہ کر لیا تھا۔ مختلف صوبائی امیروں کو فوجیں بھجوانے کا حکم بھی دیا جا چکا تھا۔ کچھ علاقوں کی فوجیں آ بھی چکی تھیں اور یہ سلسلہ جاری تھا مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ صفین کے بعد ان میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جو خونریز جنگ ہوئی تھی اس میں ہر دو طرف کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی شہید ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب مسلمان تھے۔ ان میں بڑے بڑے صحابی تھے۔ چنانچہ اب قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ مسلمان دوبارہ آپس میں ٹکرائیں۔

مگر قبیلہ طے کی خواتین کی بے حرمتی اور شہادتیں اور اب صحابی رسولؐ حضرت عبداللہ بن خبابؓ اور ان کی بیوی اور بچے کا بیہمانہ قتل ایسا نہ تھا کہ جناب امیر اسے نظر انداز کر دیتے۔ چنانچہ ان کا دل بھی دوسروں کی طرح خون کے آنسو رو رہا تھا بلکہ ان کو تو دوسروں کے بہ نسبت زیادہ رنج تھا کیونکہ وہ مسلمانوں کے خلیفہ تھے اور رعیت کے جان و مال کی حفاظت ان کا فرض تھا۔

امیر المومنین حضرت علیؓ نے کئی گھنٹے بڑے کرب میں گزارے تھے۔ لوگوں کی گریہ و

زاری قبیلہ طے کی خواتین کی شہادت' صحابی رسولؐ اوران کے اہل وعیال کی بربادی اوراب ان کے رفقاء کی درخواست- یہ تمام باتیں ایسی تھیں جس نے جناب امیر کو بہت متاثر کیا- لوگ منتظر تھے کہ امیر المومنین اپنی زبان مبارک سے کچھ ارشاد فرمائیں تا کہ ان کے دلوں کو تسکین ہو' ظالموں کو سزا ملے اور مظلوموں کی دادرسی ہو-

پس جناب علی مرتضیٰؓ نے بھی بڑے غوروخوض کے بعد فرمایا-

''اے مظلوم مسلمانو! تم نے مجھے خلیفہ بنایا تا کہ میں مسلمانوں کی حفاظت کروں اور دین اسلام کو دنیا میں پھیلاؤں-تم نے مجھے خلیفہ بنایا کہ میں مظلوم کو ظالموں کے ہاتھ سے چھٹکارہ دلاؤں-تم نے مجھے امیر بنایا کہ میری اور لشکر اسلام کی تلواریں ان ظالموں کا قلع قمع کریں جو امن سے انحراف کرتے ہیں- پس میرا فرض ہے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کروں- رعیت کی جان و مال اور عزت وآبرو پر حرف نہ آنے دوں- میرے رفقاء کی بھی یہی رائے ہے- میں مظلوموں کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ میں نے تم سب کے مشورے سے ملک شام کی مہم ملتوی کی- کیونکہ اس وقت شام کی مہم سے پہلے خوارج کا خاتمہ ضروری ہے- اس فتنے کا سر اگر فوراً نہ کچلا گیا تو دین اسلام اور مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا- اب تمہیں جو کہنا تھا تم نے کہہ دیا اور جو مجھے کہنا تھا میں نے بیان کر دیا- اب اپنے اپنے گھروں کو جاؤ اور خدا سے دعا کرو کہ وہ لشکر اسلام کو ان ناسمجھ بے دینوں کے مقابلے میں کامیاب کرے-''

حضرت علیؓ کے اس خطبے اور اعلان سے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ اپنے اپنے گھروں کو خاموشی سے واپس چلے گئے- جب حضرت علیؓ کے خاص خاص رفقاء وہاں رہ گئے تو جناب امیر نے کعب کو اپنے پاس بلایا جسے جانے سے پہلے ہی روک لیا گیا تھا-

کعبؓ حضرت امیر کے پاس آ کر ادب سے بیٹھ گیا- یہ دربار خلافت تھا مگر نہ تخت و

تاج' نہ شاہانہ ساز و سامان- بس ایک معمولی سی دری کا فرش تھا- اس پر امیر کیا اور فقیر کیا- سب ساتھ ساتھ بیٹھے تھے- باہر سے آنے والا اگر ناواقف ہو تو وہ خلیفہ کو پہچان ہی نہیں سکتا تھا-

جناب امیرؓ نے کعب سے دریافت فرمایا-

''اے کعب! یہ واقعہ کہاں اور کب پیش آیا؟''

کعب نے ادب سے جواب دیا-

''علاقہ جسر نہرواں میں اے امیرؓ- حضرت عبداللہ بن خبابؓ کو نہر کے کنارے شہید کیا گیا اور ان کی زوجہ اور پیدا ہونے والے بچے کی لاشیں نہر سے کچھ فاصلے پر پتھروں اور جھاڑیوں میں پڑی تھیں-

''تم نے ان لاشوں کا کیا کیا؟'' جناب امیرؓ نے بے چینی سے پوچھا-

کعب سمجھ گیا کہ جناب امیرؓ کو لاشوں کی بے حرمتی کا خیال پریشان کر رہا ہے- اس نے جواب دیا-

''امیر المومنین! میں مسلمان ہوں- لاشوں کی بے حرمتی کیسے ہونے دیتا- میں نے تینوں لاشوں کو پتھروں اور جھاڑیوں میں دفن کر دیا-''

جناب امیر نے ایک لمبا سانس لیا جیسے ان کے دل کو اطمینان ہو گیا ہو- پھر انہوں نے کعب سے پوچھا-

''کیا تم خارجیوں سے ملے تھے- ان کی تعداد کتنی تھی؟''

کعب نے سوچتے ہوئے کہا-

''ان کی تعداد کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے- میں نے ان سے ملنے کی کوشش نہیں کی- پہلے میں نے سوچا کہ ان سے مل کے اس قتل کا سبب پوچھوں پھر مجھے خیال آیا کہ اگر میں

بھی ان کے ہاتھوں مارا گیا تو دربار خلافت تک خبر کون لے کر جائے گا۔ اس لیے میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔

''تم نے اچھا ہی کیا۔'' جناب امیر بولے۔ ''اچھا تمہیں یہ کیسے اندازہ ہوا کہ وہ خارجی ہیں؟''

''یا امیر المومنین!'' کعب نے بتانا شروع کیا۔ ''میں نے حد نظر تک خیمے ہی خیمے دیکھے۔ اندر شمعیں روشن تھیں اور باہر الاؤ جل رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ خیموں کے قریب پہنچا۔ وہاں سے میں نے شعت بن روسی اور محزر بن خبس کو خیموں کے باہر ٹہلتے دیکھا۔''

''تم نے صحیح اندازہ لگایا۔'' حضرت علی نے کچھ سوچتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ دونوں اس گروہ میں شامل ہوئے تھے جو ہمارے لشکر سے الگ ہو گیا تھا۔''

حضرت علی کے رفقاء بہت غور سے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ جب یہ خاموش ہوئے تو قعقاع بن عمرو بولے۔ ''یا امیر المومنین! یہ لوگ کس قدر خودسر ہو گئے ہیں۔ انہوں نے صحابیؓ رسول کو شہید کر دیا۔ انہیں کوئی خوف نہیں آیا۔''

''قعقاع'' حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ''یہ لوگ دین اور انسانیت کے دشمن ہیں۔'' اب ان کا سر کچلنا ہمارا فرض ہے۔''

شجنہ قبیلہء بنی رباب کا ایک اہم سردار تھا۔ جنگ صفین کے بعد جب خارجیوں کا گروہ پیدا ہوا تو شجنہ اس میں شامل ہو گیا۔ اس کے بیٹے اور بیٹی نے بھی خارجی عقیدہ اختیار کر لیا۔ شجنہ کی جوان بیٹی قطامہ اپنے حسن و جمال میں بے مثال تھی۔ کوفہ اور اطراف کوفہ کے کتنے ہی جوان اس کے خواہشمند تھے لیکن یہ مغرور حسینہ کسی کو منہ نہ لگاتی تھی۔ بڑے بڑے رئیس زادوں کے پیغام اس نے ٹھکرا دیے تھے۔ اسے اپنے حسن پر بجا طور پر ناز اور غرور تھا کیونکہ اس جیسی خوبصورت دوشیزہ پورے کوفہ میں کوئی دوسری نہ تھی۔

قطامہ کی اہمیت اس وقت اور بڑھ گئی جب اس کے باپ شجنہ کو سبائیوں کی خفیہ تنظیم کا کوفہ سے ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ عبداللہ بن سبا نے حضرت علی کے خلاف کوئی تنظیم قائم کی ہے تو وہ فوراً مصر گیا اور اس نے عبداللہ بن سبا سے ملاقات کی۔ ابن سبا بھی ایک بار خفیہ طور پر کوفہ آیا تھا۔ اس نے کئی دن تک پوشیدہ طور پر شجنہ کے مکان پر قیام کیا تھا۔ اس قیام کے دوران ابن سبا نے اپنی تنظیم کی ایک شاخ کوفہ میں قائم کی اور شجنہ کو اس کا ناظم بنا دیا۔

ابن سبا نے قطامہ کو دیکھا تو اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ابن سبا یمن کا رہنے والا تھا۔ ہر چند کہ یمن کی عورتیں بہت خوبصورت ہوتی ہیں لیکن قطامہ کو دیکھ کر وہ یمن کی عورتوں کے حسن کو بھول گیا۔ اس نے قطامہ سے گفتگو کی تو اس پر راز کھلا کہ قطامہ اپنے حسن کے علاوہ ذہانت و فطانت کے زیور سے بھی آراستہ ہے۔ پس اس کی دلچسپی قطامہ میں اور بڑھ گئی۔ ابن سبا اس تنظیم کا امام تھا اگر ابن سبا' قطامہ کے حصول کی کوشش کرتا تو اسے ناکامی نہ ہوتی۔ قطامہ خود چاہتی تھی کہ اس کا جیون ساتھی کوئی ایسا ہو جس کا دنیا میں نام ہو اور اس کے حسن کی قدر کر سکے۔ لیکن ابن سبا بڑا مکار اور دور اندیش تھا۔ اس نے قطامہ کے باپ کے سامنے قطامہ کی خوب خوب تعریف کی۔ پھر اس کی زبان سے اک دم نکلا۔

''یہ لڑکی دنیا میں کوئی ایسا کام کرے گی جس سے دنیا میں اس کا نام رہے گا۔''

پتہ نہیں ابن سبا نے کیا سوچ کر یہ کہا تھا۔ اس کے ذہن میں یقیناً کوئی بات تھی۔

اس گفتگو کے بعد ابن سبا چلا گیا اور قطامہ کچھ مایوس سی ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ ابن سبا اسے پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرے گا لیکن ابن سبا نے اسے مایوس کیا۔ ابن سبا وہ پہلا آدمی تھا جس نے قطامہ سے مل کر بھی اس کی خواہش نہ کی۔ قطامہ کو مایوسی تو ہوئی لیکن ابن سبا کے اس رویہ سے قطامہ کے دل میں ابن سبا کی اور زیادہ عزت و وقعت بڑھ گئی۔ اس نے

سوچا۔

''ابن سبا واقعی امام ہے۔ اس مایوسی کے باوجود قطامہ نے سوچا کہ ابن سبا کا یہ کہنا کہ اس کے ہاتھ سے کوئی ایسا کام ضرور ہوگا جو تاریخ میں درج ہو کر قیامت تک زندہ رہے گا۔ وہ کام کیا ہوسکتا تھا۔ قطامہ اس بارے میں صرف سوچ ہی سکتی تھی۔''

حضرت علیؓ کے اس فیصلے سے کہ وہ پہلے خارجیوں کا خاتمہ کریں گے اس کے بعد شام جائیں گے' شجنہ کو بہت دکھ ہوا۔ ابن سبا کا پیروکار اور خارجیوں کی کوفہ کی تنظیم کا ناظم شجنہ تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ حضرت علیؓ شام جا کر امیر معاویہؓ سے جنگ کریں تا کہ خارجی اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیں لیکن اس فیصلے سے شجنہ کے ارادوں پر اوس پڑ گئی۔

شجنہ گھر آیا تو اداس اداس تھا۔ قطامہ نے باپ کو اداس دیکھا تو پوچھا۔

''آپ کو کیا ہوا ابا جان! آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟''

شجنہ نے چاہا کہ وہ ٹال جائے لیکن اسے قطامہ سے بہت محبت تھی۔ اپنے بیٹے سے بھی زیادہ۔ پس وہ بات کو ٹال نہ سکا اور افسردگی سے بولا۔

''قطامہ بیٹی! میری فکرمندی کی دو وجوہات ہیں۔ ایک بات تو یہ کہ بھرے دربار میں قبیلہ طے کے دو آدمیوں نے مجھے قبیلے کی عورتوں کا قاتل ٹھہرایا۔''

قطامہ گھبرا گئی۔ اس نے فوراً پوچھا۔

''پھر آپ کیسے بچ گئے۔ علی کے پرستار تو آپ کے خون کے پیاسے ہو گئے ہوں گے۔'' (خیال رہے کہ خارجی حضرت علی کا نام بغیر کسی القاب کے لیا کرتے تھے)

چنانچہ شجنہ نے جواب دیا۔

''بس قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا۔ اگر آج میں دربار میں نہ ہوتا تو عورتوں کے قتل کے الزام میں مجھے قتل کر دیا جاتا لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح دربار میں میری

حاضری میرے کام آئی- الزام لگانے والوں کی بات کا کسی پر اثر نہ ہوا- حالانکہ جب میں عورتوں کو قتل کر کے فرار ہوا تو میرا سامنا انہی دو آدمیوں سے ہوا تھا- انہوں نے مجھے اچھی طرح پہچان لیا تھا-''

قطامہ نے اطمینان کا سانس لیا- پھر پوچھا-

''اور آپ کی اداسی کی دوسری وجہ کیا تھی؟''

''دوسری وجہ یہ ہے کہ علی کا لشکر اب شام جا کر معاویہ سے لڑنے کے بجائے ہم خارجیوں سے مقابلے کے لیے تیار ہو رہا ہے-'' شجنہ نے بیٹی کو تفصیل بتاتے ہوئے کہا- ''ایک سوار نے دربار میں آ کر بتایا کہ صحابی رسول عبداللہ بن خباب' ان کی بیوی اور نومولود بچے کو ہمارے ساتھیوں نے قتل کر دیا ہے-''

''لیکن ابا جان! معصوم بچے نے کیا کیا تھا؟'' قطامہ نے الجھتے ہوئے کہا- ''ہمارا مقصد تو بے دین مسلمانوں کو تباہ کرنا ہے-'' شجنہ نے زہر خند لہجے میں کہا-

''بیٹی قطامہ! مجھے تیری عقل پر افسوس ہوتا ہے- امام عبداللہ بن سبا نے تو تیرے متعلق پیشین گوئی کی ہے کہ تیرا نام تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا اور تیری نالائقی کی یہ کیفیت ہے کہ تو یہ نہیں جانتی کہ سانپ کا بچہ بھی سانپ ہی ہوا کرتا ہے- معاویہ اور علی دونوں ہم جیسے مسلمانوں کے لیے سانپ ہیں- ان کے ہمدرد اور پیروکار بھی سانپ ہیں- ہمیں ان کی پوری نسل کو ختم کرنا ہے- عورتوں اور بچوں سے نسل بڑھتی ہے پھر انہیں کیوں زندہ چھوڑا جائے-''

قطامہ کی سمجھ میں بات کچھ اس طرح آئی کہ انسانی ہمدردی کی جو کرن اس کے ذہن میں تھی وہ بھی ختم ہو گئی- اس نے کہا-

''لاریب ابا جان! آپ نے درست فرمایا- ان سب کا خاتمہ ہمارے دین کے لیے

لازمی اور ضروری ہے۔''

شجنہ نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

''قطامہ تم خود کو اس کام کے لیے تیار کرو جو تم سے لیا جانا ہے۔ اپنے حوصلے بلند کرو اور اپنے دین کی سر بلندی کے لیے مردانہ وار جدوجہد کرو۔''

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہے پھر شجنہ نے کہا۔

''میں اس وقت جسر نہرواں جا رہا ہوں تا کہ اپنے امام عبداللہ بن سبا الکوار کو آنے والے خطرے سے آگاہ کروں۔ علی کا لشکر ایک روز میں ادھر جانے والا ہے۔''

قطامہ کو گھبراہٹ ہوئی تو اس نے پوچھا۔

''ابا جان! کیا آپ کو یقین ہے کہ جسر نہرواں میں میدان کارزار گرم ہوگا؟

''کیوں نہیں بیٹی!'' شجنہ بولا۔ دعا کر کہ تیرے باپ کو شہادت نصیب ہو اور خیال رہے کہ اگر میں مارا جاؤں تو گھر میں چوڑیاں پہن کر نہ بیٹھنا بلکہ امام ابن سبا سے مل کر فرقہ خوارج کے لیے کام کرنا۔ میری روح اس سے خوش ہوگی۔'' قطامہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ شاید یہ باپ سے آخری ملاقات ہے۔ قطامہ نے باپ کے سامنے کھانا لا کے رکھا۔ دوسرے آنے والے دو سبائی بھی اس میں شریک ہوئے۔ یہ گھر سبائیوں کا خفیہ اڈہ تھا۔ یہاں بڑی بڑی سازشیں تیار ہوتیں اور مسلمانوں کے سروں کے فیصلے کیے جاتے۔

شجنہ نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ بظاہر وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھا مگر جانتا تھا کہ اگر جسر نہرواں میں علی کی ذوالفقار بلند ہوگئی تو خارجیوں کو جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔ پس وہ کھانا چھوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ تلوار لگائی ترکش کاندھے پر لٹکایا اور گھوڑے پر سوار ہو کے جسر نہرواں کی طرف چل پڑا۔

قطامہ باپ کو دروازے تک رخصت کر کے واپس آ گئی اور مہمانوں کی خاطر مدارات پر لگ گئی- اس کے یہاں آنے والے مہمان عام طور سے سبائی یا خارجی ہوتے لیکن ان میں زیادہ تعداد ان جوانوں کی ہوتی تھی جو قطامہ کے حسن جہاں تاب سے آنکھیں سینکنے کے متمنی ہوتے تھے- اس طرح قطامہ کے گھر روز ایک دو نئے مہمان آتے رہتے- قطامہ بھی ان سے بے تکلفی اور بے باکی سے گفتگو کرتی اور جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ اسے دنیا میں کوئی اہم کام کرنا ہے اس وقت سے وہ جواں عمر سبائیوں اور خارجیوں سے زیادہ التفات سے پیش آنے لگی تھی کیونکہ کوئی پتہ نہیں تھا کہ اسے کس وقت جوانوں کی مدد کی ضرورت پڑ جائے-

قطامہ کے اس مصلحت آمیز رویے سے آنے والے ہر جوان کو یہ غلط فہمی ہو جاتی تھی کہ قطامہ اسے پسند کرتی ہے- اس سے آنے والے نوجوانوں کی شوخیاں اکثر حد اعتدال سے بڑھ جاتیں مگر قطامہ چہرے پر شکن آنے نہ دیتی- کیونکہ اسے ہر وقت اپنے مستقبل کی فکر رہتی تھی-

شبیبؔ اور وردانؔ- یہ دو خارجی قطامہ کے پرانے عاشق تھے- یہ رہنے والے تو اطراف کوفہ کے تھے لیکن تقدیر آزمائی کے لیے مصر گئے اور عبداللہ بن سبا کی سبائی تنظیم میں شامل ہو کر کئی علمائے اسلام کو قتل کر چکے تھے- اس لیے انہیں ابن سبا کا اعتماد حاصل ہو گیا تھا- اب یہاں جب جنگ صفین کے بعد خارجیوں نے زور پکڑا تو ابن سبا کے حکم پر یہ کوفہ آئے اور قطامہ کے مہمان ہوئے- ان دونوں کو ابن سبا نے اپنے جاسوسوں کے طور پر بھیجا تھا تاکہ وہ خارجیوں کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر کے مصر پہنچائیں- کیونکہ ابن سبا یہودی کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک کی پشت پناہی کرتا اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں زیادہ مضبوط بناتا- شبیب اور وردان نے قطامہ کو دو سال بعد دیکھا تھا- بچپن میں وہ ایک معصوم کلی تھی اور وہ کھلنے کے لیے ایک بے تاب غنچہ تھی- چنانچہ یہ دونوں

جاسوسی چھوڑ کر قطامہ کے عشق میں گرفتار ہو گئے- قطامہ یوں تو ہر نووارد جوان سے التفات کے ساتھ پیش آتی لیکن ان دونوں پر وہ اس لیے زیادہ مہربان تھی کہ وہ مصر سے آئے تھے اور ابن سبا کے خاص احباب میں سے تھے- قطامہ ان دونوں سے گھنٹوں مصر اور ابن سبا کے حالات سنتی اور یہ دونوں مزے لے لے کے بیان کرتے تھے- قطامہ کے گھر کوئی مہمان ایک دو روز سے زیادہ نہ ٹھہرتا مگر ان دونوں کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور یہ جانے کا نام نہ لیتے تھے- شجنہ خارجیوں کا ایک اہم رکن تھا- وہ تمام دن اور رات کے بیشتر حصے میں گھر سے باہر رہتا- اس کا بھائی تو خارجیوں کا ایسا شیدائی تھا کہ اس نے گھر آنا بھی چھوڑ دیا تھا- اس وقت بھی وہ جسر نہرواں خارجیوں کے ساتھ خیموں میں مقیم تھا-

ان حالات میں قطامہ گھر میں اکیلی رہتی تھی- اس کی ماں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا- گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ مہمانوں میں آ بیٹھتی- اس طرح خالی اوقات میں بڑی دلچسپ محفلیں جمتیں- ہنسی مذاق' لطیفہ گوئی' چھیڑ چھاڑ' سبھی کچھ ہوتا تھا- قطامہ اس قسم کی بے ہودگیوں کی عادی ہو چکی تھی بلکہ اب تو وہ خود جوانوں کو شہ دیتی تھی- وہ جوانی کے اس دور میں تھی جب لڑکیوں کی خواہش ہوتی ہے کہ انہیں چھیڑا جائے اور ان کی تعریف کی جائے- قطامہ تھی بھی تعریف کے قابل-

شجنہ کے باہر جانے کے بعد حسب معمول محفل گرم ہوئی لیکن خلاف معمول آج قطامہ کچھ بجھی سی تھی- شبیب نے اسے خاموش خاموش دیکھا تو چھیڑا-

''یہ آج چاند پر گرہن کیسا؟ خیریت تو ہے؟''

قطامہ نے اپنی بھاری سیاہ پلکوں کو جنبش دی اور ٹھنڈا سانس بھر کے بولی-

''شبیب ہماری زندگیوں کا مقصد محض ہنسی مذاق تو نہیں- ہمارا فرقہ ہم سے کچھ اور امیدیں بھی رکھتا ہے-''

باپ بیٹی میں جو گفتگو ہوئی تھی اس سے یہ دونوں بے خبر تھے- انہوں نے ایک ہفتہ سے گھر سے قدم نہ نکالا تھا پھر انہیں حالات کا کیسے علم ہوتا-

شبیب بن نجدہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے پوچھا-

''قطامہ ہم تمہیں افسردہ نہیں دیکھ سکتے- اگر تمہیں کوئی خاص پریشانی ہے تو ہمیں بتاؤ''

قطامہ نے شاطرانہ انداز اختیار کیا اور بولی-

''شبیب تم خود کو عبداللہ بن سبا کا پیروکار کہتے ہو اور تمہیں ان کی مصاحبت کا فخر بھی حاصل ہے- میں اور میرا باپ خود بھی ابن سبا کے معتقد ہیں- تم سبائیوں اور ہم خارجیوں کا مقصد ایک ہی ہے کہ جھوٹے مسلمانوں کو ختم کیا جائے اور سچے مسلمانوں یعنی ہمارے ہاتھوں میں اقتدار آئے-''

اتنا کہہ کر قطامہ خاموش ہوگئی اور دونوں کے چہروں پر اپنی بات کا ردعمل دیکھنے لگی-

وردان جواب تک خاموش تھا اس نے زبان کھولی-

''لیکن ان باتوں کے بیان سے تمہارا مقصد کیا ہے؟ ہم نے خارجیوں کی کب مخالفت کی ہے- ہم کو اسی لیے بھیجا گیا ہے کہ خارجیوں کی اہم باتوں کا پتہ لگائیں اور پھر فیصلہ کریں کہ ہم ان کی کس طرح مدد کر سکتے ہیں-''

قطامہ نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا-

''وردان خارجیوں کی اہم باتوں کا پتہ گھر میں بیٹھ کر نہیں لگایا جا سکتا- تمہیں کیا علم کہ جسر نہرواں پر کیا ہونے والا ہے- تم تو یہاں بیٹھ کر میری باتوں سے دل بہلاتے ہو اور میں مہمان نوازی سے مجبور ہو کر تمہاری خاطر مدارات کرتی ہوں-''

اب تو ان دونوں کے کان کھڑے ہوئے- چنانچہ شبیب نے بے چینی سے پوچھا-

''جسر نہرواں پر کیا ہونے والا ہے قطامہ- ہمیں بھی صاف صاف بتاؤ-''

قطامہ نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔

''جسر نہرواں پر علی اور ہمارے امام عبداللہ بن الکوار کے درمیان میدان کارزار ہوگا۔ ایک طرف بے دین مسلمان اور دوسری طرف خارجی مسلمانوں کا لشکر ہوگا اور ایک دو دنوں میں فیصلہ ہوگا کہ سچا کون ہے۔ میرا باپ اس جنگ میں شہادت کی آرزو لے کر گیا ہے۔ میرا بھائی ابن الکوار کا مصاحب خاص ہے۔ اس نے چار ماہ سے گھر کی صورت نہیں دیکھی۔''

وردان کچھ سوچ کے بولا۔

''لیکن اس میں فکر کی کیا بات ہے؟'' تمہارے باپ اور بھائی جنگ میں شریک ہیں۔ تم نے تو سچے دین کا فرض ادا کر دیا۔''

قطامہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے بگڑ کر کہا۔

''ارے وردان! دین کا حق ہر ایک پر ہوتا ہے۔ اگر تم لوگ مہمان نہ ہوتے تو میں بھی اس جنگ میں شریک ہو کر شہادت کا مرتبہ حاصل کرتی۔''

یہ سن کر شبیب بن نجدہ اور وردان کو پسینے چھوٹ گئے۔ وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ قطامہ کی گرجدار آواز پھر بلند ہوئی۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا۔

''شبیب بن نجدہ اور وردان کان کھول کر سن لو۔ تم لوگوں کے ساتھ ہنسنا بولنا اور تمہاری بے جا شوخیوں اور شرارتوں کو نظر انداز کر دینا میری مہمان نوازی کا ایک فریضہ ہے لیکن قطامہ اتنی ست نہیں۔ قطامہ تک صرف وہی پہنچ سکے گا جس کے پنجوں میں شیر کی فولادی طاقت ہوگی اور جو خون کے دریا میں تیرنا جانتا ہوگا۔ قطامہ کو بزدلوں سے شدید نفرت ہے۔''

قطامہ کی کھری کھری باتوں سے رنگ محفل بگڑ گیا۔ شبیب بن نجدہ اور وردان کے چہرے فق ہو گئے اور ان پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو کنکھیوں کے ذریعہ کچھ پیغام دیا۔ قطامہ نہایت خاموشی مگر ہوشیاری سے ان کے اشارے دیکھ اور سمجھ رہی

تھی۔

پھر شبیب ایک عزم کے ساتھ اٹھا اور بولا۔

''قطامہ ہم تمہارے خیالات کی قدر کرتے ہیں۔ تم واقعی ایک بہادر لڑکی ہو اور تمہیں صرف بہادروں ہی سے محبت کرنی چاہیے۔ اب تم ہمیں اجازت دو تا کہ ہم جسر نہرواں کی جنگ میں شریک ہو کر تمہارے لگائے ہوئے بزدلی کے الزام کو دھونے کی کوشش کریں۔''

پر جب شبیب بن نجد اور وردان ہتھیار لگا کر اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جسر نہرواں کی طرف روانہ ہوئے تو قطامہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے سوچا ان سے کم از کم پیچھا تو چھوٹا۔ اگر یہ دونوں جسر نہرواں کی جنگ میں مارے گئے تو مجھے دو بزدلوں کی صحبت سے نجات ملے گی اور اگر یہ فاتح ہو کر آئے تو میں ان شیدائیوں سے کوئی اور مفید کام لوں گی۔

خارجی جو اپنے آپ کو سچا مسلمان کہتے تھے۔ انہوں نے جب حضرت علی کا لشکر چھوڑ دیا تو وہ خارجی مشہور ہوئے۔ پھر وہ خود کو بھی خارجی کہنے لگے اور اس پر فخر کرنے لگے۔ خارجی لشکر امیر کو چھوڑ کر کوفہ سے نکلے تو انہوں نے جسر نہرواں کو اپنا مستقر بنایا اور پھر مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ وہ کہتے تو یہ تھے کہ ہم سنت رسولؐ کی اشاعت کر رہے ہیں مگر ان کا اصل مقصد مسلمانوں کو مٹانا تھا۔

جب جسر نہرواں پر عبداللہ بن خبابؓ اور ان کی بیوی بچوں کے قتل کا واقعہ پیش آیا تو ان میں آپس میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا۔ جو مسلمانوں کے جانی دشمن تھے انہوں نے تو اس تہرے قتل کو سراہا لیکن جن کے ذرا سی بھی عقل تھی وہ اس قتل کو ایک بدشگونی تصور کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ صحابی رسول کے قتل کی خبر کوفہ کے مسلمانوں میں آگ لگا دے گی اور ممکن ہے کہ لشکر اسلام ان کی سرکوبی کے لیے چل پڑے۔ اس مسئلے پر ان میں آپس میں کافی تو تو میں میں اور لے دے بھی ہوئی۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ صحابی رسول کی لاش کو ایسی جگہ پوشیدہ کر دیا جائے

کہ کوئی نہ دیکھ سکے اور یہ قتل دب کر رہ جائے- پس جب لاشیں تلاش کرنے کے باوجود دستیاب نہ ہوئیں تو لوگ پریشان ہوئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب یہ خبر کوفہ تک ضرور پہنچے گی اور حضرت علیؓ جنگ کے لیے ادھر کا رخ کریں گے- دوسرے دن رات کو شجنہ نے جسر نہرواں پہنچ کر ان کے اس خیال کی تصدیق کر دی- دربارِ خلافت میں جو کچھ پیش آیا تھا شجنہ نے الف سے ی تک سب کچھ ان لوگوں کے سامنے دہرا دیا- خارجی اس خبر سے بہت خوفزدہ ہوئے-

عبداللہ بن الکوار خارجیوں کا امام تھا اور شعت بن راسبی امیر اور سالار فوج' یہ دونوں قتل عبداللہ بن خبابؓ میں ملوث تھے- انہوں نے اپنی غلطی تسلیم نہ کی اور سب کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرا دیا لیکن دل میں وہ بھی خائف تھے کیونکہ ان کے اس فعل سے مسلمانوں اور مرتدوں کے درمیان جنگ کے زیادہ امکانات پیدا ہو گئے تھے- سالار فوج شعت نے فوراً بصرہ ملائن اور انبار کو تیز رفتار قاصد روانہ کیے کہ ان کے ہم خیال لوگ فوراً نہرواں پہنچ کر لشکر میں شریک ہو جائیں- خارجیوں کی خوش قسمتی کہیے کہ ان مقامات کے خارجی پہلے ہی سے روانہ ہو چکے تھے کیونکہ مسلمانوں نے ان لوگوں کا اخلاقی بائیکاٹ کر دیا تھا جن پر انہیں خارجی ہونے کا شبہ تھا-

اس طرح جسر نہرواں میں حضرت علیؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی خارجیوں کا بارہ ہزار سے زیادہ کا لشکر مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا- حضرت علیؓ بہت صلح کن واقع ہوئے تھے- ان کی اب بھی یہی کوشش تھی کہ اگر خارجی گمراہی چھوڑ کر پھر دائرۂ اسلام میں واپس آ جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہو گا- پس جب حضرت علیؓ نہرواں کے قریب پہنچے تو انہوں نے اپنے لشکر کو خارجیوں سے ایک فرسنگ دور قیام کا حکم دیا- پھر انہوں نے لشکر اسلام میں سے قیس بن سعد بن عبادہؓ اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کو خارجیوں کے پاس بھیجا کہ انہیں سمجھا بجھا کر

راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں مگر ان دونوں بزرگوں کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ خارجیوں نے ان کی بات پر کان نہیں دھرے اور انہیں ذلیل کر کے واپس بھیج دیا۔ جناب علیؓ نے پھر بھی اتمام حجت کے لیے شعت بن راسبی کو پیغام بھیجا۔

''اے راسبی! تمہاری جماعت کے جن لوگوں نے عبداللہ بن خبابؓ کو ہلاک کیا ہے انہیں ہمارے حوالے کردو۔ ہم صرف ان کے قاتلوں کو اپنے بھائیوں کے قصاص میں قتل کر دیں گے اور تمہیں فی الحال تمہارے حال پر چھوڑ دیں گے کہ ممکن ہے خدا تمہارے دلوں کو پھیر دے اور تم دوبارہ ہدایت قبول کرلو۔''

اس مصالحانہ پیغام کا جواب دینے کے لیے خارجیوں نے شجنہ کو حضرت علیؓ کے پاس بھیجا۔ شجنہ لشکر اسلام میں پہنچ کر حضرت علی سے نہایت گستاخانہ انداز میں بولا۔

''ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم سب نے تمہارے بھائیوں کو قتل کیا ہے اور ہم سب تمہارے اور تمہارے ہم عقیدہ لوگوں کے خون کو جائز سمجھتے ہیں۔''

شجنہ کا یہ غرور اور ہتک آمیز جواز کھلا اعلان جنگ تھا۔ حضرت علیؓ کے لیے اب سوائے جنگ کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ چنانچہ شجنہ کے جاتے ہی حضرت علیؓ نے جنگی طریقہ سے لشکر کو ترتیب دیا۔ حضرت علیؓ کی اب بھی یہی کوشش تھی کہ جنگ سے گریز کیا جائے اور خارجی راہِ راست پر آ جائیں مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہے۔

پھر بھی حضرت علیؓ نے آخری کوشش کے طور پر حضرت ابوایوب انصاریؓ کو سفید پرچم دے کر میدان میں بھیجا اور اعلان کرایا کہ جو اس جھنڈے کے نیچے پناہ لے گا یا میدان چھوڑ کر کوفہ یا مدائن چلا جائے گا اسے کچھ نہ کہا جائے گا۔

اس اعلان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ایک خارجی سردار فروہ بن نوفل اپنے پانچ سو سواروں

کے ساتھ خارجیوں کو چھوڑ کر میدان جنگ سے نکل گیا- کچھ لوگوں نے کوفہ کا رخ کیا اور کچھ کو اللہ نے توفیق دی اور حضرت علیؓ کے لشکر میں آ گئے- شجنہ اور اس کے بیٹے کی خارجیوں میں کوئی وقعت نہ تھی- وہ سردار بھی نہیں تھے لیکن اس موقعہ پر وہ امام نماز عبداللہ بن الکوار اور سردار خوارج شعت بن راسبی سے دو قدم آگے تھے- شجنہ کے بیٹے نے طیش میں آ کر تیر کمان سنبھالی اور صلح کے جھنڈے کو نشانہ بنایا- اس کی کمان سے تیر نکلا اور لہراتے ہوئے جھنڈے کو چھیدتا ہوا دوسری طرف نکل گیا- شجنہ کو شاید اپنے بیٹے کی یہ ادا پسند آئی- اس نے بھی اپنا ترکش سنبھالا اور اس کا تیر بھی جھنڈے کے آر پار ہو گیا-

حضرت علیؓ کو لشکر اسلام کے پرچم کی توہین برداشت نہ کر سکے- آپ نے گھوڑا بڑھایا اور ذوالفقار حیدری کو جنبش دیتے ہوئے شجنہ کے سر پر پہنچ گئے- شجنہ مقابلے کے لیے تیار تھا- اس نے تلوار کا وار تلوار پر روکنا چاہا مگر ذوالفقار کے وار کو کون روک سکتا تھا- پس شجنہ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور ذوالفقار حیدری شجنہ کا سینہ چیرتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی- شجنہ کی چیخ بھی نہ نکل سکی اور وہ گھوڑے کی زین سے لٹک گیا- باپ کا یہ حال دیکھ کر بیٹا بڑھ کر آیا اس نے وار کیا- حضرت علیؓ کا گھوڑا اچمک کر تلوار کی زد سے نکل گیا اور اس کا وار خالی گیا- اسے دوسرا وار کرنے کی مہلت نہ ملی اور ذوالفقار علی اس کے دل سے گزر کر اس کی پیٹھ کے پار ہو گئی- اس طرح باپ بیٹے دونوں کا ایک سا حال ہوا- پھر حضرت علیؓ نے خارجیوں کے سرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا-

اب عام جنگ شروع ہو گئی تھی اور میدان میں تلواروں کی چمک سے کوندے لپک رہے تھے- خارجیوں نے پہلے تو خوب بڑھ بڑھ کے حملے کیے مگر زیادہ دیر تک میدان میں ٹھہر نہ سکے اور ان کے قدم اکھڑ گئے-

شبیب بن نجدہ اور وردان بھی اس جنگ میں خارجیوں کی طرف سے لڑ رہے تھے-

انہوں نے جب دیکھا کہ خارجیوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں تو وہ بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان لوگوں نے بڑی مشکل سے جان بچائی کیونکہ حضرت علیؓ کی فوج نے انہیں گھیرے میں لے کر قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔

لڑائی ختم ہوئی تو میدان جنگ میں چاروں طرف خارجیوں کی لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ چار سو خارجی گرفتار ہوئے۔ یہ تمام کے تمام زخمی تھے۔ حضرت علیؓ نے مہربانی فرما کر زخمیوں کے علاج کے لیے ان کے عزیزوں کے سپرد کر دیا۔ آپ نے میدان سے لاشیں اٹھانے کی بھی اجازت دے دی۔ مقتولین کے ہتھیار اور گھوڑے اپنے لشکریوں میں تقسیم کر دیے اور دوسرا سامان ان کے عزیزوں کو دے دیا گیا۔

شبیب اور وردان دور جا کر چھپ گئے۔ جنگ کے خاتمہ پر جب مرنے والوں کے عزیز واقارب لاشیں اٹھانے آئے تو انہوں نے چاہا کہ شجنہ اور اس کے لڑکے کی لاشیں اٹھائیں لیکن دن کی روشنی میں انہیں میدان جنگ میں جانے کی جرات نہ ہوئی۔ پس وہ شام تک ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ جب رات کی تاریکی پھیلی تو وہ ڈرتے ڈرتے میدان میں گئے۔ انہیں لاشیں تلاش کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ شجنہ اور اس کا بیٹا ان کے سامنے پٹل ہوئے تھے۔ پھر اس وقت تک آدھی سے بھی زیادہ لاشیں ان کے عزیز واقارب لے جا چکے تھے۔

انہوں نے ایک ایک لاش اٹھائی اور اپنے صافوں کی مدد سے لاشوں کو زین کے ساتھ کس دیا۔ اس طرح وہ کوفہ کی طرف روانہ ہوئے۔

کوفہ میں خارجیوں کی شکست اور خاتمے کی خبر پہنچی تو کئی گھروں میں صف ماتم بچھ گئی کوفہ میں کئی ایسے گھرانے تھے جن کے لوگ اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مر شجنہ کا گھر تھا۔ چونکہ لاشوں کو اٹھانے کی ان کے عزیزوں کو اجازت دے دی گئی تھی۔ اس پہلے انہوں نے اپنے عزیز واقارب کو دفنایا پھر شجنہ کے گھر کا رخ کیا۔ کوفہ والے ا

عزیزوں کی لاشیں گھر نہیں لائے تھے بلکہ انہوں نے میدان ہی میں گڑھے کھود کر انہیں دبا دیا تھا- اس لیے کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا تعلق "خارجیوں" سے ثابت ہو کیونکہ اس سے ان کی گرفتاری اور قتل کا بھی خطرہ تھا- ایسے لوگوں نے مارے جانے والوں کا ماتم بھی گھر کے اندر ہی چھپ چھپا کر کیا- انہوں نے آپس ہی میں ایک دوسرے کو چھپ کے پرسہ بھی دیا اور اظہار افسوس یا اطمینان کا درس دیا- پھر وہ ایک ایک کر کے شجنہ کے گھر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے-

قطامہ گھر میں اکیلی تھی کیونکہ باپ اور بھائی میدان جنگ میں تھے- اسے خبر بھی نہ تھی کہ ان دونوں پر کیا گزری ہے- شبیب اور وردان بھی جسر نہرواں جا چکے تھے- پس بہت سے خارجی اس کے گھر پر جمع ہو گئے لیکن وہ شجنہ اور قطامہ کے بھائی کے بارے میں سوائے اس کے اور کچھ نہ بتا سکے کہ وہ دونوں حضرت علی کے ہاتھوں دوزخ میں گئے ہیں- ان کی لاشوں کے بارے میں بھی کسی کو کچھ علم نہ تھا کہ وہ کیا ہوئیں-

قطامہ کو اس رات کسی پہلو چین نہ تھا- بھائی اور باپ کے غم نے اسے نڈھال کر دیا تھا- پھر جب نصف شب کے قریب گزری تو قطامہ کے کانوں میں گھوڑوں کی آہستہ آہستہ چلنے کی آواز پڑی- اس کی نیند تو پہلے ہی اڑ چکی تھی چنانچہ اسے ہر آواز ایک نئے خطرے کا پیش خیمہ معلوم ہوتی تھی-

گھوڑوں کے چلنے کی آواز قطامہ کے قریب پہنچتی جا رہی تھی- قطامہ اس وقت گوش بر آواز تھی- جب آواز قطامہ کے گھر کے دروازوں سے ٹکرائی تو وہ دوڑ کر دروازے پر پہنچی- اس نے دروازہ کھولا تو اس کی نظر شبیب اور وردان پر پڑی- قطامہ باہر نکل کے ان کے پاس پہنچی-

اس وقت شبیب نے آہستہ سے کہا-

''قطامہ صبر کرو-تمہارے باپ بھائی سچے دین پر قربان ہو گئے-''

قطامہ کی آنکھوں کے آنسو پہلے ہی خشک ہو چکے تھے-اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا-

''میں ان کا پہلے ہی صبر کر چکی ہوں''

پھر قطامہ نے قدرے ٹھہر کر دریافت کیا-

''دونوں کی لاشیں کہاں ہیں؟''

''تم اندر چلو- ہم لاشیں لے کر آ رہے ہیں-'' وردان نے جواب دیا-

قطامہ اندر چلی گئی-اس نے اندر موجود چار خارجیوں کو باہر بھیج دیا-

''لاشیں کدھر ہیں؟'' ایک خارجی نے آہستہ سے پوچھا-

شبیب اور وردان لاشوں کو زین سے الگ کر چکے تھے-انہوں نے سوال کرنے والوں کو اشارے سے بتایا- وہ لاشوں کے پاس پہنچے اور لاشوں کو سہارا دے کر اندر لے گئے-

قطامہ نے ایک بڑی چٹائی فرش پر بچھا دی تھی- چنانچہ لاشیں اس پر رکھ دی گئیں-
قطامہ دو جلتی ہوئی شمعیں لے آئی اور ایک چوکی پر لاشوں کے قریب رکھ دیں-

پھر قطامہ نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ایک لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹائی- یہ اس کے بھائی کی لاش تھی- قطامہ کا چہرہ سپاٹ اور زرد تھا- پھر قطامہ نے دوسرے چہرے سے چادر ہٹائی- یہ اس کے باپ کی لاش تھی- قطامہ ایک لمبی سسکی بھر کے باپ کی لاش سے لپٹ گئی- دونوں لاشیں سرد پڑ چکی تھیں اور خون خشک ہو گیا تھا- پھر بھی جب قطامہ باپ کی لاش سے لپٹی تو اس کا ایک ہاتھ خون میں لتھڑ گیا- قطامہ نے اپنا خون آلود ہاتھ شمع کی روشنی میں دیکھا اور پھر وہ ہاتھ آہستہ آہستہ اپنے چہرے کی طرف لے گئی اور وہ خون اپنے چہرے پر مل لیا-خون کے دھبے اس کے نصف چہرے پر نمودار ہوئے بلکہ چمک اٹھے-

قطامہ مسکرائی-مگر اس کی یہ مسکراہٹ بڑی خوفناک تھی- کیونکہ اس کی آنکھیں سرخ ہو

گی تھیں اوراس کے ہونٹ لرز رہے تھے- پھر قطامہ نے وہاں موجود تمام خارجیوں کو مخاطب کیا-

''اے خارجی مسلمانو! اور دین کے پرستارو- میرا سب کچھ دین پر قربان ہو گیا ہے- میں نے اپنے باپ کا خون اپنے نصف چہرے پر پھیلایا ہے- اب تم گواہ رہنا کہ میں عہد کرتی ہوں کہ جب تک میں اپنے بھائی اور باپ کے قاتل کے خون سے اپنا بقیہ چہرہ سرخ نہ کرلوں گی چین سے نہ بیٹھوں گی- میرے دل میں لگی ہوئی آگ کو صرف اور صرف علیؓ کا خون ہی بجھا سکتا ہے-''

خارجی قطامہ کے اس عہد سے بہت پریشان ہوئے- انہیں اس بات کا تو یقین تھا کہ قطامہ اپنے حسن خداداد کی بہ دولت بڑے بڑے کام کر سکتی ہے مگر خلیفہء وقت حضرت علیؓ تک اس کا ہاتھ پہنچنا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور تھا- مگر خارجی یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ یہ عہد تو قطامہ نے کیا ہے- اب وہ اسے پورا کرے یا نہ کرے وہ خود اس کی ذمہ دار ہے- ان لوگوں پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں-

پس دونوں لاشوں کو صحن میں گڑھا کھود کر گاڑ دیا گیا- یہ خبر کوفہ میں موجود تمام خارجیوں کو اسی رات پہنچ گئی- وہ ایک ایک دو دو کر کے تمام رات قطامہ کے گھر رات بھر آتے رہے اور اسے پرسہ اور تسلیاں دیتے رہے- جو رات کو قطامہ کے گھر پرسے کو نہ پہنچ سکے وہ صبح دم اس کے گھر گئے- مگر انہوں نے قطامہ کا گھر بند پایا- قطامہ صبح ہونے سے پہلے ہی شبیب بن نجدہ اور وردان کے ساتھ گھوڑا اڑاتی مصر کی طرف رواں دواں تھی-

مصر میں عبداللہ بن سبا کو جنگ نہرواں پر خارجیوں کی عظیم شکست کی اطلاع مل چکی تھی- اسے خارجیون کی شکست کا افسوس تو تھا لیکن اسے خارجیوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی- اس لیے کہ ان لوگوں نے عبداللہ بن سبا کو امام تسلیم کرنے کی بجائے عبداللہ بن الکوار کو نماز کا

امام بنالیا تھا اورانہوں نے اپنا الگ تشخص برقرار رکھنے کے لیے ایک الگ جماعت بنالی تھی حالانکہ دونوں کا ایک ہی نصب العین یعنی ''اسلام دشمنی'' تھا۔

قطامہ جب شبیب اور وردان کے ساتھ مصر پہنچی اور عبداللہ بن سبا کے حضور حاضر ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ عبداللہ بن سبا کا رویہ اور سلوک اس کے ساتھ مشفقانہ ہونے کی بجائے انتہائی سرد اور غیر جانبدارانہ تھا۔ قطامہ نے معرکہ جسر نہرواں کی پوری تفصیل سے عبداللہ بن سبا کو آگاہ کیا مگر عبداللہ بن سبا نے اس واقعہ میں جو مسلمانوں اور اسلام دشمنوں کے درمیان ایک عظیم معرکہ تھا' پر نہ تو کوئی خاص توجہ دی اور نہ کسی دلچسپی کا اظہار کیا۔ قطامہ کو امام کا یہ رویہ بہت شاک گزرا۔

قطامہ سے برداشت نہ ہوا۔ اس نے ابن سبا سے دریافت کیا۔

''یا امام! آپ کو جسر نہرواں پر شہید ہونے والوں کا کوئی غم نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے بھی تو سچے مسلمانوں (خارجیوں) کی عظمت کے لیے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔''

''قطامہ' جسر نہرواں پر شہید ہونے والے تمام لوگ شہادت کے درجے پر سرفراز ہوں گے سوائے دو آدمیوں کے۔''

قطامہ چونکی۔ اس نے پوچھا۔

''وہ کون دو ہیں امام؟ انہوں نے کیا قصور کیا کہ شہادت کے مرتبے سے محروم کیے گئے؟''

ابن سبا نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک جوان کی طرف دیکھا اور بولا۔

''اے ابن ملجم تو اس لڑکی کو بتا کہ وہ دونوں کون تھے اور وہ جہنمی کیوں ہوئے۔''

عبدالرحمٰن بن ملجم قبیلہ جھری کا ایک پرجوش نوجوان تھا۔ وہ سبائیہ فرقے میں کچھ ہی

دن پہلے شامل ہوا تھا لیکن اس نے ابن سبا کے کہنے پر بعض ایسے لوگوں کو قتل کیا تھا جس سے اس کا درجہ ابن سبا کی نظروں میں بہت بلند ہو گیا تھا۔ ابن ملجم ہر وقت امام بن سبا کے ساتھ رہتا تھا۔ ابن سبا اہم سے اہم گفتگو کے وقت بھی اس جوان (ابن ملجم) کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

ابن ملجم جواب دینے والا تھا کہ ابن سبا نے اسے روک کر کہا۔

''یہ لڑکی ابھی دوشیزگی کی منزل میں ہے۔ دین کی باتیں شاید اس کی سمجھ میں نہ آئیں''

قطامہ بھڑک اٹھی۔ اس نے فوراً کہا۔

''اے امام! اگر میں بے عقل ہوتی تو کوفے سے مصر تک امام سے مشورے کے لیے نہ آتی۔ امام نے یہ کہہ کر میرا درجہ گھٹا دیا ہے۔''

ابن ملجم پہلی ہی نظر میں قطامہ پر عاشق ہو گیا تھا۔ یہ بات تو اس نے قطامہ کو چھیڑنے کے لیے کہی تھی۔ اس نے اپنی بات کی اس طرح وضاحت کی۔

''قطامہ! میرا مقصد تمہاری توہین کرنا ہرگز نہ تھا۔ عورتیں چونکہ دین میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتیں اس لیے میں نے یہ بات کہی تھی۔ اگر تمہیں یہ بات ناگوار گزری ہے تو میں معافی مانگ سکتا ہوں۔ تم تو ہماری مہمان ہو۔''

ابن سبا کی تیز نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ ابن ملجم قطامہ پر بری طرح ریجھ گیا ہے۔ چنانچہ اس نے ابن ملجم کو قطامہ کی نظروں میں اور زیادہ محبوب بنانے کے لیے کہا۔

''قطامہ! ابن ملجم بہت پرجوش جوان ہے۔ تو اس سے جھگڑا نہ کر۔ یہ تیرے بہت کام آ سکتا ہے۔''

قطامہ خود بھی بہت چالاک تھی۔ وہ ابن سبا کا اشارہ فوراً سمجھ گئی اور بولی۔

''امام محترم! آپ کا کہنا درست ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ میں بزدلوں سے نفرت

کرتی ہوں۔" ابن سبا مسکرایا اور بولا۔

"تو نے میرے ایک جاں نثار پر بڑا سنگین الزام لگایا ہے۔ اس بارے میں میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نے میرے بڑے بڑے کام کیے ہیں اور بڑے کام بزدل نہیں کرتے۔ اگر یقین نہیں تو خود اسے آزما کے دیکھ لے۔"

قطامہ جیسے کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ جھٹ سے بولی۔

"میں تو اسے بہادر اس وقت مانوں گی جب یہ اس دور کے سب سے بڑے بہادر کا خون بہائے گا۔"

عبداللہ بن سبا سمجھ گیا کہ قطامہ کا اشارہ کس طرف ہے۔ پھر اس کی زبان سے یہ جملہ سن کر سن پڑ گیا۔ وہ ذرا دیر قطامہ کا منہ دیکھتا رہا۔ خود ابن ملجم بھی بڑا متعجب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ قطامہ کو کیا جواب دے۔ اسے اپنی پوزیشن بہت کمزور سی محسوس ہوئی اور وہ اپنے کو پہلے سے کچھ حقیر نظر آنے لگا۔

دوسری جانب عبداللہ بن سبا نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ پھر بھی اس نے دوسرا داؤ کھیلا اس نے کہا۔

"اے قطامہ! تو نے یہ سوال شبیب اور وردان سے کیوں نہ کیا۔ کیا وہ بہادر نہیں ہیں؟"

قطامہ شیرنی کی طرح بپھر گئی اور کڑک کر بولی۔

"یا امام! میں نے آپ کے ان دونوں پرستاروں سے یہ سوال اس وجہ سے نہیں کیا کہ یہ جنگ نہرواں میں شریک تو ہوئے لیکن انہیں شہادت نصیب نہ ہوئی۔ اگر یہ بہادر ہوتے تو لڑتے لڑتے مر جاتے یا زخمی ہو کر گرفتار ہو جاتے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ اتنی مہیب جنگ میں یہ دونوں صاف بچ گئے اور ان کے جسم پر خراش تک نہ آئی۔

ابن سبا اس دلیل کے سامنے لاجواب ہو گیا۔ اس نظر نے اٹھا کر شبیب بن نجدہ اور

وردان کو دیکھا- وہ دونوں ابن سبا کی نظروں کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے ندامت سے نظریں نیچی کر لیں- ابن سبا کو یقین ہو گیا کہ قطامہ کی بات سچ ہے- پس اس نے ابن ملجم کی طرف رخ کیا اور کہا-

ابن ملجم! یہ تیرا اور قطامہ کا معاملہ ہے- میں اس میں دخل نہیں دینا چاہتا- تو جو چاہے اسے جواب دے' عبدالرحمٰن ابن ملجم نے بہت سوچنے کے بعد جواب دیا-

''یا امام! میرا دل کا حال آپ سے پوشیدہ نہیں- قطامہ نے بھی شاید اس کا اندازہ کر لیا تھا اس لیے اس نے وہ بات کی جو بظاہر ناممکن ہے لیکن میں اسے جواب دینے سے پہلے اس سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں-''

ابن سبا کی خود یہی خواہش تھی- وہ اسی حکمت عملی پر عمل کرنا چاہتا تھا- پھر ابن سبا کو یہودی پیشوا کا حکم مل چکا تھا کہ مسلمانوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے- اس سے مسلمان علماء کو ختم کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بڑے بڑے سرداروں کو راستے سے ہٹایا جائے- آج کل ابن سبا انہی خطوط پر غور کر رہا تھا- حضرت علیؓ کا نام اس کے ذہن میں تھا مگر وہ ان کی طاقت سے خائف تھا- کوفہ میں تو ان پر ہاتھ ڈالنا ناممکن تھا- پھر اس کام کو تو کوئی سر پھرا ہی کر سکتا تھا اور اب وہ سر پھرا ابن ملجم کی شکل میں ان کے سامنے آ رہا تھا-

ابن ملجم یوں تو امام کے کہنے پر کئی بار جان پر کھیل گیا تھا لیکن حضرت علیؓ کا نام لینے سے ابن سبا ڈرتا تھا کیونکہ مسلمانوں سے نفرت کے باوجود سبائی حضرت علیؓ کے طرفدار تھے بلکہ سبائی فرقہ کے عقیدے کے مطابق حضرت علی کو سبائی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصی سمجھتے تھے- پھر بھلا کوئی سبائی ان پر کیسے تلوار اٹھا سکتا تھا- ہاں خارجیوں نے ضرور کھلم کھلا حضرت علیؓ کی بغاوت کی تھی اور ابن سبا کو خارجیوں پر پورا قابو حاصل نہ تھا- ہاں خارجیوں کو اپنا ہم خیال بنا رہا تھا تا کہ حضرت علی کے خلاف ان کے بھڑکے ہوئے جذبات سے فائدہ

اٹھائے-

قطامہ پکے اور کٹر قسم کے خارجی عقیدے کی پیرو کار تھی اور اب تو اس نے بھائی اور باپ کا انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا- پس ابن سبا نے یہی بہتر خیال کیا کہ ان دونوں کو ملا دیا جائے کہ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی بہتر صورت نکل آئے اور اس کا ناپاک منصوبہ کامیاب ہو جائے-

پس ابن سبا نے فوراً ابن ملجم کو تنہائی میں گفتگو کرنے کی اجازت دے دی- قطامہ نے بھی کوئی عذر نہ کیا- قطامہ بے دین تھی مگر ذہین اور فطین تھی- اس نے ابن ملجم کے چہرے مہرے اور باتوں سے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ پر جوش جوان واقعی اس کا دست راست بن سکتا ہے اور اس لیے اس نے ابن ملجم سے تنہائی میں گفتگو کرنے پر اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا-

عبداللہ بن سبا نے ایک بزرگ مسلمان کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا- وہ کھلے عام شراب پیتا تھا لیکن اس نے خاص احباب کے لیے ایک خاص قسم کا مشروب تیار کرایا تھا جو دیکھنے میں اور ذائقے میں خوش رنگ اور خوش ذائقہ مشروب تھا لیکن اصل میں اس میں نصف سے زیادہ شراب شامل ہوتی تھی- شراب کی بدبو کو زائل کرنے کے لیے اس میں خوشبودار جڑی بوٹیوں کا ست بھی ملایا جاتا تھا- ابن سبا یہودی تھا اور شراب کا بڑا رسیا- اس طریقے سے وہ اپنے شراب کے شوق کی تسکین کرتا تھا-

حسن بن سبا یہ مشروب یا شراب اپنے خاص احباب کو بھی پیش کرتا جو اس کے معتمد اور پرستار ہوتے- اس کے علاوہ خاص خاص موقعوں پر بھی وہ اس مشروب سے کام لیتا تھا- قطامہ اور ابن ملجم کی ملاقات کے موقعہ پر بھی ابن سبا نے اس مشروب کا خاص طور پر اہتمام کرایا- اس نے اس کمرے میں جہاں ابن ملجم اور قطامہ کی ملاقات ہونی تھی- صراحیوں میں

بھر کر رکھا دیا تھا- ان صراحیوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بلوری گلاس نما پیالے بھی رکھے گئے تھے- اس کے علاوہ کھانے کی میز پر بھی کچھ اسی قسم کے لوازمات رکھے گئے تھے- تا کہ مے نوشی کا پورا حق ادا ہو جائے- ابن سبا کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ دونوں جو جوان تھے ملیں تو ان کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوگا اور اس میں اس کا استعمال ان کے جوش اور جذبات میں اور زیادہ تلاطم پیدا کرے گا-

مکار قطامہ' ابن سبا سے زیادہ دور اندیش تھی- اس نے جب کمرے میں قدم رکھا جہاں اس کی ابن ملجم سے ملاقات ہونی تھی تو اس نے اپنی جوانی اور جوانی کے تمام جذبات کو باہر ہی چھوڑ دیا اور ایک بڑی سیاستدان اور مدبر بن کر کمرے میں داخل ہوئی- اس طرح قطامہ نے اپنے کو اندر سے تو خالی کر لیا لیکن ابن ملجم کو لبھانے اور زیر کرنے کے لیے اس نے اپنے حسن و جمال کی خود ہی مشاطہ گری کی- اس نے نہ صرف انتہائی بیش قیمت لباس پہنا تھا بلکہ اعلیٰ عرب خواتین کے مروجہ زیورات سے بھی خود کو آراستہ کیا- اس نے جسم کو ایسے باریک لباس میں چھپایا تھا جس سے جسم کے تمام زاویے صاف نظر آتے تھے- غرض یہ کہ قطامہ نے ابن ملجم کو لبھانے کے لیے حسن و ادا کے تمام ہتھیاروں سے خود کو مسلح کر لیا تھا-

اس طرح قطامہ قدم قدم پر فتنے جگاتی' قیامتیں برپا کرتی' ناز و ادا کے عشوے بکھیرتی' سولہ سنگار کیے جب ایک جھماکے کے ساتھ ابن ملجم کے سامنے آئی تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں- قطامہ یوں بھی حسین تھی مگر اس مشاطگی کے کمال نے اس پر چار چاند لگا دیے- ابن ملجم کا جی چاہا کہ حسن کی اس دیوی کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے لیکن اس کی نظریں دنگ اور زبان گنگ ہو گئی- وہ اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہ سکا-

قطامہ' چکور کے خرام اور حور کے سبک قدموں سے ناز و ادا کی بجلیاں گراتی ابن ملجم کے بالکل سامنے ایک قالین پر آ کر بیٹھ گئی- اس کے لبوں پر دلفریب تبسم اور آنکھوں میں شوخ و

شنگ چمک تھی- اس طرح دیوی اور پجاری ایک دوسرے کے مقابل تھے- اس وقت دل کا سودا ہونا تھا اور جان کا نذرانہ پیش کیا جانا تھا- قطامہ اس وقت ناگن کی خوبصورت کینچلی کے اندر زہر بھرے کٹورے چھپائے ہوئے تھی-

ایک عجیب سا عالم حسرت تھا- ابن ملجم مبہوت اور قطامہ خاموشی کا پیکر- قطامہ نے محسوس کیا کہ اس کے حسن نے ابن ملجم کے گرد سحر کا ایک حلقہ سا بنالیا ہے- اس لیے قطامہ نے گفتگو میں خود پیش قدمی کی-

''ابن ملجم بتاؤ- وہ کیا بات ہے جو تم تنہائی میں مجھ سے کہنا چاہتے تھے؟''

ابن ملجم اس کے حسن جہاں تاب کے سحر سے آزاد نہ ہونا چاہتا تھا- وہ ٹکٹکی باندھے قطامہ کو دیکھ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ یہ نظارہ تا قیامت اس کے پیش نظر رہے- وہ قطامہ کی آواز پر قدرے چونکا- گھبرایا اور پھر ہوش میں آیا اور اپنی مخمور آنکھوں کو کئی بار جھپکا کر انتہائی انکساری سے بولا-

''قطامہ تو واقعی حسن کی دیوی ہے- میں تیرے حضور نذرانہء دل پیش کرنا چاہتا ہوں''

قطامہ نے تبسم بکھیرتے ہوئے مکاری سے کہا-

''ابن ملجم دل کا سودا دل سے ہی ہوا کرتا ہے-'' پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی- مگر اے ابن ملجم! میرا دل زخمی ہے- جب تک اس پر مرہم نہیں رکھا جاتا یہ کوئی آواز سننے کے لیے تیار نہیں-''

ابن ملجم نے قطامہ کے پیکر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا-

''قطامہ بتا کہ تیرے زخموں کا مداوا کیا ہے- میں تیرے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہوں-'' قطامہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے- وہ خشک لہجے میں بولی-

''ابن ملجم! مجھے حقیقت کی دنیا میں یہ شاعرانہ گفتگو پسند نہیں- یہ باتیں تو اس وقت اچھی

لگتی ہیں جب دل ودماغ ٹھکانے ہوں- اگر وقت ملا اور ہم تم پھر ملے تو تم دیکھو گے کہ محبت کا جواب محبت سے کس طرح دیا جاتا ہے-''

ابن ملجم گھبرا گیا اور جلدی سے بولا-

''مگر قطامہ! میں تو ہمیشہ تیرے قریب رہنے کا خواہش مند ہوں-''

قطامہ کھل کھلا کر ہنس پڑی اور ابن ملجم کو یوں محسوس ہوا جیسے رات کی رانی نے صدہا پھول اپنی شاخوں سے جھٹک دیے ہوں- پھر قطامہ نے کہا-

''ابن ملجم! تجھ میں جوان ہونے کے علاوہ اور کون سی ایسی خوبی ہے جس سے تو مجھے متاثر کرسکتا ہے مگر ٹھہر- میں پھر وضاحت کردوں کہ مجھے بزدلوں سے سخت نفرت ہے- اس لیے تو محبت کے رنگین الفاظ کا سہارا لینے کے بجائے حقیقت سے قریب تر لہجہ اور الفاظ کا استعمال کر''

قطامہ کا یہ منتقی انداز ابن ملجم کو اور زیادہ زخمی کر گیا- چنانچہ وہ سنبھلا اور خود اعتمادی سے بولا- ''اے پیکر حسن وجمال! حقیقت یہ کہتی ہے کہ تو مجھے پسند ہے اور میں تجھے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں-''

''ابن ملجم! مجھے تیری صداقت پسند آئی- خرید وفروخت میں یہی انداز اختیار کیا جانا چاہیے- اے ابن ملجم اس وقت تو خریدار ہے اور وہ جنس میری ملکیت ہے جسے تو خریدنا چاہتا ہے- مگر میں اس سودے میں کوئی جرح اور تکرار نہیں چاہتی- جنس کی جو قیمت مانگوں گی اس میں کمی وبیشی نہ ہوگی- خواہ تیری سفارش امام ابن سبا ہی کیوں نہ کرے-''

''میں بھی سودے کا فیصلہ چاہتا ہوں-'' ابن ملجم نے بے چینی سے کہا-

''اے ابن ملجم! قیمت بہت زیادہ ہے- بہتر ہے کہ تو خریدنے کا ارادہ ترک کر دے-'' چالاک قطامہ نے اس کے اشتیاق کو اور مہمیز کیا-

ابن ملجم نے پہلو بدلا اور بولا۔

''قطامہ مانگ کیا مانگتی ہے۔خریدار ہر قیمت دینے پر آمادہ ہے۔''

''پھر سوچ لے اے ابن ملجم!'' قطامہ نے اسے ایک بار پھر ٹٹولا۔''میں نہیں چاہتی کہ تو شرمندہ ہو کر میرے سامنے سر جھکائے۔''

ابن ملجم ایک بگڑے ہوئے خریدار کے انداز میں بولا۔

''قطامہ تو خریداری کے اصول کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔قیمت بتانے میں حیل و حجت کیسی؟''

''تو سن اے ضدی خریدار!'' قطامہ سنبھل کر بولی۔''قطامہ بنت شجنہ کو حاصل کرنا ہے تو اس کے مہر میں تین چیزیں دینا ہوں گی۔''

''چیزوں کی تفصیل بیان کی جائے۔'' اور ابن ملجم سنبھل کے بیٹھ گیا۔

''تو سن پہلی شرط تین ہزار دینار نقد''

''مجھے منظور ہے۔'' ابن ملجم نے کڑک کے جواب دیا۔

''دوسری شرط۔ایک لونڈی اور ایک غلام''

''مجھے یہ بھی منظور ہے۔تیسری شرط بیان کر۔''

''تیسری شرط'' قطامہ کہتے کہتے رکی۔

صرف چند لمحے گزرے تھے کہ ابن ملجم بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا اور غصے سے بولا۔

''قطامہ! اپنی تیسری شرط بیان کر یا پھر اپنی ہار تسلیم کر''

''ہار تو تیسری قسمت میں ہے اے ابن ملجم'' قطامہ بپھر گئی۔''مجھے اپنے مہر میں ایک سر چاہیے۔''

''کس کا سر چاہیے؟'' ابن ملجم نے پوری آواز سے کہا۔

''تو سن اے ابن ملجم اگر سن سکتا ہے تو سن-'' قطامہ نے ابن ملجم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا- ''مجھے سر چاہیے اس کا جسے ابوالحسن' ابوتراب' مالک ذوالفقار' حیدر کرار' فاتح خیبر' علی ابن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن......''

''چپ ہو جا قطامہ! خاموش ہو جاؤ-'' ابن ملجم دہاڑا-

قطامہ زخمی شیرنی کی طرح تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور پوری طاقت سے گرجی-

''بس ختم ہو گئی تیری ساری بہادری- علی کا نام سنتے ہی زہرہ آب اور پتہ پانی ہو گیا-'' اس کے ساتھ ہی قطامہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی-

ابن ملجم نے دوڑ کر اس کا راستہ روک لیا اور محبت سے بولا-

''قطامہ کہاں جاتی ہے- سودا تو طے ہو گیا-''

''کس طرح؟'' قطامہ نے امید وبیم کے درمیان پوچھا-

ابن ملجم نے مسکراتے ہوئے کہا-

''اے دل نواز' ماہ پیکر- تجھے اپنی قیمت کا تو خود بھی اندازہ نہیں- تو نے اپنی قیمت خود ہی گھٹا دی- میں تو اس سے کہیں زیادہ تیری قیمت ادا کرنے پر آمادہ تھا- میں نے تو کچھ اور ہی اندازہ لگایا تھا-''

قطامہ بہت خوش ہوئی- ابن ملجم اس کی شرائط کو پوری کرنے پر آمادہ تھا- پھر بھی اس نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ابن ملجم نے اس کی قیمت کا کیا اندازہ لگایا تھا- پس اس نے ابن ملجم سے پوچھا-

''ذرا میں بھی تو سنوں- تو نے میری قیمت اس سے زیادہ اونچی اور کون سی لگائی تھی؟''

ابن ملجم نے قطامہ کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے آہستہ سے کہا-

''قطامہ! میں تو سمجھا تھا کہ تو اپنے حسن کی قربان گاہ کے لیے (امامِ دوراں) عبداللہ بن سبا کا سر طلب کرے گی اور تو یہ بھی سن لے قطامہ کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر تو امام دوراں کا سر طلب کرتی تو خدا کی قسم میں تیرے حصول کے لیے یہ بھی کر گزرتا۔''

پھر قطامہ نرم شاخ کی طرح ابن ملجم کی مضبوط بانہوں میں جھول گئی۔ اس وقت وہ بہت خوش تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ انتقام لے سکے گی اور اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔

پھر قطامہ اپنے امام دوراں کے پاس پہنچی اور انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا۔ ابن سبا نے محبت سے قطامہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''میں تیرے ساتھ ہوں قطامہ۔ اگر ابن ملجم نے تیرے ساتھ بدعہدی کا قصد کیا تو میرے وفادار اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔''

اس کے بعد ابن ملجم شادی کی شرائط کو پوری کرنے میں لگ گیا۔ اس نے اپنے منصوبے میں کچھ اور اضافہ کیا۔ اس نے دو اور سبائیوں کو تیار کیا اور ایک بڑا منصوبہ ترتیب دیا۔ ابن ملجم نے حضرت علیؓ کے علاوہ حضرت معاویہؓ حضرت عمرو بن عاصؓ کو بھی شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن ابن ملجم کوفہ پہنچ کر حضرت علیؓ کو شہید کرے۔ اس کی مدد شبیب اور وردان کریں گے۔ دوسرا سبائی برک بن عبداللہ تیمی تھا۔ اسے حکم ہوا کہ وہ شام جا کر حضرت امیر معاویہؓ کا سر اتارے اور تیسرا سبائی عمرو بن بکر تیمی دوسرے گورنر عمرو بن عاصؓ کا خاتمہ کرے۔

اس اہم منصوبے کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ایک ہی تاریخ اور وقت مقررہ پر تینوں قاتل ایک ساتھ ان تینوں بزرگانِ دین اور اسلام کی جلیل القدر ہستیوں کو قتل کرنے کے لیے روانہ کیے گئے۔ اس گھناؤنے اور بزدلانہ منصوبے کی تکمیل کی تاریخ ۱۷ رمضان المبارک ۴۰ ہجری اور وقت نماز فجر مقرر ہوا۔ چونکہ تینوں مقامات میں کافی فاصلے تھے اس لیے تینوں

فوراً مکہ روانہ ہوئے- برک بن عبداللہ تیمی نے ملک شام کا رخ کیا- عمرو بن بکر تیمی مصر کی طرف چلا اور عبدالرحمٰن ابن ملجم، زہریلی ناگن قطامہ کے ساتھ کوفہ واپس آ گیا-

اس دوران خربت ابن راشد نے بنی ناجیہ کے تین سو آدمیوں کے ساتھ حضرت علیؓ کے خلاف شورش برپا کی- آخر وہ منحوس ساعت آ گئی- ۱۷ رمضان کو قطامہ نے نصف شب کے بعد ابن ملجم کو جگا دیا- پھر بڑے چاؤ سے اسے تیار کیا-

ابن ملجم کے دونوں ساتھی شبیب بن نجدہ اور وردان اس کے ساتھ ہی ٹھہرے ہوئے تھے- وہ جمعہ کی شب تھی- تینوں قاتل صبح سے بہت پہلے کوفہ کی جامعہ مسجد میں جا کر چھپ گئے- نماز فجر کے وقت حضرت علیؓ مسجد میں داخل ہوئے اور حسب معمول مسجد میں سونے والوں کو نماز فجر کے لیے جگانا شروع کیا- اس وقت شبیب بن نجدہ کمین گاہ سے نکلا- اس نے خلیفہ چہارم پر زہر آلود تلوار سے وار کیا- حضرت علی قطعی بے خبر تھے- آپؓ زخم کھا کر محراب پر گرے- ابن ملجم آگے بڑھا اور تلوار کا بھرپور وار حضرت علیؓ کے سر مبارک پر کیا- فاتح خیبر کی ریش مبارک خون میں تر بتر ہو گئی- آپ سنبھل نہ پائے تھے کہ ابن ملجم مردود نے کئی وار کر دیے-

حضرت علیؓ نے آواز دی-

''میرے قاتل کو پکڑو-''

ابن ملجم مسجد سے نکل کر بھاگا- لوگوں نے اسے دوڑ کے پکڑ لیا- شبیب وردان اس ہنگامۂ دار و گیر میں اکیلے رہ گئے-

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو گھر پر لایا گیا اور ابن ملجم کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا-

حضرت علیؓ نے قاتل کو دیکھا- اسے پہچانا اور فرمایا:

''اگر میں مر گیا تو اس شخص کو قتل کر دینا- اگر زندہ رہا تو خود جو سزا مناسب سمجھوں گا'

دوں گا۔"

زخم کاری تھے۔ زہر تمام جسم میں پھیل گیا۔ آپ نے حسن و حسین اور محمد بن حنیفہؓ کو بلا کر اتفاق' اتحاد کی تلقین فرمائی۔ پھر ۲۰ رمضان ۴۰ ہجری یک شنبہ کی شب کو جگر گوشہ رسولؐ خاتون جنگ حضرت فاطمہؓ کے شوہر نبائے لا الہ' حسینؓ کے شفیق باپ اور شمس الضحیٰ' بدرالدجی' شافی محشر' ختم النبین حضرت محمد رسول اللہؐ کے بھائی اور داماد سیدنا علی مرتضیٰؓ نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔

حضرت معاویہؓ پر دمشق میں حملہ ہوا۔ وار اوچھا تھا۔ زخم جلدی اچھا ہو گیا۔ برک گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔

تیسرا قاتل عمرو بن بکر عمرو بن عاصؓ کو قتل کرنے مصر پہنچا تھا' جس دن اس نے عمرو بن العاصؓ پر حملہ کیا۔ اس دن بیمار تھے نماز میں نہ آئے۔ ان کے بجائے عمرو بن پر حملہ ہوا اور وہ قتل ہو گئے۔ عمرو کا قاتل گرفتار ہو کر قتل ہوا۔

❧

لیلیٰ مجنوں

عشقیہ داستانوں کی سرتاج داستان جس کے دونوں کردار ابدیت کے حامل ہیں

ملک عرب کے شہر نجد کا ایک ادھیڑ عمر رئیس زادہ جانماز پر بیٹھا دست بہ دعا ہے۔

''اے بارِالٰہی! اے پاک پروردگار! اے قاضی الحاجات! تو بندہ پرور ہے۔ بے کسوں کا معین، ضرورت مندوں کا دادرس ہے۔ تیرے ہی در سے شاہ و گدا کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ دردمندوں کو درماں ملتا ہے۔ غم زدوں کو خوشی نصیب ہوتی ہے۔ بے روزگاروں کو روزگار ملتا ہے۔ تو مانگنے والوں کی جھولیاں بھرتا ہے۔ تو بے نواؤں کی فریاد سنتا ہے۔

اے اللہ! اور اے مالک و خالق تو نے مجھے اپنی رحمت سے سب کچھ دیا۔ گھر دیا، در دیا، عزت و حرمت عطا فرمائی۔ دولت و ثروت سے مالا مال کیا۔ میں تیری کس کس عنایت، مہربانی اور کرم نوازی کا شکریہ ادا کروں۔ تو نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو میں نے تجھ سے مانگا۔ مجھے سب کچھ میسر ہے مگر اے مالک و خالق! میں اتنی عمر گزر جانے کے باوجود اب تک اولاد سے محروم ہوں۔ میرا گھر سونا ہے اور سیہ خانے سے بھی بدتر ہے۔

اے خدایا! اے باری تعالیٰ! اے پاک پروردگار! بحق آلِ محمدؐ مجھے اولاد دے۔ اس گھر بار اور مال و زر کا وارث عطا کر۔ بس تیرے حضور مجھ عاجز، غریب، مسکین کی یہی دعا ہے۔ اے خدایا! تو اس دعا کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔''

اس کے ساتھ ہی عقب سے آمین آمین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ عبداللہ جس

جانماز پر بیٹھا خداوند کریم سے یہ دعا مانگ رہا ہے- اس جانماز کے پیچھے ایک اور بڑی جانماز بچھی ہے جس پر عبداللہ کی بیوی بیگم دلشاد کی بہنیں عبداللہ کے خدمتگار اور دو خواصیں' عبداللہ کی دعا میں شریک ہیں اور دعا کے خاتمہ پر آمین' آمین کی صدائیں بلند کرتی ہیں-

(۲)

عبداللہ مکان کے آنگن میں کیاریوں کے قریب ٹہل رہا ہے کہ ایک طرف سے اس کا خدمتگار داخل ہو کر اور ہاتھ بلند کر کے نعرہ لگاتا ہے-

"خداوند نعمت سلامت

مبارک سلامت

اللہ پاک نے میرے آقا کو ایک پیارا سا بیٹا دیا ہے-"

عبداللہ رک کر خادم کا منہ دیکھتا ہے پھر تعجب اور مسرت بھرے لہجے میں پوچھتا ہے کہ سچ سچ بتا- کیا اللہ نے مجھ پر کرم کیا ہے اور میں...... اور میں...... ایک بیٹے کا باپ بن گیا ہوں- خادم پھر زور دے کر کہتا ہے- میرے مالک میرے آقا! میں آپ سے جھوٹ کیسے بول سکتا ہوں- آپ اندر جائیے اور اپنی آنکھوں سے اپنے لعل کو' اپنی اولاد کو دیکھیے-

عبداللہ کا دماغ مسرت اور شادمانی سے ایسا گھومتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر خادم کو پکڑ کر کلیجے سے لگاتا ہے اور بھرائے ہوئے لہجے میں آسمان کی طرف دیکھ کر کہتا ہے-

"اے مالک! اے اس دنیا کے خالق! تو کتنا رحیم ہے تو نے میری التجا سن لی- میں...... میں ایک بچے کا باپ بن گیا ہوں- وہ تیزی سے زنانخانے کی طرف بڑھتا ہے- ابھی وہ دو ہی قدم چلا ہوگا کہ ایک خادمہ اندر سے برآمد ہوتی ہے- وہ عبداللہ کو دیکھ کر خوشی سے چیخ اٹھتی ہے-

"مالک! میرے آقا! اللہ نے آپ کی دعا سن لی- اس نے آپ کو ایک بیٹا' اس گھر کا

تاج اور جائیداد کا وارث عطا کیا ہے۔"

عبداللہ کے کانوں میں یہ آواز پڑتی ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے کان دھوکہ نہیں دے رہے۔ بلکہ واقعی اس پر اللہ کا کرم ہوا ہے اور وہ باپ بن گیا ہے۔ عبداللہ کے پیروں میں جیسے پہیے لگ جاتے ہیں۔ وہ دوڑتا ہوا اندر پہنچتا ہے۔ اس کی بیوی تکیوں اور چند موڑتوں کے سہارے بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ شوہر کو خوش خبری سنانے کے لیے منہ کھولتی ہے مگر اس وقت عبداللہ چیخ اٹھتا ہے کہ نیک بخت تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں، مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اللہ نے ہم پر رحم کیا ہے۔ تم ایک بچے کی ماں اور میں باپ بن گیا ہوں۔

اس وقت مغنیاں ڈھولک بجا بجا کر اپنی زبان میں گانا شروع کر دیتی ہیں جس کا مفہوم یہ ہے۔

یہ کنبہ کا سردار پیدا ہوا ہے
ریاست کا مختار پیدا ہوا ہے
یہ ہے اپنے بابا کی آنکھوں کی پتلی
یہ اماں کا دلدار پیدا ہوا ہے
یہ لڑکا ہے سب قوم عامر کو پیارا
یہ کنبے کا سالار پیدا ہوا ہے
حسینوں کے دل کیوں نہ ہوں اس پہ فدا
یہ باانداز طرح دار پیدا ہوا ہے
مثل ہے کہ ہوتے ہیں اچھوں کے اچھے
یہ بچہ خوش اطوار پیدا ہوا ہے

کھلی اس کے ہونے سے قسمت ہماری
غریبوں کا غم خوار پیدا ہوا ہے

(۳)

ایک کمرے میں ڈھولک پر گانے بجانے ہو رہے ہیں کہ عبداللہ داخل ہوتا ہے- مرد و خواتین ڈھولک روک کے عبداللہ کی طرف مخاطب ہوتے ہیں-

عبداللہ سخت لہجے میں پوچھتا ہے کہ تمام نوکر کہاں چلے گئے' ایک بھی نظر نہیں آتا- اس کی آواز پر ایک طرف سے ایک خادم داخل ہو کر عبداللہ کو سلام کر کے کہتا ہے کہ آقا حکم دیں' میں حاضر ہوں- عبداللہ کہتا ہے کہ خوشی کا دن ہے اور جشن منایا جانا ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ جشن شروع ہونے سے پہلے میں اپنے مبارک بیٹے کی مبارک جنم پتری تیار کروں- تم جاؤ اور کاہن کو اپنے ساتھ ہی لے کر آؤ- اسے بتا دینا کہ رئیس عبداللہ کے گھر بیٹا پیدا ہوا ہے اور اسے بچے کی جنم پتری تیار کرنا ہے- خادم کہتا ہے کہ آقا آپ بالکل فکر نہ کریں میں سیدھا کاہن کے پاس جا رہا ہوں اور اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آؤں گا-

خادم چلا جاتا ہے اور عبداللہ وہیں ایک طرف بیٹھ کے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگتا ہے- چند لمحے بعد خادم اور کاہن داخل ہوتے ہیں- کاہن کے پاس دو کتابیں اور جنم پتری بنانے کا سامان یعنی کاغذ اور قلم وغیرہ ہیں- کاہن' عبداللہ کو سلام کر کے پہلے مبارکباد دیتا ہے پھر کہتا ہے کہ آپ بالکل فکر نہ کریں کیونکہ آج کا دن بہت مبارک ہے- آپ بچے کو منگوایئے میں اس قسمت والے بچے کا زائچہ ابھی تیار کر کے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں-

عبداللہ' خادم کو اندر بھیجتا ہے کہ بیگم سے کہو کہ وہ بچے کو لے کر آ جائیں- کاہن بچے کا زائچہ تیار کرے گا- خادم اندر چلا جاتا ہے پھر چند لمحوں بعد عبداللہ کی بیگم مع بچے کے آتی ہے- کاہن جھک کر بچے کو غور سے دیکھتا ہے پھر سیدھا ہو کر کہتا ہے کہ اے عبداللہ! آپ ایک خوش

قسمت بیٹے کے خوش قسمت باپ ہیں- آپ کے بیٹے کی پیشانی چمک چمک کر اس بات کا اعلان کر رہی ہے کہ یہ بچہ دنیا جہان میں نام پیدا کرے گا- کیا بچے' کیا بوڑھے اور کیا مرد اور کیا عورت ہر ایک کی زبان پر اس کا نام ہوگا اور یہ اپنے باپ دادا کا نام اپنے نام کے ساتھ ہی روشن کرے گا- عبداللہ تعجب سے پوچھتا ہے- اے کاہن! تم نے ابھی زائچہ تیار نہیں کیا- نہ کوئی حساب کتاب کیا اور نہ نقشہ بنا کر ستاروں سے دریافت کیا اور فوراً اس کے قسمت ور اور نامور ہونے کا اعلان کر بیٹھے- بھلا میں کیسے یقین کر سکتا ہوں-

کاہن نے بچے کے باپ کو نرمی سے سمجھایا کہ اے رئیس محترم! آپ نے سنا ہوگا کہ جو بچے قسمت ور ہوتے ہیں ان کی پیشانی ہی ان کی قسمت کا پورا حال بیان کر دیتی ہے- آپ ذرا انتظار کیجیے میں زائچہ اور کنڈلی بنا کر ابھی آپ کا اطمینان کیے دیتا ہوں- چنانچہ کاہن نے عبداللہ کے نومولود بچے کا زائچہ تیار کرنا شروع کیا- وہ بیچ بیچ انگلیوں پر گن گن کر کچھ حساب لگاتا اور زرا بچے کو دیکھتا رہا-

جب کاہن نے بچے کا زائچہ مکمل کر لیا تو بڑے اطمینان سے اعلان کیا کہ اے صاحب! یہ بچہ دنیا میں بہت مشہور اور معروف ہوگا- اس کے ساتھ ہی یہ حد درجہ حسن پرست اور کسی محبوب کی محبت میں اس قدر گرفتار ہوگا کہ ہر دم اسی کا کلمہ پڑھے گا- اس کا عشق مجازی اس قدر بڑھے گا کہ وہ عشق حقیقی میں تبدیل ہو جائے گا- پھر اس کی بے خودی اور وحشت کا یہ عالم ہوگا کہ اسے ہر طرف اپنا محبوب ہی دکھائی دے گا- یہ جنگلوں جنگلوں' ویرانوں ویرانوں اور صحرا صحرا کی خاک چھانے گا- لوگ اس کے عشق اور محبت پر تعجب کریں گے- کچھ اس کی محبت اور بعض اس کی نفرت میں گرفتار ہوں گے مگر اس پر کسی کی محبت یا نفرت کا کوئی اثر نہ ہوگا- اس کا بس ایک ہی محبوب ہوگا اور وہ رات دن اس کا نعرہ گلی گلی' کوچے کوچے اور جنگل و صحرا میں لگائے گا- نہ اسے کھانے سے رغبت ہوگی اور نہ کچھ پینے کی تمنا- صرف اسے اپنا

محبوب عزیز ہوگا اور وہ اسی کے نعرے لگاتا رہے گا اور پھر ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ دنیا کو چھوڑ چھاڑ کے دنیا بنانے والے سے جا ملے گا۔''

عبداللہ نے گھبرا کے کاہن سے پوچھا۔ ''کیا میرا لعل جوانی ہی میں مر جائے گا۔''

کاہن نے جواب دیا۔ ''موت اور زندگی تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو ایک کاہن ہوں اور ہاتھ کی لکیروں سے اس کے بارے میں اندازہ لگا سکتا ہوں باقی باتیں اور سب حال تو اس کا اور میرا آپ کا اللہ ہی جانتا ہے؟۔''

اب عبداللہ کے بچے کے نام کی طرف آتا ہے اور کاہن سے پوچھتا ہے کہ ''اگر یہ بچہ دنیا میں اپنا اور میرا نام اونچا کرے گا تو تم ذرا یہ حساب لگا کر بتاؤ کہ میں اس کا کیا نام رکھوں۔ جس نام سے میں اور دنیا والے اسے پکاریں۔'' کاہن کچھ دیر تک سوچتا اور حساب لگاتا ہے پھر کہتا ہے کہ ''اے رئیس عبداللہ! نام تو سب مٹ جانے والے ہیں اور بس ایک اللہ کا نام ہی باقی رہے گا مگر ہاں میں نے کہا ہے کہ یہ لڑکا عشق و محبت میں گرفتار ہو کر دنیا میں نام پیدا کرے گا تو تم اگر اس کا نام قیس رکھ دو تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔'' عبداللہ لفظ قیس کو دو تین بار دہراتا ہے پھر پوچھتا ہے کہ آخر تم نے اس کا یہ نام کیوں تجویز کیا۔

اس وقت کاہن چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے کھولتا ہے اور کہتا ہے ''اگر تم اس نام کی تجویز سے مطمئن ہو تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ''قیس'' کے نام میں سب سے پہلے حرف ق (قاف) آتا ہے جو ''قتیلِ محبت'' کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کے بعد اس لفظ میں حرف ''ی'' آیا ہے اور حرف ''ی'' ''یادِ جاناں'' کی یاد دلاتا ہے۔ اب رہا قیس کا آخری حرف تو وہ ''س'' ہے۔ پس ''س'' سے مراد ''سراپا رقم'' اور ''سفید چاک ستم'' ظاہر کرتا ہے۔ پس ''قیس'' نیک نام ہو کے بھی بدنام ہوگا۔''

عبداللہ کاہن کی اس تشریح یا پیشین گوئی سے پریشان ہو جاتا ہے مگر وہ خادم سے کہتا

ہے کہ کاہن کو ساتھ لے جا کر اسے انعام واکرام سے نوازو- کاہن کے جانے کے بعد عبداللہ خود اپنے دل سے اس طرح باتیں کرتا ہے- اس کے دل سے جیسے یہ بات نکلتی ہے کہ کاہن کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرا سعادت مند بیٹا جوان ہوکر ''عشق حقیقی'' میں گرفتار ہوگا اور خوب شہرت حاصل کرے گا اور انجام کار میرا یہ طفل سعید' شہادت کے درجے پر فائز ہوگا- یوں بھی ہر ایک سچے مسلمان کا مقصد اعلیٰ عشق حقیقی ہی ہوتا ہے کہ وہ ''عشق حقیقی'' کے ساتھ جہاد پر نکلے اور ناموری حاصل کر کے شہید ہو جائے-

یہ سوچتے ہوئے عبداللہ اپنے خیالوں میں گم ہو جاتا ہے- اس وقت ایک دایہ بچے کو لیے ہوئے پھر آتی ہے اور پوچھتی ہے کہ کیا سرکار نے کاہن کو رخصت کر دیا- عبداللہ نے دایہ سے پوچھا کہ اسے کاہن سے کیا کام پڑ گیا اور وہ بچے کو لے کر دوبارہ کیوں آئی ہے- دایہ بتاتی ہے کہ اے حضور! بچے کی فال کھلوانا ہے- کیونکہ یہ نہ تو پیٹ بھر دودھ پیتا ہے اور نہ پوری نیند سوتا ہے بلکہ بار بار چونک پڑتا ہے-

عبداللہ ایک خادم کو کاہن کے پیچھے دوڑاتا ہے کہ وہ بھاگ کے جائے اور اسے واپس لے آئے- خادم اسے لینے جاتا ہے تو عبداللہ سخت لہجے میں دایہ سے کہتا ہے کہ آج دیر تک کاہن بیٹھا رہا اور اس نے زائچہ بنایا- اس وقت اسے بچے کی فال کھلوانے کا خیال کیوں نہیں آیا- اب شاید ہی کاہن مل سکے اور واپس آئے- دایہ کہتی ہے کہ وہ بچے کی بے چینی کی رو سے ایسی پریشان ہوئی تھی کہ کاہن سے تمام باتیں پوچھ ہی نہ سکی-

بہر حال خادم' کاہن کو واپس لے آیا- عبداللہ نے دایہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کاہن سے کہا کہ یہ تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہے- کاہن ''ضرور......ضرور'' کہہ کر بیٹھ جاتا ہے اور دایہ سے مخاطب ہوکر پوچھتا ہے کہ بچے کے بارے میں اور کیا کچھ پوچھنا چاہتی ہے- دایہ بتاتی ہے کہ مالکن نے پوچھا ہے کہ بچہ کم سوتا ہے اور دودھ بھی کم پیتا ہے بلکہ کئی کئی گھنٹے

ماں کے دودھ کو منہ تک نہیں لگاتا- یہ کہتے ہوئے دایہ بچے کو کاہن کی گود میں دے دیتی ہے-

کاہن بچے کی دوبارہ فال کھولتا ہے- پھر کاغذ پر جگہ جگہ ہندسے لکھ کر کچھ حساب لگاتا ہے- انگلیاں گھماتا ہے- سر ہلاتا ہے اور دایہ کو گھورتے ہوئے کہتا ہے- ''کیا یہ غلط ہے کہ تو جمعرات کو بچے کو لے کر جھٹ پٹے وقت باغ میں گئی تھی؟'' دایہ فوراً اپنی غلطی تسلیم کرتی ہے اور اقبال کرتی ہے کہ اس سے یہ غلطی ضرور ہوئی تھی- کاہن زور سے سر ہلاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ اس دایہ کی اس غلطی کی وجہ سے بچے پر سایہ ہو گیا ہے اور یہ سایہ حضرتِ عشق کا ہے' بچے پر عشق کا پرچھانواں پڑ گیا ہے-

دایہ اور زیادہ گھبرا جاتی ہے- کاہن اس سے فائدہ اٹھاتا ہے اور دایہ سے پوچھتا ہے کہ ''ذرا یاد کر کے یہ بتائے کہ جب وہ بچے کو باغ میں لے گئی تھی تو بچے کے سر پر سرخ رنگ کا کنٹوپ تھا- اس کے کرتے کا رنگ زعفرانی تھا اور اس میں دھانی رنگ کی گوٹ لگی ہوئی تھی اور یہ بھی بتا کہ کیا تو اس وقت نہا دھو کے آئی تھی؟''

دایہ ان سوالوں سے بری طرح بوکھلا جاتی ہے اور کاہن کی ہر بات کا جواب ''ہاں'' میں دیتی ہے- کاہن اس کا پیچھا اب بھی نہیں چھوڑتا اور ایک اور نیا سوال پوچھتا ہے وہ کہتا ہے ''کیوں دایہ جس وقت تو باغ میں گئی تھی تو تیری چوٹی کھلی ہوئی تھی- تیرا پاجامہ سرخ رنگ کا تھا اور تیرے سر پر اودے رنگ کا دوپٹہ تھا؟'' دایہ اس وقت سرخ پاجامہ اور اودے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے ہوئی تھی مگر وہ کاہن کے سوالوں سے ایسی گھبرائی کہ اس کی تمام باتوں کا جواب صرف ''ہاں...... ہاں'' میں دیتی رہی-

کاہن خوش ہو کر مسکراتا رہا- جب اس کے سوالات ختم ہو گئے تو دایہ نے کانپتے ہوئے کہا ''اے کاہن بھائی! خدا کے لیے یہ تو بتاؤ کہ میری ان غلطیوں کے سبب بچے کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں؟ میں تو اپنی قسمت کو رو رہی ہوں- میں شام کے وقت بچے کو باغ میں کیوں

لے گئی- خدا کے لیے سچ سچ بتاؤ کہ بچے کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں؟'' کاہن دایہ کو تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ''تجھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں- اس میں تیرا کوئی قصور نہیں بلکہ یہ سب حالات کا فتور ہے- کیونکہ جس وقت تو چمن کی سیر کو گئی تھی اس وقت چمن میں اک آگ سی لگی تھی- شفق آسمان پر پھوٹی ہوئی تھی- بادِ صرصر کے تند و تیز جھونکے چل رہے تھے' سوسن اپنی زبان میں عشق کی کہانی بیان کر رہی تھی- پھول اور غنچے اگر چہ ہنس رہے تھے مگر ان کی یہ ہنسی بھیانک بھیانک سی تھی- جس کی وجہ سے شور سا پیدا ہو گیا تھا- قمریاں کوکو کر رہی تھیں- سرو کا سایہ لب جو پڑ رہا تھا-''

کاہن ایک لمبا سانس لے کر خاموش ہوا پھر سر ہلا کر بولا ''پر ٹھیک ایسے وقت میں سیمرغ اور وحشت پری باغ کی سیر کو آ گئے تھے- اے دایہ! یاد کر کہ اس وقت ایک چڑیا پھر سے اڑی تھی جسے دیکھنے کو تو نے پوری گردن گھمائی تھی اور تیری گردن میں جھٹکا سا آ گیا تھا اور پھر ٹھیک ایسے وقت میں اچانک حضرت عشق کا سایہ نمودار ہوا-''

دایہ کی سمجھ میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ ''حضرت عشق'' کا نام سن کر نہایت ادب و احترام سے سر جھکا کر بیٹھ گئی جیسے وہ ''حضرت عشق'' کو تعظیم پیش کر رہی ہو-

پھر کاہن نے آواز دار لہجے میں قدرے کرختگی پیدا کرتے ہوئے کہا کہ ایسے عالم میں تیرے ننھے کی کچھ اس طرح کی کیفیت تھی کہ جب تو اسے گلاب کے قریب لے جاتی تو وہ ہنسنے لگتا اور تو اسے نرگسِ بیمار کے پاس لے جاتی تو تیری گود میں ننھا اداس ہو جاتا اور رونے لگتا-

دایہ نے بڑے نرم لہجے میں مودبانہ عرض کیا کہ اے بھائی! آخر اس مرض اور بے چینی کا کوئی علاج تو ہوگا ہی؟

''کیوں نہیں؟'' کاہن نے جواب دیا-

''اس کا علاج یہ ہے کہ بچے کو حسن وحیا کے سائے میں رکھا جائے اور اس کی پرورش پر حسین وجمیل خواصیں مقرر کی جائیں۔

(۴)

جب عبداللہ کے بیٹے ننھے قیس کی عمر پانچ سال ہوئی تو باپ نے اس کی رسم بسم اللہ بڑی دھوم دھام سے منائی۔ اس میں عبداللہ کے خاندان اور قبیلہء عامر کے بہت سے عمائدین نے بھی شرکت کی۔ قیس کے لیے ڈھیروں دعائیں دی گئیں۔ قیس کے مولوی صاحب کو ایک خوان اور ایک کشتی نذر کی گئی۔ جس میں عمامہ، رومال، عبا کے ساتھ ساتھ شیرینی اور مختلف قسم کے حلوے تھے۔ اس موقع پر ننھے قیس کے لیے لوگوں نے اجتماعی دعا کی۔

''اے اللہ تو اپنی برکت اور کرم نوازی سے اس بچے کو علم وحکمت اور فضیلت عطا فرما اور یہ دنیا میں والدین کی عزت وحرمت کا باعث ہو۔ دعا کے بعد حاضرین محفل کی شاندار دعوت ہوئی جس میں اس دور اور وقت کے طرح طرح کے کھانوں سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔

پھر دوسرے دن ننھے قیس کو محلّہ کے مکتب میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ مکتب صرف ایک کمرے میں واقع تھا اور تعلیم حاصل کرنے والے بچے اور بچیوں کی تعداد صرف چار تھی۔ قیس اور اس کا دوست اور لیلیٰ اور اس کی سہیلی مریم۔ قیس اس کم عمری میں ہی لیلیٰ کو دلچسپی سے دیکھتا اور اسے اشارے کرتا تھا۔ جس کے جواب میں لیلیٰ بھی قیس سے اشاروں کنایوں میں خاموش گفتگو کرتی تھی۔

اس مکتب ہی میں پڑھتے پڑھتے قیس اور لیلیٰ کمسنی کے دور سے گزر کر جوانی کی حدود میں داخل ہو گئے۔ اب قیس ایک خوبصورت اور بانکا جوان تھا اور لیلیٰ ایک الھڑ دوشیزہ۔ مکتب کا مولوی اگر چہ اب بوڑھا ہو گیا تھا مگر وہ مکتب کے لڑکے اور لڑکیوں پر پوری نظر رکھتا تھا اور جب کسی لڑکی اور لڑکے کو تنہائی میں گفتگو کرتے دیکھتا تو سخت ناراض ہوتا۔ چنانچہ قیس ولیلیٰ

مولوی صاحب سے ہر وقت خائف رہتے تھے۔

بچے اور بچیوں کی تعداد بڑھ جانے کی وجہ سے مولوی صاحب نے اپنے مکان کے ایک اور کمرے کو بھی اسکول میں تبدیل کر دیا تھا۔ اب یہ اسکول دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں لڑکے بیٹھتے تھے اور دوسرے میں لڑکیاں۔ دونوں کمروں کے درمیان دروازہ تھا جسے مولوی صاحب نے ایک بڑا سا تالا لگا کر بند کر دیا تھا۔ احتیاط کے طور پر بیچ کے دروازے پر دونوں طرف ٹاٹ کے پردے لگا دیے گئے تھے تاکہ لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ تعلیم حاصل کریں اور ایک دوسرے سے میل ملاپ نہ بڑھا سکیں۔

بچوں کا یہ مکتب شہر کے بڑے بازار کے ایک کونے پر تھا۔ مکتب کا مولوی ایک نیک دل مگر سخت مزاج آدمی تھا۔ اس نے مکتب میں اعلان کر دیا تھا کہ پڑھائی کے اوقات کے دوران اگر کوئی لڑکا یا لڑکی بازار میں گھومتا پھرتا نظر آیا تو پہلے تو اس کی مار مار کر ٹانگیں توڑے گا پھر اسے اسکول سے نکال باہر کرے گا۔ بچے بچیاں مولوی صاحب سے بہت ڈرتے تھے اس لیے وہ مکتب میں آتے تو تمام وقت وہاں قیدیوں کی طرح گزارتے۔ کوئی بھولے سے بھی بازار کا رخ نہ کرتا تھا۔

ان تمام احتیاطوں کے باوجود مکتب کے لڑکے اور لڑکیاں تاک جھانک سے باز نہ آتے اور موقع پاتے ہی اشاروں اور کنایوں میں گفتگو شروع کر دیتے۔ ایک دن مولوی صاحب کسی کام سے اسکول سے باہر گئے تھے۔ پس لڑکیوں اور لڑکوں کو گفت وشنید کا موقع مل گیا۔

قیس نے موقع سے فائدہ اٹھائے ہوئے درمیان کا پردہ الٹ دیا۔ دوسری سمت سامنے اسے لیلیٰ بیٹھی نظر آئی تو اس نے فوراً کہا۔

اللہ نے پھر آج وہی شکل دکھائی
پھر ہم کو وہی چاند سی صورت نظر آئی

کہتے ہیں عشق و محبت کرنے والوں کو اکثر و بیشتر الٹے سیدھے شعر کہنا آ جاتے ہیں۔ یہ حال ان دنوں قیس و لیلیٰ کا تھا۔ دونوں نے شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ چنانچہ جب قیس نے لیلیٰ کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا تو لیلیٰ کی طبیعت بھی شعر کہنے پر مائل ہوئی اور اس نے ایک شعر موزوں کیا اور قیس کے جواب میں کہا۔

وہ چشم، وہ ابرو وہ اشارہ نظر آیا
لو آج بھی ہم کو وہی پیارا نظر آیا

لیلیٰ کا شعر ختم ہوا تھا کہ اسی وقت اسکول کے مولوی صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ بچے اور بچیاں باادب ہو کر بیٹھ گئے۔ قیس مولوی صاحب کو دیکھ کر اس قدر گھبرایا کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ درمیان کا پردہ پکڑے کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

مولوی صاحب نے قیس کو پردہ پکڑے دیکھا تو گرج کر پوچھا۔

''یہ پردہ کس نے اٹھایا؟''

''میں نے نہیں اٹھایا مولوی صاحب۔'' قیس نے گھبرا کر جواب دیا۔

مولوی صاحب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہاتھ میں پکڑی ہوئی بید کی چھڑی قیس کی پیٹھ پر رسید کر دی اور بولے۔

''جھوٹا، بے ایمان تو یہ پردہ کیا تیرا باپ پکڑے کھڑا ہے؟''

اب قیس کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اس نے فوراً پردہ چھوڑ دیا اور اس طرح لڑکے اور لڑکیاں الگ الگ ہو گئے۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے قیس کی اچھی طرح خبر لی اور اسے اس قدر مارا کہ پورے بدن پر بید کے نشان پڑ گئے۔

(۵)

یہ محل سرا رئیس ابن رئیس عبدالعزیز کی ہے۔عبدالعزیز اور عبداللہ دونوں سگے بھائی ہیں اوران کے درمیان بہت میل ملاپ ہے مگران دونوں کی بیویاں یعنی قیس کی ماں اور لیلیٰ کی ماں کے درمیان ملاپ تو الگ رہا دونوں میں جیسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سخت خلاف ہیں اور ہر جگہ اور ہر شخص سے ایک دوسرے کی برائیاں کرتی ہیں۔

اس وقت محلے کی ڈومنی زہرہ جو آفت کی پرکالہ ہے وہ عبدالعزیز کی بیوی یعنی لیلیٰ کے گھر آتی ہے۔لیلیٰ کی ماں سامنے مسہری پر گاؤ تکیے کی ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔

''بیگم رئیس عبدالعزیز کو بصد ادب سلام پیش کرتی ہوں۔'' زہرہ نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔

''اللہ تم تو عید کا چاند ہوئیں زہرا۔ کہو کیسے آنا ہوا۔ میری بیٹی کی کوئی نسبت' کوئی رشتہ لائی ہو؟''

رشتے کی بات سنتے ہی جیسے زہرہ پھٹ پڑی۔ منہ بنانے کے بعد بولی۔ اے بی بی رشتے ناتے کا کیا پوچھتی ہو۔ گھر گھر لڑکیاں جوان بیٹھی ہیں۔ بے چاریوں کی مائیں غم زدہ اور پریشان ہیں۔ رشتے ناتے کا کوئی ڈول ہی نہیں پڑتا۔ ادھر لڑکیوں کے بالوں میں سفیدی پھوٹ رہی ہے اور ادھر لڑکوں کا یہ حال ہے کہ امیر زادے' امیر نہیں بلکہ منہ زور شہزادے ہیں۔ ہوا میں اڑتے ہیں۔ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتے۔ ان کی آوارگی کا یہ عالم ہے کہ ماں باپ کی زندگی ہی میں گھر کا صفایا کر دیا ہے۔ خاک اڑتی ہے گھروں میں' نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ دن رات آوارہ گردی مگر مفلس اور جیب خالی۔ محلے اور پاس پڑوس کے قرض دار خاک اڑاتے پھرتے ہیں گلی کوچوں میں۔ کوئی منہ کو نہیں لگاتا نہیں۔ ماں باپ کے ورثے دانت لگائے بیٹھے ہیں۔ ایسے یا شادی کریں گے کیسے گھر چلائیں گے۔ نہ کسی سے ڈرتے

ہیں اور نہ اللہ کا خوف کھاتے ہیں- حال یہ ہے کہ جلسے جلوسوں اور میلے ٹھیلوں میں شراب پی کے جاتے ہیں اور غل غپاڑہ مچاتے ہیں- مار پیٹ اور گالی گلوچ کرتے ہیں- جہاں کسی اکیلی دوکیلی عورت کو دیکھا اور فوراً اس کے پیچھے لگ گئے- پھر لڑائی جھگڑا' دنگا فساد-''

''سچ کہتی ہو زہرہ- بالکل سچ-'' بیگم عبدالعزیز اس کی بات کاٹ کے بولیں-

''دوسروں کو کیا الزام دیں- اپنے گھر اور خاندان میں بھی یہی حالت ہے- عزت اور حرمت کا چراغ گل ہو رہا ہے- ذرا میرے بھتیجے قیس کا حال تو دیکھو' کہنے کو تو وہ فخر خاندان ہیں- یہ ٹھیک ہے کہ ہم اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر بھتیجے کے کرتوت دیکھ کر شرم سے سر جھک جاتا ہے- ماں باپ اور سارا خاندان ان سے پیار و محبت کرتا ہے مگر ان کے لچھن دیکھو تو اللہ توبہ- قیس کو کس قدر محبت سے ماں باپ نے پالا پوسا ہے مگر لاڈ پیار نے ان کے شریفوں والے طور طریقے ہی بدل دیے ہیں- ان کے عادات واطوار شریفوں جیسے نہیں- ماں باپ ہیں کہ ان پر جان دیتے ہیں مگر صاحبزادے کا یہ عالم ہے کہ دن رات لونڈیوں باندیوں سے ٹھٹھے کرتے ہیں- انہیں سر پر بٹھاتے ہیں- والدین سب کچھ دیکھتے ہیں مگر صاحبزادے کی اصلاح کی کوئی صورت نہیں نکالتے-

زہرہ ڈومنی' بیگم عبدالعزیز کے بھتیجے کے بارے میں باتیں سنتے سنتے تنگ آ گئی مگر وہ تھیں کہ زبان کو لگام نہیں دیتی تھیں- قدرے وہی تھکیں اور انہوں نے ایک لمبا سانس لیا تو زہرہ کو موقعہ مل گیا- وہ فوراً کڑک کے بولی-

''اے بیگم اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟'' بیگم نے بڑے پیار سے جواب دیا-

''اے زہرہ تم کوئی غیر ہو؟ جو جی چاہے کہو میں ہرگز برا نہ مانوں گی-''

اس گھڑی زہرہ نے بھی ایک لمبا سانس لیا اور یوں گویا ہوئی کہ

''اے بی بی تم نے جو کچھ کہا وہ سولہ آنے درست مگر یہ تو بتاؤ کہ خود تم بچی کو اس مکتب

میں کیوں بھیجتی ہو جہاں تمہارے خیال کے مطابق قیس بھی جاتا ہے۔ جو آوارہ اور بدمعاش ہے۔ دوسرے یہ کہ اس مکتب کا ملا اور استاد مولوی عشق الدین ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ خالص دیہاتی ہے بلکہ اسے پڑھنے پڑھانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔ اب اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔

"بیگم عزیز نے فوراً سر ہلایا اور کہا۔" اے نیک بخت تم تو ہماری ہمدرد ہو۔ جو چاہے سو کہو میں ہرگز ہرگز برا نہ مانوں گی۔"

بیگم عزیز کی شہ پا کر زہرہ ڈومنی نے زبان کھولی تو پھر اس طرح اس کی زبان رواں ہوئی کہ رکنے کا نام بھی نہ لیتی تھی۔ اس نے صاف الفاظ میں کہا کہ اے بی بی تمہاری تو عقل ماری گئی ہے کہ اس مکتب اور مدرسے میں جوان جہان بچی کو پڑھنے بھیجتی ہو۔ جہاں لڑکیوں کے ساتھ لڑکے بھی پڑھتے ہیں۔ معاف کرنا بیگم تمہاری عقل پر بھی تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ تم نے کیوں غور نہیں کیا کہ جب لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھیں گی۔ ساتھ اٹھے بیٹھیں گی تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔"'

ڈومنی زہرہ تو بیگم عبدالعزیز کے دل میں یہ شک وشبہ ڈال کر رخصت ہو گئی مگر اس کے جاتے ہی بیگم عزیز کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ اس وقت لیلیٰ مکتب سے پڑھ کے واپس آئی تھی۔ بیگم عزیز نے لیلیٰ کو گھر میں داخل ہوتے دیکھا تو دور ہی سے دہاڑیں۔ "لیلیٰ ادھر آ۔ میرے پاس آ۔"

بیچاری لیلیٰ ماں کی کڑک دار آواز سن کر سہم گئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے ماں کے پاس آئی اور سہمے سہمے لہجے میں بولی۔

"اماں تم کیوں خفا ہوتی ہو؟ میں سیدھی مکتب سے آ رہی ہوں۔"

"کل سے تو مکتب نہیں جائے گی۔" اور بیگم عزیز نے نادر شاہی حکم جاری کر دیا۔

چنانچہ جب دوسرے دن وہ ماں کے حکم کے مطابق مکتب نہ گئی تو وہاں قیس کی تو دنیا ہی الٹ گئی۔ اس کے دل میں پنکھے لگ گئے۔ وہ بولایا بولایا گھومتا اور ایک ایک سے پوچھتا۔

''یارو آج لیلیٰ نہیں آئی۔ دیکھا کسی نے اسے؟'' اور ہر طرف سے صرف یہی جواب ملتا کہ ہم نہیں جانتے۔ ہم نے نہیں دیکھا۔

وہ شام کو گھر پہنچا تو ماں نے کھانے کو پوچھا مگر اس نے سر درد کا بہانہ کر کے ماں کو ٹال دیا۔ وہ رات قیس نے کروٹیں بدل بدل کر کاٹی۔ پھر ذرا دن چڑھتے ہی وہ مکتب پہنچ گیا۔ مکتب پہنچ کے اس نے یوں محسوس کیا کہ جیسے اس کے تمام دوست اس کے منتظر تھے۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جیسے آج مکتب کے حالات کچھ بدلے ہوئے ہیں۔ اس کے مکتب میں داخل ہوتے ہیں اس کے ساتھیوں نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر اس کا استقبال کیا۔ وہ پہلے ہی سے پریشان تھا دوستوں کے اس قہقہے نے اسے جیسے ہلا کر رکھ دیا۔

اس وقت طوائف زادی حنبلہ جو قیس کی ہم جماعت تھی' اس کے پاس اٹھلاتی ہوئی آئی۔ قیس پہلے ہی جلا ہوا تھا وہ اور زیادہ جل گیا۔ اس نے حنبلہ سے طنزیہ لہجے میں پوچھا کہ وہ آج کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہی ہے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟ حنبلہ نے فوراً جواب دیا کہ ہاں اس کی ایک وجہ ہے جو میں تمہیں سنانا چاہتی ہوں۔ قیس نے اسے خوش آمدید کہا اور بتایا کہ وہ آج کچھ پریشان ہے اور اگر حنبلہ اسے کوئی خوشخبری سنا رہی ہے تو وہ اس کا شکر گزار ہوگا ممکن ہے کہ وہ خوشخبری سن کر اپنی فکر بھول جائے۔

پس قیس نے حنبلہ سے درخواست کی کہ وہ جلد سے جلد اسے خوشخبری سنا کر اس کی افسردگی کو دور کرے۔ پس حنبلہ نے چبا چبا کر کہنا شروع کیا۔ قیس تمہارے لیے یہ خوشخبری ہے کہ اب تمہاری لیلیٰ اس مکتب میں نہیں آئے گی۔ قیس کی امیدوں پر جیسے پانی پڑ گیا۔ اس نے گھبرا کے پوچھا کہ آخر کوئی خاص وجہ ہے یا اس کی ماں کہیں بیمار تو نہیں ہو گئی؟

حنبلہ نے انکشاف کیا کہ لیلیٰ کی ماں بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور اس نے خود اسے یعنی حنبلہ کو بتایا ہے کہ لیلیٰ کی ماں یہ نہیں چاہتی اس کی بیٹی دشمن خاندان کے کسی لڑکے سے میل جول بڑھائے۔ قیس کو یہ سن کر افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔ اس نے حنبلہ کو بتایا کہ میں اس کا یا اس کے والدین کا دشمن کیسے ہوسکتا ہوں جبکہ لیلیٰ کا باپ اور میرے والد آپس میں سگے بھائی ہیں اور لیلیٰ اس کی سگی چچازاد بہن ہے۔

اب حنبلہ کو تعجب کا دورہ پڑا۔ اس نے کہا کہ میں تمہارے اور لیلیٰ کے رشتے کو نہیں جانتی تھی اور یہ بات بڑی حیرت کی ہے کہ لیلیٰ کی ماں تمہیں کیوں پسند نہیں کرتی کہ لیلیٰ اور تم آپس میں دوست بنو اور یہ بات آگے بڑھے۔ مگر یہ ایک حقیقت تھی قیس کے والد عبداللہ اور لیلیٰ کے والد عبدالعزیز سگے بھائی تھے مگر قیس کی ماں اور لیلیٰ کی ماں میں دور کی بھی رشتہ داری نہ تھی اور وہ ایک دوسرے کو پسند نہ کرتی تھیں۔ قیس کو اس خاندانی اختلاف کا علم تھا مگر وہ اس قدر وسیع القلب تھا کہ اس نے تو کبھی اپنے والدین سے اس سلسلہ میں کوئی گفتگو کی تھی اور نہ اس نے کبھی لیلیٰ پر یہ ظاہر ہونے دیا تھا کہ اس کی ماں اور قیس کی ماں مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے قبیلوں میں پرانی عداوت چل رہی ہے۔

بہرحال واقعہ کچھ ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ لیلیٰ کی ماں ایک شدت پسند عورت تھی اور خاندانی معاملات کے سلسلے میں وہ کسی کی رعایت نہ کرسکتی تھی۔ لیلیٰ کی پیدائش کے وقت دونوں خاندانوں کے بزرگوں نے اس بات کی کوشش کی تھی کہ لیلیٰ اور قیس کا رشتہ بچپن ہی میں اتنا استوار کردیا جائے کہ آئندہ اس میں کوئی رخنہ نہ پڑے مگر جب لیلیٰ کی والدہ کو ان باتوں کا علم ہوا تو اس نے اپنے میاں سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ قیس سے ہرگز ہرگز نہیں کرے گی۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی یا بنائی کہ قیس ایک آوارہ گرد جوان ہے اور گھر کی کنیزوں اور لونڈیوں سے عشق لڑاتا ہے۔ یہ الزام ایسا تھا جس نے لیلیٰ کے باپ

کا دل بھی قیس کی طرف سے پھیر دیا اور پھر جب ایک بار قیس کے والد نے خلوص دل سے اپنی بھتیجی لیلیٰ کا رشتہ اپنے بیٹے قیس کے لیے مانگا تو انہوں نے صاف طور پر انکار کر دیا(۱)۔

(۶)

پھر ایک دن ایسے ہوا کہ مکتب کے بند ہونے کا وقت ہو گیا۔ بچے بچیاں بغل میں بستے دبائے اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ قیس کا باپ عبداللہ گھر میں بیٹھا بیٹے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب قیس کے آنے کا وقت گزر گیا تو وہ گھبرا کر گھر سے نکل کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ کتنے ہی بچے عبداللہ کے سامنے سے گزر کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے مگر قیس واپس نہیں آیا۔

جب بہت زیادہ دیر ہو گئی تو عبداللہ نے اپنے ایک خادم کو بلا کر کہا کہ وہ بھاگ کے مکتب جائے اور دیکھے کہ قیس اب تک کیوں نہیں آیا جبکہ تمام لڑکے ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔ خادم تیز قدم اٹھاتا ہوا قیس کے مکتب پہنچا۔ اتفاق سے مولوی صاحب باہر ہی کھڑے تھے۔ خادم نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ اسکول بند ہو گیا ہے مگر قیس اب تک گھر نہیں پہنچا۔ اس پر مولوی صاحب نے بتایا کہ آج قیس نے مکتب میں ایک ایسی شرارت کی تھی کہ مولوی صاحب نے اس کی بید سے اچھی طرح دھنائی کر دی۔ اس پر قیس کو ایسا تاؤ آیا کہ اس نے اپنا بستہ اٹھایا اور مولوی صاحب سے اجازت لیے بغیر مکتب سے گھر کی طرف چل پڑا۔

خادم نے مکتب سے آ کر مالک کو اس بات سے آگاہ کیا تو عبداللہ پریشان ہو گئے

۱۔ اس سلسلے میں یہ کہنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ ہماری اس تمثیل یا افسانہ کی بنیاد مرزا ہادی رسوا کے غنائیہ منظوم مرقع لیلیٰ مجنوں پر رکھی گئی ہے۔ جس میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ قیس کے والد عبداللہ اور لیلیٰ کے والد عبدالعزیز آپس میں سگے بھائی تھے لیکن ان دونوں کی بیویاں ایسے قبیلوں سے تعلق رکھتی تھیں جو ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ چنانچہ یہ رشتہ اسی لیے نہ ہو سکا کہ (شاید) دونوں کی ماؤں نے اس کی مخالفت کی اور پھر اس کا وہ نتیجہ نکلا جسے آپ آگے پڑھیں گے۔

کیونکہ بیٹا گھر کو واپس نہیں آیا تھا اور پتہ نہیں کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ عبداللہ اسی فکر اور پریشانی میں الجھے ہوئے تھے کہ قیس کا ایک خاص الخاص دوست طرار آ گیا۔ عبداللہ نے طرار سے پوچھا کہ تم نے قیس کو تو نہیں دیکھا وہ مکتب سے اب تک گھر نہیں آیا۔ میں نے خادم کو مکتب بھیج کر معلوم کر لیا تھا تو مولوی صاحب نے بتایا کہ قیس نے مکتب میں شرارت کی تھی جس پر مولوی صاحب نے اس کی بید سے خبر لی۔ قیس مار کھا کر کچھ ایسا دل برداشتہ ہوا کہ بستہ اٹھا کر مکتب سے چل پڑا مگر اب تک وہ گھر نہیں پہنچا۔

طرار بھی یہ سن کر فکر مند ہو گیا۔ عبداللہ نے طرار سے پوچھا کہ بیٹے طرار سچ سچ بتاؤ قیس تو مکتب کو بڑے شوق سے جاتا تھا۔ یہ اچانک اسے کیا ہو گیا کہ اس نے اسکول میں شرارتیں شروع کر دیں اور جب مولوی صاحب نے اسے سزا دی تو وہ بستہ اٹھا کر پتہ نہیں کس طرف چلا گیا۔

طرار کا فوراً ماتھا ٹھنکا۔ پہلے تو اس نے بتانے سے آنا کانی کی مگر جب عبداللہ نے بہت زور دیا تو اس نے صاف طور پر بتا دیا کہ قیس کو لیلیٰ سے پیار ہو گیا ہے اور وہ دن بھر اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ مولوی صاحب نے اسے اس بات پر پہلے بھی مارا تھا اور آج بھی اسی لیے مارا ہو گا۔ عبداللہ یہ سن کر سن پڑ گئے۔ ان کو افسوس تو ہوا مگر اکلوتے بیٹے کی بھی فکر پڑ گئی۔

عبداللہ نے طرار کو تو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔ پھر بیٹے کی محبت نے زور مارا تو اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے تو انسان کو خدا بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ عبداللہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر بیٹے تک پہنچ گئے مگر بیٹے کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

قیس کا یہ عالم تھا کہ سر جھاڑ منہ پہاڑ۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ عبداللہ سمجھدار تھے۔ بیٹے کو ڈانٹنے' پھٹکارنے کے بجائے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھا اور سمجھانے کے انداز میں کہا۔

’’جوانی میں محبت سب ہی کرتے ہیں۔تم نے لیلیٰ کو چاہا تو کچھ برا نہیں کیا مگر ہم سے کیا شرم۔لیلیٰ جوان ہے، خوبصورت ہے اور میرے بھائی کی بیٹی ہے۔ مجھے بھی لیلیٰ پسند ہے۔تم نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے کم از کم مجھ سے تو کہا ہوتا۔لڑکے تو لڑکے آج کل تو لڑکیاں بھی محبت کی باتیں اپنی ماں کو بتا دیا کرتی ہیں۔‘‘

اس طرح عبداللہ بیٹے کو سمجھا بجھا کر گھر لے آئے۔ ماں کو معلوم ہوا تو اس نے بیٹے کو خوب بھینچ بھینچ کر سینے سے لگایا اور تسلی دی کہ فکر کی کیا بات ہے۔ میں کل ہی تیرے باپ کو عبدالعزیز کے پاس بھیجتی ہوں۔ آخر لیلیٰ بھی تو ہماری بیٹی ہی کی طرح ہے پھر وہ اپنے خاندان کی بچی ہے۔ اس سے بہتر رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ پھر دوسرے دن عبداللہ بیٹے کا پیغام لے کر بھائی کے گھر پہنچے۔عبدالعزیز نے قیس کا پیغام ٹھنڈے دل سے سنا اور جواب میں کہا کہ بھائی میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ آخر ہم سب کا ایک ہی خون ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ میری بیوی یعنی قیس کی چچی قیس کو پسند نہیں کرتی۔ اس طرح میں مجبور ہوں۔

عبداللہ نے بیٹے کی خاطر بھائی کی بہت خوشامد در آمد کی بلکہ اس کے سامنے ہاتھ تک جوڑے مگر عبدالعزیز بیوی کے خوف کی وجہ سے ہاں نہ کر سکے اور عبداللہ کو ناکام اور نامراد واپس آنا پڑا۔

عبدالعزیز نے قیس پر یہ الزام بھی لگایا کہ قیس کی طبیعت میں شوریدگی ہے اور وہ بدتہذیب ہے۔ اس نے میری بیٹی کو مکتب کے اندر اور باہر تک بدنام کر دیا ہے۔قیس کو پہلے ہی پتہ تھا کہ اس کا چچا اور اس سے زیادہ ظالم اس کی چچی اس کے رشتے کو منظور نہیں کریں گے۔ اس نے اس کا ذکر اب تک اپنے والدین سے نہیں کیا تھا۔

قیس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس پر دیوانگی سی طاری ہو گئی اور وہ گریباں چاک کر کے صحرا کی طرف چل پڑا۔قیس پر واقعی دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ چلتے چلتے رکتا پھر چلنے لگتا۔ کہیں وہ

دل سے باتیں کرنے لگتا اور کہتا۔

راستہ دشت کا اے وحشت دل تو ہی بتا

کس کے کہنے پہ چلوں حسرتِ دل تو ہی بتا

ادھر قیس جنگل جنگل پھر رہا تھا اور ادھر بیچاری لیلیٰ' اس کی یاد میں رات رات بھر جاگتی اور آنسو بہاتی تھی۔

قیس کے بارے میں ایک کتاب میں لکھا گیا ہے کہ جب قیس جنگل اور بیابانوں میں ہائے لیلیٰ وائے لیلیٰ کہتا مارا مارا پھر رہا تھا اس وقت ادھر سے روم کا سلطان نوفل مع اپنے وزیر اور اراکین سلطنت کے گزرا۔ کسی امیر وزیر نے سلطانِ روم کو قیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اے سلطان یہی وہ قیس ہے جس کے عشق کے چرچے آج کل گلی کوچوں میں ہوتے ہیں۔ سلطان نوفل ایک رحم دل انسان تھا۔ اس نے اپنے وزیر سے پوچھا کہ کیا یہ وہی دیوانہ قیس ہے جسے لوگ مجنوں کے نام سے پکارتے ہیں اگر یہ وہی ہے تو اسے میرے پاس لاؤ۔ مجھے اس سے ملنے کی بہت آرزو تھی کیونکہ فراقِ یار کی تلخیوں اور اداسیوں کو اس سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔ سلطان کے امیر وزیر بہلا پھسلا کے قیس کو سلطان کے روبرو لے آئے۔

سلطان نے قیس سے کہا کہ ''اے غافل تو ہوش میں آ اور میری بات سن۔ میں تیری محبوبہ لیلیٰ کا نامہ بر ہوں۔ تو آنکھیں کھول اور اپنے محبوب کا خط مجھ سے لے اور اس کے حال واحوال سے واقف ہو۔''

قیس یہ بات سن کر خوشی سے دیوانہ ہو گیا' اس نے سلطان سے کہا۔

''اگر تو سلطان ہے تو بھی تو میرے لیے لیلیٰ کے قاصد سے بڑا نہیں۔ بہر حال تو مجھے یہ بتا کہ تو میرے یا میری لیلیٰ کے لیے کیا کر سکتا ہے؟''

سلطان اسے تسلی دیتا اور کہتا ہے کہ تو بالکل فکر نہ کر اور میرے ساتھ چل- میں تجھے تیری لیلیٰ سے ملا دوں گا-

پس قیس، وزیر سلطنت کے ساتھ سلطان کے خیمے پر آتا ہے- وہاں شراب کا دور چلتا ہے مگر قیس انکار کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ محبوب کی جدائی میں شراب و کباب میں لطف نہیں- سلطان کہتا ہے کہ مت گھبرا، میں ابھی لیلیٰ کے باپ کو اپنے حضور طلب کرتا ہوں اور اسے حکم دیتا ہوں کہ وہ اپنی بیٹی لیلیٰ کا تیرے ساتھ نکاح کر دے- چنانچہ سلطان اپنے ہرکارے بھیج کے لیلیٰ کے باپ عبدالعزیز کو اپنی حضور طلب کرتا ہے- جب عبدالعزیز، سلطان کے پاس پہنچتا ہے تو سلطان اسے حکم دیتا ہے کہ اپنی بیٹی کا عقد قیس سے کر دے-

لیلیٰ کا باپ سلطان کو سخت لہجے میں جواب دیتا ہے کہ قیس ایک آوارہ مزاج جوان ہے اور اس کا چال چلن درست نہیں اس لیے میں اور میری قوم اس رشتے کو پسند نہیں کرتے- اس لیے ان دونوں کا ملاپ نہیں ہو سکتا- سلطان اسے ڈراتا، دھمکاتا ہے مگر لیلیٰ کا باپ کسی طرح رضامند نہیں ہوتا اور صاف الفاظ میں کہہ دیتا ہے کہ عرب قوم سوائے خدا کے اور کسی سے نہیں ڈرتے-

سلطان اپنے وزیر کو بتاتا ہے کہ لیلیٰ کا باپ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا- پتہ نہیں لیلیٰ کی صورت میں کیا لعل لگے ہیں جو اس کا باپ کسی سے سیدھے منہ بات تک نہیں کرتا- پس سلطان اپنے وزیر کے مشورے سے قیس کو اپنے دربار میں بلواتا ہے اور اس کے سامنے اپنے محل کی تمام خوبصورت کنیزوں کو پیش کرتا ہے- پھر قیس سے کہتا ہے کہ اگرچہ مجھے یہ تمام کنیزیں بہت عزیز ہیں مگر میں انہیں تیرے سامنے پیش کرتا ہوں تو لیلیٰ کا خیال چھوڑ دے اور ان کنیزوں میں سے تجھے جو کنیز پسند ہو میں اسے تیرے حوالے کر دوں گا-

قیس، سلطان کی اس پیشکش کو بھی ٹھکرا دیتا ہے اور دیوانگی کے عالم میں سلطان کے

دربار سے نکل کر یہ کہتا ہوا جنگل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

میری آنکھوں سے مرے یار کا جلوہ دیکھے
دیدۂ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

(۷)

گریباں چاک اور خاک بہ سر قیس مارا مارا پھرتا آخر کوچہء جاناں یعنی لیلیٰ کی گلی میں جا پہنچتا ہے۔ لیلیٰ اس وقت مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ اس کی نظر جو قیس پر پڑتی ہے تو دوڑ کے ڈیوڑھی میں آجاتی ہے اور دروازہ کھول کر اپنے عاشق زار کو دیکھتی ہے۔ قیس بھی اسے ٹکٹکی باندھ کے دیکھتا ہے۔

لیلیٰ اس سے درخواست کرتی ہے کہ وہ جس قدر جلد ہو سکے نجد کے علاقے سے نکل کر کسی اور طرف چلا جائے اور اس کے باپ کو خبر نہ ہونے پائے۔ قیس اس کی اس درخواست کو رد نہ کر سکا اور محبوب سے کوئی گفتگو کیے بغیر ہی وہاں سے روانہ ہو کر پھر جنگل کی طرف نکل گیا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ سرزمین عرب کو مکہ اور مدینہ جیسے عظیم اور متبرک شہروں کو اپنے دامن میں سنبھالنے کا فخر حاصل ہے مگر ملک عرب کے قبائل دنیا کے جاہل ترین لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف قوم پرست تھے بلکہ فرقہ اور قبیلہ پرست بھی تھے۔ قارئین نے ملک عرب کی تاریخ پڑھی ہو گی تو یہ ضرور پڑھا ہو گا کہ ملک عرب کے دو قبیلے' اوس اور خزرج دو ایسے مخالف قبیلے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کے درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں لوگوں کو محض قبیلہ پرستی کی بنا پر قتل کر دیا تھا اور ان کی یہ دشمنی نسل در نسل چلتی رہی تھی۔

چونکہ قیس بھی ایک عرب تھا اور وہ بھی دوسروں کی طرح قوم پرست اور فرقہ پرست تھا

اس بنا پر وہ دوسرے قبائل کی نفرت سے بھی واقف تھا- چنانچہ اس نے یہی مناسب جانا کہ لیلیٰ کے کہنے پر عمل کرے اور نہ صرف لیلیٰ کے کوچہ ہی کو بلکہ اس شہر کو بھی خیر باد کہہ دے تاکہ اس پر یا اس کی محبوبہ پر مزید کوئی ظلم وستم نہ ہو سکے-

قیس وہاں سے تو چلا جاتا ہے مگر اس کے جانے کے بعد اس کی محبوبہ لیلیٰ کا جو حال ہوتا ہے اس کے بیان سے ہی قلم کانپنے لگتا ہے- ادھر تو لیلیٰ اس کی جدائی میں تڑپ رہی ہے اور ادھر قیس کی حالت بھی ناقابل بیان ہے- وہ جس وحشت ناک فضا سے بھاگا تھا قسمت اسے پھر وہیں لے آئی تھی-

قیس کا بیچارہ غریب اور دل گرفتہ باپ اسے ڈھونڈتا اور ٹھوکریں کھاتا ہوا آخر نجد کے اس صحرا میں پہنچتا ہے جہاں قیس تنہائی میں اپنے دردوغم کو سینے سے لگائے پڑا رہتا ہے- باپ کو دیکھ کر قیس کی آنکھیں بھر آتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں-

قیس عشق لیلیٰ میں اس قدر حواس باختہ ہو چکا ہے کہ باپ کو بھی بڑی مشکل سے پہچانتا ہے جبکہ باپ اس سے شکوہ کرتا ہے کہ اے نادان! تو لیلیٰ کے عشق میں اس قدر مدہوش ہے کہ اپنے باپ کو بھی مشکل سے پہچان پایا ہے- جبکہ ماں باپ کی خدمت تیرا فرض ہے-

پھر باپ اسے سمجھاتا ہے کہ وہ عشق و عاشقی کے جھگڑوں کو چھوڑ کر اللہ سے لو لگائے- اگر اس پر عشق کا بھوت سوار ہے اور وہ عشق ہی کرنا چاہتا ہے تو اپنے اللہ سے' اپنے مولا سے اور اس دنیا کے رکھوالے سے عشق کرے-

مگر قیس کو تو عشق لیلیٰ میں اپنے تن من کا بھی ہوش نہیں- پھر وہ باپ کی بات پر کیا توجہ دے- آخر کار باپ بھی اس کو بے یارومددگار چھوڑ کے چلا جاتا ہے- دوسری جانب عبدالعزیز کی بیٹی لیلیٰ اپنے محبوب قیس کے عشق میں فیل مچاتی ہے اور بار بار گھر سے نکلنے کی کوشش کرتی

ہے۔ آخر باپ مجبور ہو کر لیلیٰ کے پیروں میں زنجیریں ڈال دیتا ہے۔ لیلیٰ بہت دہائیاں دیتی ہے مگر اسے آزاد نہیں کیا جاتا۔ ایک بار لیلیٰ کو بھاگنے کا موقع مل جاتا ہے تو قیس قیس کے نعرے لگاتی گلی کوچوں میں پھرتی ہے۔

کچھ عرصہ بعد لیلیٰ کا عشق اور زور مارتا ہے تو وہ کوچہ و بازار چھوڑ کے قیس کی تلاش میں صحرا کا رخ کرتی ہے اور اس کے منہ پر ہر وقت یہ شعر رہتا ہے۔

پھراتا ہے جنوں صحرا بہ صحرا
بہارِ باغ کو جوگن بنا کر

دوسری جانب قیس اپنی محبوبہ کی یاد میں "انا لیلیٰ، انا لیلیٰ" کے نعرے لگاتا گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ مختصر یہ کہ لیلیٰ، عشق قیس میں اور قیس عشق لیلیٰ میں دیوانے ہو جاتے ہیں۔ انہیں تن بدن اور عزت و آبرو کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ لیلیٰ کی ماں بیٹی کی تلاش میں کوچہ و بازار میں پھر رہی ہے کہ اچانک اسے ایک طرف سے لیلیٰ آتی دکھائی دیتی ہے۔ بیچاری ماں دوڑ کے بیٹی کو پکڑ لیتی ہے اور اسے سینے سے لگا کر خوب بھینچتی ہے۔ پھر اسے سمجھاتی ہے کہ اے بیٹی! کچھ اپنی اور اپنے خاندان والوں کی عزت و حرمت کا خیال کر اور گھر چل کے شریف بہو بیٹیوں کی طرح زندگی گزار۔ ماں یہ بھی کہتی ہے کہ تو اگر خاموش ہو کے گھر بیٹھ جائے گی تو میں تیرے قیس کو ڈھونڈ کر پاس لے آؤں گی۔ بگڑے عزیزوں کو مناؤں گی اور تیری شادی قیس سے کر دوں گی۔ مگر لیلیٰ اپنی دیوانگی میں کچھ نہیں سنتی اور دیوانوں کی طرح در بدر پھرنے لگتی ہے۔

مختصر یہ کہ قیس و لیلیٰ ایک دوسرے کے عشق میں دیوانے ہو جاتے ہیں۔ قیس کا بوڑھا باپ بیٹے کو ڈھونڈتا ہوا صحرا میں آخر اس غار تک پہنچ جاتا ہے جہاں قیس تنہائی میں اپنے درد و غم کو سینے سے لگائے پڑا رہتا ہے۔ باپ کو دیکھ کر قیس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ دونوں ایک

دوسرے سے چمٹ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر روتے ہیں۔قیس کہتا ہے کہ اے میرے باپ میری دیوانگی نے تیرا حال تباہ کر دیا ہے۔میں دین دنیا کو بالکل بھول گیا ہوں۔وہ ابھی اتنا ہی کہہ پاتا ہے کہ اس پر پھر دیوانگی کا دورہ پڑ جاتا ہے اور وہ ''ہائے لیلیٰ'' کے نعرے بلند کرنا شروع کر دیتا ہے۔

جب قیس گلی کوچوں میں ہائے لیلیٰ کے نعرے لگاتا ہے تو مجمعے کے شریر بچے اسے پتھر اور روڑے مارتے ہیں۔قیس زخمی ہو جاتا ہے۔اس کے بدن سے خون بہتا ہے مگر وہ ہر چیز سے بے پروا ہو کر لیلیٰ اور صرف لیلیٰ کو یاد کرتا ہے اور اس کے ہی نعرے بلند کرتا ہے۔

(۸)

ایک مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ لیلیٰ کی ماں، لیلیٰ کو اس دیوانگی کے عالم میں کھینچ کھانچ کر اور چند عورتوں کی مدد سے گھر لے آتی ہے۔لیکن لیلیٰ گھر پہنچتے پہنچتے بے ہوش ہو جاتی ہے۔وہ کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد جب ہوش میں آتی ہے تو چیخ کر پوچھتی ہے۔

''یہاں کون لایا ہے مجھے؟'' غریب ماں جواب دیتی ہے کہ بیٹی یہ میری خطا اور قصور ہے۔لیلیٰ بگڑ کر کہتی ہے کہ تم مجھے کیوں ستاتی ہو؟ غریب ماں کا دل بھر آتا ہے اور وہ خوشامد کرتی ہے کہ بیٹی۔خود پر اور مجھ پر ظلم نہ کر اپنے خاندان والوں کی عزت کا خیال کر۔یہ دیوانگی چھوڑ و اور نیک لڑکیوں کی طرح چپ ہو کے گھر میں بیٹھو۔

لیلیٰ ماں کو تو کچھ جواب نہیں دیتی اور بظاہر منہ چھپا کر ایک طرف پڑ رہتی ہے مگر رات ہوتے ہی جب سب سو جاتے ہیں تو گھر سے نکل کھڑی ہوتی ہے اور اس کی زبان پر قیس اور قیس کا نعرہ ہوتا ہے اور گلی کوچوں میں چکر لگاتی پھرتی ہے۔لوگ اس کی دیوانگی کو دیکھتے ہیں تو اس کی اور اس کے والدین کی قسمت پر روتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں۔

آخر لیلیٰ، اپنے عاشق صادق قیس کے فراق میں بستر مرگ پر پہنچ جاتی ہے مگر بڑی

جرات اور ہمت سے کہتی ہے۔

''میں موت کے قریب ہوں مگر میرا مرض لاعلاج ہے اور کوئی بھی میرا علاج اور درماں نہیں کر سکتا۔ میں نے محبت کی ہے۔ میں نے عشق کا آزار خود مول لیا ہے۔ اس لیے نہ تو میں عشق سے گھبراتی ہوں اور نہ موت سے ڈرتی ہوں۔''

خیال رہے کہ لیلیٰ اور قیس کے ملاپ اور وصال میں کوئی امر مانع نہ تھا سوائے چند تعصب اور نفاق کے جو اس گھرانے اور قبیلے میں پائے جاتے تھے۔ کوئی امر شرعی بھی ان دونوں کے درمیان مانع نہ تھا۔ رفتہ رفتہ لیلیٰ اور قیس دونوں ہی بستر سے لگ گئے بلکہ بستر مرگ پر پڑ گئے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ ایک دن قیس کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور اس نے لمبے لمبے سانس لینا شروع کیے تو کسی نے گھبرا کے پوچھا کہ اے قیس تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ قیس نے جواب میں کہا کہ میں تو اچھا ہوں مگر مجھے آج اپنے محبوب یعنی لیلیٰ کی طبیعت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ کسی نے سوال کیا کہ آخر یہ تم نے کیسے جانا تو قیس نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا کہ اے دوست آج مجھے ہوا میں کافور کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ پتہ نہیں میری لیلیٰ کا کیا حال ہے۔

ایک اور مصنف نے بیان کیا ہے کہ جب قیس (مجنوں) کو لیلیٰ کی موت کی خبر وادیٔ نجد میں پہنچی تو وہ روتا پیٹتا' حالت زار دلِ بے قرار لیے لیلیٰ کی طرف چل پڑا اور پوچھتا پاچھتا اس مقام پر پہنچا جہاں لیلیٰ کے قیام کے متعلق اس نے لوگوں سے سنا تھا۔ اس وقت لیلیٰ کا قیس کی جدائی میں انتقال ہو چکا تھا اور اسے دفن کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے قیس کو وہاں کے قبرستان کا بھی پتہ نہیں بتایا کہ ایسا نہ ہو کہ قیس اس کی قبر پر پہنچ کر خود اپنا بھی خاتمہ کر دے۔ قبرستان کا پتہ نہ بتانے والوں میں لیلیٰ کے عزیز و اقارب پیش پیش تھے۔ وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ قیس لیلیٰ کی قبر پر پہنچ کر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھے جس سے لیلیٰ اور اس کے خاندان والوں کی

اور زیادہ بدنامی ہو۔

مگر قیس نے آخر کسی نہ کسی طرح لیلیٰ کی قبر دریافت کر لی۔ پھر جب وہ اس کی قبر پر پہنچا تو اس نے یہ شعر پڑھا۔

''اور لوگوں نے چاہا کہ اس کی (لیلیٰ) قبر کو اس کی محبت (عاشق) سے
چھپا ڈالیں۔ مگر لیلیٰ کی بوئے خاک نے قیس کی رہنمائی کی۔''

اس طرح قیس لیلیٰ کی قبر کا مجاور بن گیا اور چند دن بعد ہی موت سے دو چار ہو کر لیلیٰ کے برابر مدفون ہوا۔

شیریں فرہاد

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے آئی صدائے واویلا

سرزمین ایران کا محبت آفرین قصہ جو آج بھی اہلِ دل کے لئے وجہ کشش ہے

شیریں ایک بادشاہ زادی تھی۔ اس کے ملک خیال کی رعایا خوش حال اور فارغ البال تھی۔ کیا شہر اور کیا دیہات ہر جگہ فارغ البالی اور خوشحالی تھی۔ ہر شخص خوش و خرم اور شاداں و فرحاں دکھائی دیتا تھا مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ یہ دنیا اگر کسی کے لیے خوشیوں کا گہوارہ ہے تو دوسروں کے لیے غموں اور مصائب کا ٹھکانہ بھی ہے۔ شہزادی شیریں کا باپ ایک بڑا بادشاہ اور دنیا کے عظیم لوگوں میں شمار ہوتا تھا مگر اس خوش حالی اور فارغ البالی میں بھی یہ بادشاہ خود کو فقیروں سے زیادہ غریب اور قلاش سمجھتا تھا اس لیے کہ شادی کو تیرہ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ بے اولاد تھا اور اس کی ملکہ کی گود ہری نہ ہوئی تھی۔

کون سی دعا و تعویذ تھا جو بادشاہ نے نہ کیا ہو اور کون سا وہ آستانہ تھا جہاں بادشاہ نے سجدے نہ گزارے ہوں۔ پیر و فقیر کا بادشاہ پجاری تھا اور اس کے محل کے سامنے مانگنے والوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ وہ سب کو نوازتا تھا' سب کے دامن بھرتا تھا مگر اس کا دامن اب تک خالی تھا۔ پتہ نہیں خدا کی کیا مرضی تھی کہ اس نے اس نیک دل اور نیک مزاج بادشاہ کو اولاد کی نعمت سے اب تک محروم رکھا تھا۔

پھر پتہ نہیں اس بادشاہ کے دارالسلطنت میں ایک بڑھیا کہاں سے آ گئی- اس کا ایسا چرچا اور غلغلہ اٹھا کہ دنیا اس کے پیچھے لگ گئی- جہاں دیکھو بڑھیا کا قصہ- جس سے پوچھو وہ بڑھیا کا نام لیتا تھا- شاید ان بڑی بی میں کچھ کمال بھی تھا کہ وہ جس کے لیے ہاتھ پھیلا کے دعا کرتی اس کی دعا قبول ہو جاتی تھی- شدہ شدہ یہ خبر شیریں کے باپ کے کانوں تک بھی پہنچی-

پھر کیا تھا- ملک کا بادشاہ اور ملکہ دونوں اس بڑی بی کی کٹیا پر پہنچ گئے اور ہاتھ جوڑ کے بڑی بی سے دعا کی درخواست کی-

''مجھے اولاد چاہیے بڑی اماں'' بادشاہ اس بڑھیا کے سامنے گڑگڑایا

بڑی بی نے بادشاہ کو گھور کر دیکھا تو بادشاہ سہم گیا-

''اولاد لے کر کیا کرے گا؟'' بڑی بی بڑبڑائیں

''میرے بعد تخت پر کون بیٹھے گا؟'' بادشاہ جلدی سے بولا-

''تو اپنی فکر کر- مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ سوچنا تیرا کام نہیں-'' بڑی بی نے صاف جواب دے دیا-

''مگر......'' اور بادشاہ نے رقت بھرے لہجے میں بڑی بی کے پیر پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھائے-

''نا......نا......ایسا نہ کر-'' بڑی بی نے پیر کھینچ لیے-''بادشاہ ہاتھ نہیں پھیلایا کرتے اور نہ کسی کے پیر چھوتے ہیں-''

بادشاہ کا دل بھر آیا- شاید آنسو بھی نکل آئے-

''اچھا......'' بڑی بی کو جیسے رحم آ گیا-''جا......میں خدا سے دعا کروں گی''

اور یہ شیریں ان بڑی بی کی دعاؤں کا نتیجہ تھی-

شیریں کا بچپن بھی دوسری بچیوں کی طرح شہزادیوں کی طرز پر گزرا۔ شیریں اور فرہاد کا قصہ ایک دل پسند عوامی قصہ اور داستان ہے اور اس قصے کے لکھنے والوں نے شیریں کو شہزادی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بات درست بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس قصے میں آگے چل کر بتایا گیا ہے کہ ''شیریں'' کی قیامت خیز جوانی کے دور ونزدیک ایسے چرچے پھیلے تھے کہ یہ قصے عوام سے گزر کر خواص یعنی شاہی محلوں تک پہنچ گئے تھے اور شیریں کی جوانی ہی نے ایران کے بادشاہ بلکہ شہنشاہ خسرو پرویز کو شیریں کا ان دیکھے والا شیدا بنا دیا تھا اور اس نے اپنے وزیر ''شاہ پور'' کے ذریعے شیریں کے باپ کو ''شیریں'' کے ساتھ شادی کا پیغام بھیجا تھا جسے شیریں کے باپ نے قبول کیا اور شہزادی شیریں کو خسرو پرویز کے ملک میں بھیج دیا کہ وہ شیریں سے شادی کرے۔

اس وقت کا یہ دستور تھا کہ بادشاہ وقت جس عورت سے شادی کی خواہش کرتا اسے شاہی پہرے اور باجے گاجے میں بادشاہ کے پاس بھیج دیا جاتا اور وہ شاہی محل میں اس وقت تک قیام کرتی جب تک بادشاہ اس سے باقاعدہ شادی کر کے بیوی نہ بنا لیتا۔ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا کہ شیریں کو بھی شاہ ایران کے محل میں شادی کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔

شیریں کے سلسلے میں تمام لکھاریوں نے یہی لکھا ہے کہ وہ بلا کی حسین وجمیل تھی اور شاہ ایران نے شیریں کو شادی کے لیے اپنے شاہی محل میں منگوا لیا تھا۔ بہرحال اس طرح کے تذکروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شیریں نہ صرف یہ کہ شکل وصورت سے شہزادی لگتی تھی بلکہ وہ خاندانی طور پر بھی شہزادی تھی جس کی شادی کے لیے خسرو پرویز نے اپنے وزیر شاپور کی معرفت شیریں کے والدین کو شادی کا پیغام بھجوایا تھا۔

شیریں شہزادی یا رئیس زادی تھی کہ نہیں اس سے قطع نظر یہ بات ثابت ہے کہ وہ حد درجہ خوبصورت تھی اور اس کی پیدائش ایک ضعیفہ کی دعاؤں کا نتیجہ تھی۔ شیریں کے باپ کو

جب معلوم ہوا کہ اس کے گھر ایک چاند سی بیٹی پیدا ہوئی ہے تو اس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس کی ویران دنیا بس گئی ہے۔ پورے ملک میں جشن منائے گئے اور پورے ایک ماہ تک خوب خوب خوشیاں منائی گئیں۔

جب شیریں ذرا بڑی اور سمجھدار ہوئی تو باپ نے اس کی تعلیم و تربیت کے لیے ہوشیار اساتذہ مقرر کیے۔ چنانچہ شیریں نہایت اعلیٰ تعلیم اور تربیت حاصل کر کے اپنی سہیلیوں میں ممتاز ہو گئی۔ اس پر اس کا حسن خداداد چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ مرد تو مرد لڑکیاں اور عورتیں بھی شیریں کے حسن جہاں تاب دیکھتی تو دیکھتی ہی رہ جاتیں۔

شیریں تعلیم و تربیت میں دلچسپی لینے کے ساتھ ساتھ بڑی ہنس مکھ اور خوش مزاج تھی۔ چنانچہ اس کی بے فکر ہم جولیاں اسے گھیر لیتیں اور پھر شیریں لڑکیوں میں مل کر ایسی دھما چوکڑی مچاتی کہ قیامت سی برپا ہو جاتی۔ تمام دن اور آدھی رات تک شیریں سہیلیوں کے ساتھ دھما چوکڑی مچاتی اور خوش فعلیاں کرتی تھی۔

پھر شیریں پر وہ وقت آیا جس کے لیے کہا گیا ہے کہ

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

چنانچہ شیریں کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ شیریں چندے آفتاب اور چندے ماہتاب تو تھی ہی اس کے حسن و جمال اور سلیقہ مندی کے چرچے اس کے ملک سے نکل کر دوسرے ملکوں تک پہنچ گئے۔ اب اس کے لیے ملک اور بیرون ملک سے رشتے آنا شروع ہو گئے۔ شیریں کی خوبصورتی ضرب المثل بنتی جا رہی تھی اور ملک ملک میں اس کے حسن و جمال کے چرچے تھے۔

اس زمانے میں دو حکومتیں یا بادشاہتیں بہت مشہور تھیں۔ یہ سلطنتیں قیصر و کسریٰ کی

تھیں- روم کے بادشاہ' قیصر اور ایران کے تاجدار کسریٰ کے نام سے پکارے جاتے تھے- شیریں کے ملک کے قریب میں عظیم ایرانی سلطنت تھی اور اس وقت ایران کے تخت وتاج کا مالک نوشیرواں کا بیٹا خسرو پرویز تھا- خسرو پرویز کی شادی اگرچہ قیصر روم کی بیٹی سے ہو چکی تھی جس کے بطن سے خسرو پرویز کا ایک بیٹا شیرویہ تھا- مگر اس دور میں بادشاہوں کی درجنوں ملکائیں اور سینکڑوں داشتائیں ہوا کرتی تھیں- خسرو پرویز اگرچہ زیادہ عمر کا نہ تھا لیکن اسے بیویاں اور ملکائیں بنانے کا شاید تمام بادشاہوں اور تاجداروں سے زیادہ ہی شوق تھا- وہ کئی بیویوں اور ملکاؤں کو شاہی محلات یا شاہی محلوں میں بسا اور اجاڑ چکا تھا- خسرو پرویز کو ہر دوسرے سال نئی بیوی اور ملکہ چاہیے تھی اور اس سلسلے میں خسرو پرویز نے باقاعدہ ایک محکمہ یا وزارت قائم کر رکھی تھی جس کا مقصد اور مطلب شاہ ایران کسریٰ خسرو پرویز کے لیے حسین اور خوبصورت ملکاؤں اور داشتاؤں کی تلاش اور شاہ ایران کے لیے نئے نئے چہروں کی تلاش اور انہیں محلات شاہی اور شاہی محلوں کی رونق بنانا تھا-

مگر یہ کچھ عجیب اتفاق تھا کہ موجودہ شاہ ایران یا شہنشاہ ایران نے شاید غلطی سے قیصر روم کی بیٹی سے رشتہ جوڑ لیا تھا- اس وقت کے قیصر روم کی بیٹی دنیا کی حسین ترین حسیناؤں میں سے ایک تھی اور شاہ ایران کسریٰ خسرو پرویز نے اس کے حسن کا چرچا درباریوں اور خاص کر اپنے وزیر اعظم سے سنا تھا- یہ چالاک اور شاطر وزیر اعظم' ایران کی وزارت حسن و جوانی کا افسر اعلیٰ بھی تھا- اس نے دنیا کے گوشوں تک میں جاسوس مرد اور عورتیں اس کام پر لگا رکھی تھیں کہ وہ ملک ملک کی حسین دوشیزائیوں کو تلاش کریں اور ان حسین دوشیزاؤں کو مصوروں اور سنگتراشوں کے حضور پیش کریں پھر ان کی تصاویر بنوا کر وزیر شاپور کے حضور بھجوائیں-

اس طرح شاپور کے ماتحت ''وزارتِ حسن وعشق'' میں ہر سال سینکڑوں حسینائیوں کی

رنگین اور کاغذی اور پتھریلی تصاویر وزیر تک پہنچتی تھیں۔ جن میں سے وزیر شاہ پور ہر دو سال بعد صرف ایک حسینہ کی پتھریلی یا کاغذی تصویر کو پسند کرتا پھر ملک مذکور میں پہنچ کر اس حسینہ کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور اس سے ہم کلام ہو کر پہلے خود مطمئن ہوتا اس کے بعد اس تصویر کو بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔ اگر شاہ ایران (کسریٰ) اور وزیر شاہ پور کسی تصویر پر متفق ہو جاتے تو فوراً شاپور اس حسینہ کے لیے شاہ ایران کسریٰ خسرو پرویز کی شادی کا پیغام لے کر جاتا اور اس زمانہ کے دستور کے مطابق اس حسینہ کو ملکہ ایران کے طور پر بیاہ کے لیے خسرو پرویز کے پاس لے آتا۔

ایسی شادی پر انکار اور اقرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ عام طور پر شاہ پور کی پسند کو ترجیح دی جاتی تھی اور شاپور ہی ایران کی ہونے والی ملکہ کو بیاہ کے اپنے ساتھ شاہ ایران کے پاس لے آتا جس کا باقاعدہ شادی کا جشن منایا جاتا اور پھر بادشاہ اپنے ایک اعلان کے ذریعے اپنی نئی ملکہ کے نام کا اعلان کرتا تھا۔ اس طرح کے جشن شادی یا جشن عروسی ہر سال یا دوسرے سال ہوا کرتے تھے مگر چودہ پندرہ سال سے یہ جشن تقریباً ختم ہو کر رہ گئے تھے۔

اس اجمال کی تفصیل وتفسیر کچھ اس طرح ہے کہ چودہ سال پہلے وزیر شاہپور کی پسند اور زور دینے پر کسریٰ خسرو پرویز نے قیصر روم کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ یہ شادی بڑے کانٹے کی شادی تھی۔ مطلب یہ کہ یہ شادی قیصر روم جسے شہنشاہ روم کے نام سے پکارا جاتا تھا وہ اس دور کا بہت بڑا بادشاہ یا شہنشاہ تھا اور اس کے بعد ایران کی مملکت' یہ حکومت اور سلطنت بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھی اور ہر طرح اور ہر موقع پر ایرانی مملکت' سلطنت یا شاہی ایران کے مقابلے پر آتی تھی۔ چنانچہ قیصر روم اور ایرانی شہنشاہ جس کا خطاب کسریٰ تھا' میں شدید اختلاف تھا اور آپس کی چشمک کبھی کبھی جنگ میں بھی تبدیل ہو جاتی تھی جس میں لاکھوں مخلوق خدا کا جانی اور مالی نقصان ہوتا تھا۔

کسریٰ ایران یعنی شہنشاہ ایران کا وزیر شاہ پور ایک نہایت دوراندیش، ذہین اور وفادار وزیر مملکت ایران تھا- وہ قیصر روم اور کسریٰ ایران کی روز روز کی چپقلش سے بہت تنگ تھا اور چاہتا تھا کہ دونوں ملکوں کے اختلافات ختم ہوں اور ان میں بھائی چارہ ہو جائے- چنانچہ وزیر شاپور نے بہت سوچ بچار کے بعد خسرو پرویز کے سامنے ایک منصوبہ پیش کیا- پھر ایک دن جب خسرو پرویز بہت خوش تھا اور شراب کے نشے میں دھت ہو رہا تھا تو شاپور نے اچانک کہا

''اے میرے مالک اور مولا! شاہ ایران کسریٰ وقت خسرو پرویز اور دنیا کے دوسرے عظیم مالک اور خالق آپ کے اس ناچیز مگر سب سے زیادہ وفادار وزیر باتدبیر نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے-''

اتنا کہہ کر وزیر شاپور خاموش ہو گیا- اس وقت کسریٰ ایران خسرو پرویز نے تیوریاں چڑھا کر وزیر شاپور کو سختی سے ڈانٹا-

''اے شاپور وزیر باتدبیر! تم کچھ دنوں سے ہمارے حضور باتدبیر کے بجائے بے تدبیر ہوتے جا رہے ہو اور مابدولت کو یہ بات حد درجہ ناپسند اور غیر مہذب لگتی ہے- کیوں نہ ہم تمہیں اس غیر متوقع گستاخی پر کوئی معقول سزا دیں-''

شاپور وزیر باتدبیر خسرو پرویز کی زبان سے یہ بات جو ایک اٹل حکم کا درجہ رکھتی تھی، سن کر گھبرا گیا اور اسے پسینے چھوٹ گئے- اس نے فوراً زمین کو چوم کے سجدہ کیا اور نہایت لجاجت اور مدھم آواز میں گویا ہوا-

''اے تمام جہانوں کے مالک وخالق کسریٰ ایران خسرو پرویز! آپ کا وزیر باتدبیر یعنی میں حقیر وفقیر شاپور نے واقعی آپ کے حضور گستاخی کا ارتکاب کیا ہے اور سزا کا مستحق ہے- اس لیے یہ گستاخ جناب حضور یہ عرضداشت پیش کرتا ہے کہ اسے اس گستاخی کی سزا سے پہلے اس کے جرم کا اعلان کیا جائے تاکہ آپ کا مجرم وزیر اس باب میں اپنی وضاحت

پیش کر سکے۔''

کسریٰ خسرو پرویز اپنے وزیر باتدبیر کی وضاحت سن کر اور زیادہ چراغ پا ہو گیا اور کڑک کر بولا۔

''اے وزیر تدبیر کیا تو یہ نہیں جانتا کہ کسریٰ خسرو پرویز صرف سزا کا حکم سناتا ہے وہ اپنی رعایا کی غلطیاں نہیں بیان کیا کرتا۔''

''شہنشاہ وقت اور کسریٰ ایران خسرو پرویز نے درست فرمایا'' شاہ پور نے سینے پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا۔ ''مگر ناچیز یہ بات کہنے پر مجبور ہے کہ جناب والا نے ایک دفعہ اس وزیر بے تدبیر کے بارے میں یہ صاف اعلان کیا تھا جس کی گواہی پورا دربار دے گا کہ

''ہمارا وزیر شاپور' صرف ہمارا وزیر نہیں بلکہ دنیا کے تمام وزیروں کا شہنشاہ ہے مگر اس وقت حضور مجھے عام رعایا میں شمار فرما رہے ہیں۔''

اس وقت شاہی دربار میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں اور اس قسم کی باتیں سنائی دیں۔ ایک امیر نے کہا۔

''شاپور درست کہتے ہیں۔ کسریٰ ایران نے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار' ایران کے وزیر کو دنیا کے تمام وزیروں کے بادشاہ اور شہنشاہ کا خطاب عطا کیا ہے۔''

دوسرے امیر نے فوراً اس کی تائید کی۔

''میں بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ کسریٰ محترم نے شاپور کو تمام وزیروں کے بادشاہ اور شہنشاہ کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ اب شاپور اس وقت تک اس اعزاز کے مستحق ہیں جب تک کہ انہیں کسریٰ خود معذول نہیں کرتے۔''

کسریٰ خسرو پرویز نے گھبرا کر کئی بار دائیں بائیں دیکھا پھر ایک لمحہ رک کر اور کچھ سوچ کے کہا۔

''ہم تاجدار ایران اور کسریٰ خسرو پرویز ہیں۔ ہم اپنی رعیت کو دیا ہوا اپنا خطاب کبھی واپس نہیں لیا کرتے۔ شاپور پہلے بھی بادشاہ اور شہنشاہ کے وزیر تھے اور آج بھی وہ بادشاہ اور شہنشاہِ ایران کے وزیراعظم ہیں۔''

یہ سن کر دربار کے دوسرے وزیروں اور امیروں نے خوب خوب تالیاں بجائیں اور بعض نے تو اپنا سر تک پیٹنا شروع کر دیا جو اس دور میں انتہائی مسرت کا اظہار سمجھا جاتا تھا۔

جب شاپور رخصتی سلام کر کے دربار سے روانہ ہونے لگا تو شاہ خسرو پرویز نے جسے عام طور پر کسریٰ ایران کے نام سے پکارا جاتا تھا' اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ شاپور اس حکم کے تحت' تخت شاہی کے بالکل قریب پہنچ گیا پھر اس نے اپنے کان کسریٰ کے منہ کے قریب کر دیے۔

خسرو نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

''اے شاپور! ذرا ہم کو بھی بتاؤ کہ تم کن کن ریاستوں' بادشاہتوں یا مملکتوں کی خاک چھاننے جا رہے ہو اور اس میں کس قدر عرصہ لگ سکتا ہے؟''

شاپور کو مذاق سوجھا۔ یوں بھی شاپور خسرو سے ہنسی مذاق کر لیا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے خسرو کو آہستہ آہستہ بتایا۔

''اے شاہِ عالی مقام اور کسریٰ ایران میری نظر آپ کی ملکہ کی تلاش کے لیے تین مملکتیں اور شہر میری نظر میں ہیں مگر اس وقت میں سب سے پہلے ''ملکہ عجم'' کے ملک اور شہر میں جاؤں گا کیونکہ اس کی حسین صورت مجھے آپ کی ملکہ کے طور پر سب سے زیادہ پسند ہے۔ اگر ملکہ عجم کے حضور بات نہ بنی تو پھر کسی دوسری مملکت اور بادشاہت کا چکر لگاؤں گا۔''

خسرو پرویز نے برا سا منہ بنایا اور کہا۔

''اے شاپور! تم بہت عقلمند ہو مگر بعض اوقات مجھے تمہاری باتوں پر بہت ہنسی اور غصہ

آ تا ہے- میں نے تم سے کب کہا ہے کہ تم میرے لیے کسی ملک کی شہزادی یا کسی انتہائی خوبصورت لڑکی جو کنواری ہو' اس سے میرے رشتے کی بات کرو تم تو کسی ملکہ کو میری بیوی بنانے کی فکر میں ہو- مجھے کسی ملکہ کی ضرورت نہیں- ایک ''ملکہ روم'' میرے محل میں پہلے ہی سے موجود ہے جس نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے اور اب تم پھر کسی عجمی ملکہ کو میرے سر باندھنا چاہتے ہو- مجھے کسی دوسری ملکہ کی نہیں بلکہ ایک حسین و جمیل' کمسن اور کنواری لڑکی کی تلاش ہے جسے میں اپنی بیوی اور صحیح معنوں میں ملکہء ایران کا درجہ دے سکوں-''

''مگر اے شاہ معظم میں نے تو کسی ملکہ کا ذکر نہیں کیا-'' شاپور نے گھبراتے ہوئے کہا- ''مجھے معلوم ہے کہ آپ کے حرم میں شہزادیٔ روم آپ کی ملکہ معظّمہ کے طور پر موجود ہیں- لیکن اس وقت میں جس حسین ہستی کی تلاش میں جا رہا ہوں وہ کہیں کی ملکہ نہیں بلکہ ابھرتی ہوئی شہزادی ''شیریں'' ہے جسے میں آپ سے بیاہ کر ''ملکہ ایران'' بنانے کا قصد کر چکا ہوں-

''اچھا یہ بات ہے-'' خسرو پرویز خوش ہو گیا- ''اس غلط فہمی کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں- مگر...... ہاں...... یہ تو بتاؤ کہ تمہیں اس تلاش میں کتنا وقت لگے گا؟''

''شاہ خسرو پرویز بالکل مطمئن رہیں- اگر شیریں کا معاملہ بن گیا تو میں ایک ڈیڑھ ماہ میں خوشخبری لے کر حاضر خدمت ہو جاؤں گا-''

ملک خیال عجم کی شہزادی شیریں' سینکڑوں اور ہزاروں دوشیزاؤں میں سے ایک تیکھے اور نرالے نقش و نگار کی ایک ابھرتی ہوئی دوشیزہ تھی- اس کے لیے کہا گیا ہے کہ شیریں دست قدرت کا نایاب اور نادر نمونہ تھی- اس کے چہرے پر حیا کی سرخی مگر رگ رگ میں چلبلا پن بھرا ہوا تھا- وہ ایک آزاد تتلی کی طرح اپنے خوبصورت باغ میں اچھلتی کودتی پھرتی تھی- اس کی تمام سہیلیاں بھی اسی کی طرح شوخ و شنگ تھیں- دوشیزاؤں کا یہ بے فکری کا زمانہ ہوتا ہے- اس لیے ان میں شوخی اور آزادی بھی زیادہ ہوتی ہے-

ایک دن شیریں اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے گل کدہ (باغ) میں اودھم دھاڑ مچا رہی تھی کہ باغ کا کونہ کونہ معصوم اور خوشیوں سے بھرپور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ شیریں ایک سایہ دار درخت کے نیچے اپنی سہیلیوں سے محو گفتگو تھی کہ اس کی ایک سہیلی پریشان، ہکا بکا، گرتی پڑتی اس کے پاس پہنچی۔

شیریں اور دوسری سہیلیاں اسے دیکھ کر گھبرا گئیں۔

''کیا ہوا گلابو؟'' شیریں نے نرمی سے پوچھا ''تم بہت پریشان نظر آ رہی ہو؟''

''ہاں شہزادی شیریں! میں پریشان ہوں اور بہت پریشان ہوں۔'' گلابو نے تیز تیز سانسوں کے درمیان بتایا۔ ''میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ گھبرا جاتا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ وہ باغ میں ایک درخت پر لٹکا ہوا ہے۔''

''کہاں لٹکا ہوا ہے؟ کون لٹکا ہوا ہے؟ تم نے پوچھا نہیں اس سے؟''

تمام سہیلیوں نے گلابو پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ گلابو کو جواب تو کوئی نہ بن پڑا۔ وہ تو بس منہ کھول کر ہکا بکا کھڑی ایک ایک کا منہ دیکھے جا رہی تھی۔

شیریں ان تمام سہیلیوں میں شاید کچھ زیادہ ہی عقلمند تھی۔ چنانچہ اس نے سوال کیا۔

''گلابو! گھبراؤ نہیں۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اپنے دل کو ٹھہراؤ اور بتاؤ کہ تم کو کس نے ڈرایا ہے؟''

گلابو کو شیریں کی بات سے کچھ تسلی ہوئی۔ چنانچہ وہ خود پر قابو کر کے قدرے سکون سے بولی۔

''شہزادی شیریں! وہ دو فٹ کا لمبا چوڑا انگڑا ہے اور تھوڑی اونچائی پر درخت پر لٹک رہا ہے۔ مگر شہزادی بی بی کیا صورت پائی ہے اس نے۔ کوئی عیب نظر نہیں آتا ہے۔ افسوس''

اب تو معہ شہزادی شیریں کے تمام سہیلیوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ آخر شہزادی

شیریں نے خود پر قابو پاتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

''کیا کہا تم نے گلابو؟ اس کا قد صرف دو فٹ کا ہے اور وہ درخت پر لٹکا ہوا ہے؟''

گلابو نے آنکھیں پٹپٹا کے کہا۔

''ہاں شہزادی! قسم لے لو مجھ سے۔ وہ دو فٹ سے زیادہ لمبا اور دو ہی فٹ چوڑا ہے۔''

''تو پاگل تو نہیں ہو گئی گلابو؟'' ایک سہیلی کو غصہ آ گیا۔'' دو فٹ کا لمبا چوڑا مرد وا وہاں پیڑ پر لٹکا کیا کر رہا ہے۔ کہیں وہ کوئی بچی تو نہیں جو کسی طرح اوپر پہنچ کے شاخوں میں لٹک گئی ہو۔''

شہزادی کی اور دوسری سہیلیاں اب تک منہ کھولے کھڑی تھیں۔ آخر شہزادی نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔'' گلابو حواس درست کر کے سچ سچ بتا کہ وہ دو فٹ کی کوئی بچی ہے یا کوئی بونا مردود ہے......''

''نہیں شہزادی......'' گلابو کو ضبط نہ ہوا اور وہ شہزادی کی بات کاٹ کے بولی۔'' نہ وہ کوئی بچی ہے اور نہ کوئی بونا مردود ہے۔ وہ تو ہٹا کٹا خوبصورت جوان ہے۔ بڑا رعب داب والا تیکھا اور......اور......ایک بار دیکھو تو دوبارہ دیکھنے کو طبیعت چاہتی ہے۔''

یہ کہتے ہوئے بی گلابو نے بڑی سختی اور بدتمیزی سے شہزادی شیریں کی کلائی پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔

''چلیے میرے ساتھ۔ میں آپ کو دکھاتی ہوں۔ سچ اور جھوٹ کا ابھی پتہ چل جائے گا''

شہزادی شیریں افتاں و خیزاں اس کے ساتھ ہوئی اور تمام دوسری سہیلیاں اور کنیزیں اس کے پیچھے چلنے لگیں۔ بی گلابو شہزادی اور اس کے ساتھ تمام سہیلیوں کو گھسیٹتی ہوئی کچھ دور ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑی ہو گئی پھر نہایت اطمینان اور فاتحانہ انداز میں شہزادی کو مخاطب کیا۔

''شہزادی عالیہ! ذرا نظریں اٹھا کر درخت کے اوپر دیکھیے - پتہ چل جائے گا کہ کون سچا اور کون جھوٹا ہے-''

گلابو کی بات ختم ہوتے ہی شہزادی اور تمام سہیلیوں کی نظریں اک دم درخت کے اوپر اٹھ گئیں- وہاں درخت پر آٹھ دس فٹ کی بلندی پر ایک دو فٹ کا چوکور دفتی یا ہارڈ بورڈ کا ایک تختہ شاخوں کے درمیان اٹکا ہوا تھا اور اس لٹکے ہوئے تختے پر ایک رنگین تصویر بنی ہوئی تھی-

شہزادی شیریں نے سختی سے گلابو کو گھورا پھر سخت لہجے میں بولی-

''تو دیوانی تو نہیں ہوگئی گلابو- یہ شاخوں میں کوئی مرد جھول رہا ہے یا چوکور تختی کا ٹکڑا؟ تجھے ایک جوان آدمی اور اس ٹکڑے میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا- یہ سچ مچ کا زندہ آدمی نہیں بلکہ کسی مصور کے ہاتھ کی بنی تصویر ہے جو پتہ نہیں کس نے یہاں لا کے ٹانگ دی ہے اور تیری آنکھیں دھوکہ کھا گئیں-''

گلابو شرمندہ تو ہوئی مگر ڈھیٹ بن کے بولی-

''مگر شہزادی بنو! آپ یہ تو مانیں گی کہ یہ تصویر والا آدمی ہے بڑا خوبصورت- کسی ملک کا بادشاہ یا شہزادہ معلوم ہوتا ہے-''

شہزادی شیریں کی تمام سہیلیاں بڑے غور اور دلچسپی سے اس لٹکی ہوئی تصویر کو دیکھ رہی تھیں- ان میں سے ایک سہیلی نے تبصرہ کیا-

''گلابو نے جھوٹ نہیں کہا- تصویر والا جوان واقعی کوئی مرد میدان ہے یا پھر کسی بڑے ملک کا شہزادہ-'' گلابو کی بات کی تصدیق ہوئی تو وہ اور زیادہ پھول گئی اور پھڑک کے بولی-

''اب آیا سب کو میری بات کا یقین''

''مگر یہ تصویر یہاں لایا کون؟'' شہزادی نے سختی سے باز پرس کی- ''یہ شاہی باغ ہے اور اس کے گرد سخت پہرہ ہے پھر یہاں کوئی کس طرح یہ تصویر اٹکا کے چلا گیا-''

''ہاں! یہ تو سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔'' ایک قدرے عمر رسیدہ سہیلی نے کہا۔

''اچھا...... جاؤ...... دوڑو...... جاگو اور تصویر لٹکانے والے کو پکڑو۔'' پھر زیادہ سختی سے کہا۔''یہ سب تم لوگوں کا قصور ہے۔ کتنے غضب کی بات ہے کہ کوئی شخص شاہی باغ میں اطمینان سے آئے اور ایک تصویر یہاں لٹکا کر چپ چاپ چلا جائے۔ کتنا اندھیر ہے یہ۔ میں تمام پہرے داروں کو جواب دلوادوں گی۔''

دوسرے دن شہزادی شیریں کے محل میں کچہری لگ گئی اور گزشتہ دن والا مقدمہ پیش ہوا۔ شیریں نے باغ کے تمام مالیوں اور پہرہ داروں کو بلوالیا تھا۔ شیریں نے شہر کے ناظم اعلیٰ کو اس مقدمہ کا منصف مقرر کیا تھا۔ ایک ایک کر کے تمام مالی اور پہریدار شہزادی شیریں کے محل میں لگنے والی اس کچہری میں آتے گئے۔ جب تمام مطلوبہ لوگ وہاں پہنچ گئے تو شہزادی نے منصف ناظم اعلیٰ کو اشارہ کیا کہ مقدمہ شروع کیا جائے۔

منصف کے پاس تمام مالیوں اور پہریداروں کی مکمل فہرست پہلے ہی آ گئی تھی۔ اس نے منادی کرنے والے ہرکارے کو فہرست کے مطابق پانچ مالیوں اور پانچ پہریداروں کے نام زبانی یاد کرادیے اور حکم دیا کہ ان تمام ملزمان کو ترتیب وار اور ایک ایک کر کے منصف کے میں پہنچایا جائے۔ منصف کے سامنے ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی اور میز کے ایک طرف لکڑی کے خوبصورت فریم میں جڑی ہوئی ایک رنگین تصویر رکھی تھی۔

ہرکارے نے آواز لگا کر پہلے ملزم کو منصف کے سامنے پیش کیا۔

منصف نے اس کا نام پوچھنے کے بعد ملزموں کی فہرست پر اس کے نام کے سامنے ایک نشان لگایا پھر اس نے پہلے سے میز پر رکھی ہوئی تصویر کو دیکھا اور ملزم سے دریافت کیا۔

''تم اس تصویر کو پہچانتے ہو؟''

''نہیں'' یہ ملزم کا مختصر جواب تھا۔

منصف کو شاید طیش آ گیا- اس نے قدرے چیخ کے کہا-

''سوچ کے جواب دو- یہ عدالت ہے خار جی کا گھر نہیں؟''

ملزم نے اپنا جواب دہراتے ہوئے اس میں مزید یہ اضافہ کیا-

''میں نے پہلے اس شخص کو نہ دیکھا ہے اور نہ پہچانتا ہوں کہ یہ کس کی تصویر ہے-''

''پھر سوچ لو'' منصف کا لہجہ اور سخت ہو گیا- ''اگر تمہارا جوب غلط ہوا تو سخت سزا ملے گی-''

''جب میں نے کوئی غلطی یا جرم کیا ہی نہیں تو پھر سزا کیسی؟'' اس نے منصف کو اس قدر تلخی سے جواب دیا کہ منصف جھلا اٹھا-

''تم سخت بدتمیز اور بدکلام ہو'' منصف نے کہا- ''تم نے اس عدالت کے منصف سے گستاخی کی ہے اس لیے سب سے پہلے اس گستاخی اور بدلحاظی کی سزا ملے گی- اس کے بعد مقدمہ پھر سے پیش ہوگا-''

''یہ سراسر ظلم اور ناانصافی ہے-'' ملزم نے احتجاج کیا- ''اگر مجھ سے غلطی سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے تو براہ کرم مجھے معاف کیا جائے-''

''ہم تمہیں معاف نہیں کر سکتے-'' منصف نے صاف لفظوں میں اعلان کیا-

''اگر منصف انصاف نہیں کر سکتے تو ان کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرتا ہوں-'' ملزم نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا-

پس منصف نے فیصلہ سنایا-

''ملزم کا جرم ثابت ہو گیا- اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں اور اسے تین ماہ تک کے لیے کوٹھڑی میں بند کیا جائے- کھانے کے لیے صرف ایک وقت کھانا دیا جائے اور دوسرے وقت اسے بھوکا رکھا جائے-''

مقدمہ یہاں تک پہنچا تھا کہ شہزادی شیریں کی ایک کنیز دوڑتی ہوئی آئی اور اس کمرے میں داخل ہوئی جہاں یہ مقدمہ پیش ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں منصف نے ملزم کو ایک ماہ تک کال کوٹھڑی میں بند رکھنے اور صرف ایک وقت کا کھانا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

شہزادی کی کنیز نے کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہی چیخ کر کہا۔

''عدالت بند کی جاتی ہے اور مقدمہ خارج کیا جاتا ہے۔''

عدالت کے تمام حاضرین (مرد اور عورتیں) گھبرا کے کھڑے ہو گئے۔

منصف بھی گھبرا گیا۔ اس نے آنے والی کنیز سے پوچھا۔

''آخر تم ہو کون اور تمہیں عدالت برخاست کرنے کا کس نے حکم دیا؟''

کنیز پاؤں پٹختی ہوئی آئی اور منصف کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی۔

''میں کون ہوں؟ مجھے جانو اور پہچانو۔ میں شہزادئ عجم کی کنیز خاص ہوں اور سب کو حکم دیتی ہوں کہ تمام لوگ اس کمرے سے فوراً نکل جائیں۔''

''میں اس عدالت کا منصف ہوں۔'' منصف نے اکڑ کر کہا۔ ''مجھے شیریں شہزادی عجم نے اس مقدمہ کے فیصلے کا حکم دیا ہے اور جب تک شہزادئ عجم خود آ کر مقدمہ ختم کرنے کا حکم نہیں دیں گے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔''

شہزادئ عجم کے محل کے باہر کے ایک کمرے میں تو یہ عدالت لگی ہوئی تھی مگر خود شہزادی عجم کے کمرے کا کیا حال تھا۔ اب ہم آپ کو اس طرف لیے چلتے ہیں۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب شہزادی عجم کے سامنے لکڑی کے فریم میں جڑی ہوئی ایک خوبصورت اور خوبرو جوان کی تصویر پیش کی گئی تو شہزادی اس بارعب جوان کی رعنائی سے متاثر تو ضرور ہوئی مگر اسے یہ فکر لگ گئی کہ آخر اس تصویر کو اس کے پائیں باغ میں لا کر شاخوں کے درمیان لٹکانے کی کس نے جرأت کی۔ اس لیے اس نے یہ عدالت لگوائی تھی کہ ملزم اور مجرم کو پکڑا جائے تاکہ

حالات کی صحیح تصدیق ہو سکے۔ مگر حالات کی ستم گیری ملاحظہ ہو کہ شہزادی شیریں جب عدالت لگانے کا حکم دے کے اپنے خاص کمرے میں پہنچی تو وہاں کی پہریدار کنیز نے جھک کے اسے کورنش پیش کیا اور گفتگو کی اجازت چاہی۔

''میں شہزادی عالیہ کے حضور ایک خاص بات عرض کرنے کی اجازت چاہتی ہوں'' کنیز نے نہایت ادب سے کہا۔ شہزادی شیریں مسکرائی اور بولی۔

''یہ دنیا کے حالات کیسے بدل گئے ہیں۔ ہمارے باغ خاص میں اجنبیوں کی تصویریں آویزاں ہونے لگی ہیں اور اب ہماری وہ کنیز خاص جو اپنی بک بک سے ہمارا دماغ کھایا کرتی تھی وہ اس وقت کوئی خاص بات عرض کرنے کی اجازت مانگ رہی ہے۔ یہ زمانے کو کیا ہو گیا ہے؟'' شہزادی شیریں نے جیسے خود سے سوال کیا۔

مگر اس کا جواب اسے اس کنیز سے ملا جس نے گفتگو کی اجازت چاہی تھی۔ اس کنیز نے عرض کیا۔

''شہزادی عالیہ! میں دراصل ایک ایسے شخص کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں جو صرف عظیم ہی نہیں بلکہ شاید ہم سے بھی عظیم تر ہے۔''

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو؟'' شہزادی شیریں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''ہم سے زیادہ عظیم سوائے دیوتاؤں کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''کیا شہزادی شیریں نے کبھی سلطنت ایران کا نام سنا ہے؟'' کنیز نے شہزادی سے ایک دم سوال کر دیا۔ شہزادی نے اسے چونک کے دیکھا پھر پوچھا۔

''کیا تو ایرانی بادشاہت' شہنشاہیت اور سلطنت کا نام لیتے خوف نہیں کھاتی۔'' شہزادی شیریں نے اسے سمجھانے یا شاید ڈرانے کے لیے کہا۔ '' دنیا میں اس وقت دو عظیم بادشاہتیں یا سلطنتیں ہیں۔ ایک قیصر روم کی بادشاہت جسے سلطنت روما کہا جاتا ہے اور

دوسری کسریٰ ایران کی مملکت جو سلطنت ایران کے نام نامی سے یاد کی جاتی ہے۔ اب تو بتا کہ کس کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہے؟''

کنیز نے دوبارہ کورنش پیش کیا اور کہا۔

''اے ملک عجم کی شہزادی شیریں! میں اس وقت آپ کے سامنے اس عظیم ہستی کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جوان دو بادشاہتوں میں سے ایک کا مالک اور تاجدار ہے جن کا ذکر ابھی ابھی خود شہزادی عجم نے کیا ہے۔''

''اے نادان کنیز!!'' شہزادی عجم شیریں نے کنیز کو ہوشیار کیا۔ ''اگر تو سلطنت روما یا سلطنت ایران کے بارے میں کسی قسم کی گفتگو کرنا چاہتی ہے تو پہلے اپنے حواس پر قابو حاصل کر کیونکہ اگر تو نے غلطی سے بھی ان دونوں ملکوں یا دونوں بادشاہوں اور تاجداروں کے بارے میں کسی قسم کی گستاخی کی کوشش کی تو تیرا سر فوراً قلم کر دیا جائے گا۔''

شہزادی عجم شیریں کی کنیز ایک طرف تو ضدی اور ڈھیٹ تھی تو اس کا دوسرا رخ اس کی وفاداری تھی کیونکہ وہ شہزادئ عجم شیریں پر ہر وقت اپنی جاں نثار کرنے پر تیار رہتی تھی۔ پس اس نے شہزادی عجم شیریں کے حضور عرض کیا۔

''اے شہزادئ عجم شیریں اگرچہ میں جس کے سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہوں وہ ہم سے عظیم تر ہستی ہے مگر وہ خود جس سلسلے میں یا جس کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے ہستی اس سے بھی زیادہ عظیم ہے۔ کیا یہ جانتے ہوئے بھی شہزادی مجھے گفتگو کی اجازت عطا فرمائیں گی؟''

''ہم تجھے خود تیری ذمہ داری پر اجازت دیتے ہیں۔'' شہزادی شیریں نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا ''تو جو کچھ کہے گی اس کی خود ذمہ دار ہوگی۔ ہم تیرے لیے کوئی سفارش نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے شہزادیٔ عجم'' کنیز نے حوصلے سے کہا۔''میں اس وقت پوری ذمہ داری سے آپ کو اس بات کی اطلاع دیتی ہوں کہ دنیا کی دو عظیم مملکتوں میں سے ایک مملکت و شہنشاہی کے تاجدار کا وزیراعظم آپ کے درِ دولت پر اس لیے حاضر ہوا ہے کہ وہ ملکہ حضور اورشہزادیٔ عجم کے حضور ایک درخواست پیش کرنے کا خواہشمند ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اگراس کی درخواست کو ٹھنڈے دل سے سنا اور پڑھا جائے اور پھر اسے شرف قبولیت عطا کیا جائے تو درخواست کرنے والی ہستی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شاہ ملکہ اور شہزادی عجم کا احسان مند اور شکر گزار رہے گی۔''

''اے کنیز! ہم نے تیری گفتگو پسند کی۔'' شہزادیٔ عجم شیریں نے کہا۔''مگر ہم چاہتے ہیں تو صاف الفاظ میں اپنا مقصد اور مطلب بیان کر اور اس بات کا خیال رہے کہ اس وقت شاہ ملکہ یہاں موجود ہیں۔''

''کوئی بات نہیں اے شہزادیٔ عجم'' کنیز نے حوصلہ سے کہا۔''اگر شہزادی شیریں اس بات کو تسلیم و منظور فرمالیں تو قاصد کو عرض پیش کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوگا۔''

''اچھا اجازت ہے۔'' شہزادی نے کہا۔''آنے والے قاصد کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔''

''مگر شہزادی عالیہ!'' کنیز نے مسکرا کر کہا۔''پہلے دوسرے حصے میں لگی ہوئی عدالت کو برخاست کیا جائے کیونکہ اس عدالت یا اس کے فیصلے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''کیوں؟'' شہزادی شیریں نے چونک کے پوچھا۔

''اس لیے کہ عدالت اس واسطے لگائی گئی تھی کہ شاہی باغ میں داخل ہونے والے اس شخص کو گرفتار کر کے سزا دی جائے جس نے وہاں درخت پر تصویر لٹکائی تھی۔'' کنیز نے بتایا ''چونکہ باغ میں تصویر لٹکانے والا پکڑا نہیں گیا بلکہ وہ خود دربار میں پیش ہو گیا ہے اس لیے

اب اس مقدمہ کی ضرورت نہیں۔''

''کون ہے وہ؟ کہاں ہے وہ؟'' شہزادی شیریں نے گھبرا کے پوچھا۔

''شہزادی عالیہ! اب میرا بیان توجہ سے سنا جائے۔'' اور کنیز نے سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ ''اس قصے کی اصل حقیقت اس طرح ہے کہ ایک عظیم تاجدار یعنی شہنشاہ ایران، کسریٰ خسرو پرویز کے وزیر اعظم شاہ پور نے کسی طرح ملکہ عجم یعنی شہزادی شیریں کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اور وہ آپ کو صرف ایک نظر دیکھ کر ہی ایسا متاثر ہوا کہ اس نے ایران جا کر اپنے شہنشاہ خسرو پرویز کے سامنے آپ کی بے پناہ تعریف کی۔ چونکہ شاپور اپنے تاجدار کا سب سے زیادہ منہ چڑھا وزیر ہے اس لیے اس نے بادشاہ سے درخواست کی کہ وہ آپ کو یعنی شہزادی شیریں کو اپنی بیوی بنا کر ''ملکۂ عجم'' کے خطاب سے سرفراز کریں۔''

یہ سن کر شہزادی شیریں کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے کسریٰ خسرو پرویز کے بارے میں بہت باتیں سن رکھی تھیں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ خسرو پرویز خوبصورتی کا دلدادہ ہے اور خوبصورت عورتوں کو اپنے محل خاص میں جگہ دیتا ہے۔ پس شہزادی نے پوچھا:

''کیا تاجدار ایران خسرو پرویز کا وزیر یہاں آنے والا ہے؟''

''آپ اس کی فکر نہ کیجیے شہزادی عالیہ'' کنیز نے جواب دیا۔ ''وہ تو کئی دن سے آپ سے اور ملکہ مادر سے آپ کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے لیے بے چین ہے۔ میں نے اسے شاہی مہمان خانے میں بڑی عزت سے مہمان بنا کے رکھا ہوا ہے۔ اب آپ کا جو حکم ہو اس پر عمل کیا جائے۔''

شہزادی شیریں سوچ میں پڑ گئی پھر ذرا ٹھہر کے بولی۔

''تمہاری کیا رائے ہے کنیز! تم میری کنیز بھی ہو اور راز دار سہیلی بھی۔ تمہارے خیال میں کیا ایرانی تاجدار نے مجھے دیکھے بغیر ہی مجھے اپنی ملکہ کے طور پر پسند کر لیا ہے۔''

''بالکل شہزادی شیریں'' کنیز نے زور دے کر اعتماد سے کہا- ''اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں- تاجدار ایران نے اپنے وزیر شاپور کے منہ سے آپ کے حسن و جمال کی تعریف سنی اور آپ پر عاشق ہو گیا اور اب اس نے وزیر کو آپ کے ملک میں مادر ملکہ اور آپ کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے- اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے-''

شیریں یہ سن کے خوش تو بہت ہوئی مگر اسے جیسے اک دم کچھ خیال آ گیا- اس نے فوراً کہا-

''کنیز کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ ایران کے تاجدار نے قیصر روم کی بیٹی سے شادی کر کے اسے ملکہ ایران بنالیا ہے-''

''شہزادی بنو! آپ کیا بچوں جیسی باتیں کرتی ہیں-'' کنیز نے اور ذرا زور دے کر کہا- ''ان بادشاہوں کا کیا ٹھکانہ- ان کی ایک دو نہیں بلکہ درجنوں اور سینکڑوں بیویاں اور ملکائیں ہوتی ہیں مگر ان کے دل کی ملکہ تو صرف ایک ہوتی ہے- کیا ہوا اگر شاہ کے محل میں قیصر روم کی ایک بیٹی، ایرانی بادشاہ کی بیوی بن گئی- مگر جب آپ کی شادی ہو گی تو آپ کا معاملہ دوسرا ہو گا-''

''دوسرے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' شیریں کو الجھن پیدا ہوئی- ''قیصر روم کی بیٹی، خسرو پرویز کی پہلی بیوی ہے اب اگر میں نے خسرو سے شادی کی تو میں دوسری بیوی کہلاؤں گی-''

''نہیں شہزادی یہ بات نہیں ہے-'' کنیز نے اسے تحمل سے سمجھایا ''عورتوں میں یہ مثل مشور ہے کہ جس کو چاہے سیاں وہی سہاگن'' خسرو پرویز کی پہلی بیوی بوڑھی ہو گئی ہے ب تو آپ کا چراغ جلے گا- محلات میں صرف اور صرف آپ کا بول بالا ہو گا- قیصر روم کی تو ''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' کہلاتی ہے- آپ جوان بلکہ نوجوان ہیں- خسرو پرویز تو

اپنے وزیر کی زبان سے آپ کی تعریف ہی سن کے آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے۔''

''میں تجھ پر اعتماد کرتی ہوں کنیز۔'' شیریں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میں ملکہ ایران کا تاج اپنے سر پر سجانا تو پسند کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ ایران پہنچ کر وہاں اپنے حسن و جمال اور اہلیت اور قابلیت کا ڈنکا پیٹوں مگر ایک بات سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''کون سی بات؟'' کنیز نے گھبرا کے پوچھا۔

''یہ تو ٹھیک ہے کہ قیصر روم کی بیٹی یعنی موجودہ ایرانی ملکہ بوڑھی گھوڑی ہے مگر اس کا بیٹا ''شیرویہ'' جو اس کی مدد پر موجود ہے۔ میں اکیلی ان دونوں کا مقابلہ کیسے کر سکوں گی؟''

''اے شہزادی شیریں اور ایران کی ہونے والی ملکہ'' کنیز نے شیریں کو حوصلہ دینے کے لیے کہا۔ ''میں کہتی ہوں کہ موجودہ ایرانی ملکہ کے ایک نہیں دس بیٹے بھی ہوں مگر وہ آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ آپ کے سامنے آئیں گے تو منہ پیٹ کے بھاگ جائیں گے۔''

''یہ تم کیسے کہہ رہی ہو؟'' شیریں نے جرح کی۔ ''ایک کی دوا دو دو کی دوا چار۔ میں اکیلی اتنے لوگوں کا کس طرح مقابلہ کروں گی۔''

''شہزادی شیریں! آپ جوان ہیں' خوبصورت ہیں' آپ کو اتنی جلدی ہمت نہ ہارنا چاہیے۔'' چالاک اور دور اندیش کنیز نے شیریں میں حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کہا۔ ''عورت کی سب سے بڑی طاقت اس کا حسن اور اس کی جوانی ہوتی ہے۔ آپ نے غور نہیں فرمایا کہ جب تاجدار ایران کا بوڑھا وزیر شاپور آپ کے حسن کو دیکھ کر دیوانہ ہو گیا اور اس نے خود ایرانی تاجدار کو آپ سے شادی کرنے کا مشورہ دیا تو پھر ایران کا تاجدار خود آپ کو اپنی جوان آنکھوں سے دیکھے گا تو اس کا کیا حال ہو گا۔ میں کہتی ہوں کہ وہ تو عمر بھر آپ کے پیر دھو دھو کر پیئے گا۔''

شہزادی شیریں سوچ میں پڑ گئی۔ کنیز نے پھر آگ بھڑکائی۔ اس نے کہا۔

''شہزادی شیریں! آپ کو شبہ ہے کہ شاید شہنشاہ ایران آپ کو ملکہ ایران کے مقابلے میں دوسرے درجے پر رکھے گا۔''

''معاف کیجیے شہزادی شیریں'' جہاندیدہ کنیز اپنی مالکن کو کسی نہ کسی طور خوش کرنا چاہتی تھی ''اگر آپ کو یہ خیال ستا رہا ہے کہ آپ شاہی میں دوسرے نمبر پر رہیں گی تو اس کا علاج بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' شہزادی شیریں نے فوراً پوچھا۔

''میں بتاتی ہوں آپ کو۔'' کنیز بولی۔ ''ابھی آپ سے وزیر شاپور گفتگو کرنے آئے گا۔ جب وہ آپ پر خسرو پرویز سے شادی پر زور دے تو آپ اس سے کہہ دیجیے کہ آپ شادی کرنے پر تیار ہیں مگر ایک شرط پر اور جب وہ شرط کا پوچھے تو آپ صاف الفاظ میں مطالبہ کیجیے کہ آپ کو شاہی محل میں بوڑھی ملکہ کے ساتھ نہ رکھا جائے بلکہ آپ کے لیے ایک الگ محل تیار کیا جائے جس میں آپ اور صرف آپ قیام کریں۔''

شہزادی شیریں کنیز کی یہ بات سن کر کھل اٹھی۔

''میں تیری عقل کی داد دیتی ہوں کنیز۔'' شیریں شگفتہ لہجے میں بولی۔ ''میں گفتگو میں وزیر سے بالکل یہی مطالبہ کروں گی اور اس وقت تک رضامند نہیں ہوں گی جب تک وہ میرا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کرتا۔''

''تو چلیے۔ آپ کا یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔'' کنیز کو بھی بہت خوشی تھی کہ اس کے دماغ میں اک دم یہ ترکیب آ گئی تھی جس نے ایک اہم مسئلہ حل کر دیا تھا۔

پھر اسی دن شام کو شاپور کو شہزادی شیریں اور ملکہ مادر سے ملاقات کے لیے طلب کیا گیا۔ وزیر شاپور نے کورنش پیش کرنے کے بعد بڑے فخر اور اعتماد کے ساتھ عرض کیا۔

''میں ملکہ مادر اور شہزادی شیریں کے حضور میں تاجدار ایران کسریٰ خسرو پرویز کی یہ

درخواست پیش کرتا ہوں کہ ایرانی تاجدار نے بڑے خلوص اور محبت سے ہر دو یعنی ملکہ اور شہزادی کے حضور یہ درخواست پیش کی ہے کہ "شہزادی شیریں" کو ایرانی تاجدار خسرو پرویز کی زوجیت میں دے کر انہیں "ملکہ عجم" کا خطاب عطا کیا جائے۔"

شہزادی شیریں نے ملکہ مادر کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ شیریں اور خسرو پرویز کے مسئلہ پر شہزادی شیریں کا یہ مطالبہ پیش کیا جائے کہ اسے موجودہ ملکہ ایران کے ساتھ شاہی محل میں نہ رکھا جائے بلکہ اس کے لیے ایک الگ محل تیار ہو جس میں کسی دوسری بیگم کا بالکل عمل دخل نہ ہو۔

چنانچہ جب ایرانی وزیر شاپور نے مادر ملکہ اور شہزادی شیریں کے سامنے خسرو پرویز کی شادی کی خواہش جو ایک درخواست کی صورت میں تھی، پیش کی تو شہزادی شیریں نے یہ درخواست سن کر اپنا سر جھکا لیا مگر مادر ملکہ نے صاف الفاظ میں مطالبہ کیا کہ شادی اس شرط پر قبول کی جا سکتی ہے کہ شہزادی شیریں کے لیے الگ شاہی محل تیار کیا جائے جس میں شہزادی شیریں شادی کے بعد قیام پذیر ہو اور اس محل میں کسی دوسری ہستی کا قطعی عمل دخل نہ ہو۔

ایرانی وزیر شاپور اگرچہ ایران وزیروں میں تیسرے چوتھے درجے پر تھا مگر اسے تاجدار ایران کسریٰ خسرو پرویز کے مزاج میں ایسا دخل تھا کہ وہ خسرو پرویز کے ذاتی معاملات میں بھی بخوبی دخیل رہتا تھا۔ شاپور نے خود ہی خسرو پرویز کے سامنے شہزادی شیریں سے شادی کرنے کا مسئلہ رکھا تھا۔ پھر تاجدار کی بے چینی کو دیکھ کر اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ شہزادی شیریں کو خسرو پرویز کی ملکہ بنا کر رہے گا۔ خسرو پرویز نے خود بھی شاپور کو اس شادی کے معاملے میں پورے پورے اختیارات دے رکھے تھے۔ چنانچہ شاپور، خسرو پرویز کی اجازت حاصل کر کے پھر شہزادی شیریں کے پاس گیا اور اس نے خسرو پرویز کی شہزادی شیریں کے ساتھ شادی کی درخواست پیش کی۔ اس درخواست کے جواب میں ملکہ مادر نے فرمایا۔

''اے عقل مند وزیر با تدبیر! تمہیں عقل کی بات بتانا میرے خیال میں شاید نادانی ہے۔ ایران کے ملکی اور خاص کر محلاتی حالات سے تم یقیناً پوری طرح آ گاہ ہو گے۔ مجھے اس پر اعتراض نہیں کہ موجودہ تاجدار ایران اپنی پہلی رومی ملکہ کی موجودی میں دوسری شادی کیوں کر رہا ہے کیونکہ اس طرح کا سوال اٹھانا شاہوں اور خاص کر خود مختار لوگوں کو سخت ناگوار گزرتا ہے۔ مگر اس معاملہ میں یہ بات یقیناً قابل غور ہے کہ رومی ملکہ کے شاہی محل میں قیام کے ساتھ ساتھ وہاں ایک دوسری ملکہ کا قیام کس طرح ممکن ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میری بیٹی شہزادی شیریں اپنے حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی مگر رومی ملکہ ایک زمانہ سے خسرو پرویز کے مزاج پر حاوی ہے اور اس سے خسرو پرویز کا ایک نوعمر شہزادہ بھی ہے۔ شاپور کو اس بات پر خود غور کرنا چاہیے کہ شاہی محل میں ایک ملکہ کی موجودگی میں دوسری ملکہ کس طرح رہ سکے گی۔ جبکہ پہلی ملکہ کے ساتھ اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔''

مادر ملکہ نے اتنا کہہ کر شاپور کی طرف دیکھا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ شاپور خود ہی کوئی اس کا علاج یا حل نکالے۔ شاپور حقیقتاً نہایت جہاندیدہ تھا۔ اسے موجودہ تاجدار اور اس کی ملکہ کے مزاج میں بھی دخل تھا اور اسے ان تمام خطرات اور اعتراضات کا پہلے سے خیال تھا اس کے باوجود اس نے خسرو پرویز کے بے حد اصرار پر ملکہ مادر کو شیریں کے لیے پیغام دیا تھا جس کے جواب میں ملکہ مادر نے معاملہ خود شاپور پر ڈال دیا تھا۔

پس وزیر شاپور نے پہلے ایک جھرجھری لی پھر الفاظ تولتے ہوئے بولا۔

''ملکہ مادر میری اس بات سے اتفاق کریں گی کہ ملک کے تاجدار اور خاص کر دنیا کے عظیم حکمران کے لیے بڑے سے بڑا مسئلہ بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا بشرطیکہ وہ اسے حل کرنا چاہیں۔ پس مادر ملکہ کے خیال میں اگر اس مسئلے کا کوئی حل ہے تو وہ بیان فرمائیں۔ اس سلسلے میں میں ملکہ مادر کے پوری طرح ساتھ ہوں اور ان کی ہر بات اور تدبیر کی تائید کروں گا۔''

ضعیف العمر ملکہ مادر نے مسکرا کر شاپور کو دیکھا اور بولیں۔

''عقلمند وزیر شاپور کے لیے اس مسئلے کا حل کچھ زیادہ مشکل نہ تھا مگر انہوں نے اس کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی ہے اگر وہ اپنا دامن بچانا چاہتے ہیں تو کوئی بات نہیں ورنہ اس مسئلے کو مسئلہ بنانا ہی غلطی ہے کیونکہ خسرو پرویز کی پہلی ملکہ ایک شاہی میں رہتی ہے اس لیے اس میں دوسری ملکہ کا گزارہ ممکن نہیں۔ مگر یہ کس نے کہہ دیا ہے کہ ایک شاہی محل کے بعد دوسرا شاہی محل تعمیر نہیں کیا جا سکتا۔ کیا تاجدار ایران خسرو پرویز کے شاہی خزانے خالی ہو گئے ہیں کہ دوسرا محل نہ تعمیر کر سکیں۔ کیوں شاپور اس بات کا آپ کے پاس کوئی جواب ہے؟''

''مادر ملکہ کا خیال بالکل درست ہے۔'' شاپور نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''میرے شہنشاہ ایران خسرو پرویز کے خزانوں میں اس قدر زر و جواہرات موجود ہے کہ دوسرا شاہی محل ہی نہیں بلکہ اس طرح کے درجنوں دوسرے شاہی محل تیار کرائے جا سکتے ہیں۔''

''بالکل درست'' اور مادر ملکہ مسکرائی ''اور یہی اس مسئلے کا حل ہے۔ خسرو پرویز اپنی نئی ملکہ کے لیے دوسرے شاہی محل کی تیاری کا حکم دے سکتے ہیں۔''

''بہت خوب......'' اور شاپور کی باچھیں کھل گئیں۔ ''میں تاجدار ایران خسرو پرویز کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ شادی کے بعد شہزادی شیریں کے لیے ایک نیا محل تیار ہو گا جس میں شہزادی شیریں بہ حیثیت ملکہ ایران شیریں قیام کریں گی۔'' شاپور نے اس اہم اعلان کے بعد کہا۔

''اے مادر ملکہ (بعض تذکروں میں شیریں کے والد کا ذکر ہے) کیا اب میں یہ اطمینان کر لوں کہ آپ لوگوں نے اس رشتے کو بخوشی منظور کر لیا ہے اور میں اس کی اطلاع کسریٰ ایران شہنشاہ خسرو پرویز کو بھجوا سکتا ہوں۔''

مادر ملکہ نے اپنے شوہر کا منہ دیکھا اور پر سکون لہجے میں بولی۔

''میرا خیال ہے کہ اب تمام باتیں طے ہو چکی ہیں-ایک طرف شاپور ہیں جنہوں نے شہنشاہ خسرو کی طرف سے شہزادی شیریں کے رشتے کی درخواست کی ہے اور دوسری طرف میں تھی ملکہ مادر اور میرے شوہر جنہوں نے خوش دلی اور مسرت کے ساتھ اس رشتے کو منظور کر لیا ہے-اس لیے اب یہ رشتہ طے اور بالکل طے سمجھنا چاہیے-''

''مگر ٹھہریے ملکہ مادر'' شاپور بیٹھے سے اک دم کھڑا ہو کے بولا-''ہر چند یہ رشتہ دونوں طرف کے مشیروں اور بزرگوں نے منظور کر لیا ہے مگر اس مسئلہ کی اہم ترین شخصیت یعنی شہزادی شیریں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ اس معاملے اور فیصلے سے کس حد تک مطمئن ہیں-''

اس وقت تو سب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں چنانچہ شاپور نے خود ہی اس مسئلے کا حل پیش کیا-اس نے مشورہ دیا-

''بظاہر شہزادی شیریں نے اس شادی کی مخالفت نہیں کی مگر انہوں نے کسی کے سامنے اس بات کا اقرار بھی نہیں کیا کہ وہ اس شادی، تعلق اور نسبت کو دل سے پسند کرتی ہیں-''

''اے عقلمند وزیر شاپور!'' ملکہ مادر بولیں-''میرے خیال میں تمام دنیا میں اس وقت تم سے زیادہ عقلمند کوئی امیر یا وزیر نہیں ہے اس لیے میں اس معاملہ کو بھی تم پر چھوڑتی ہوں-تم جس طرح چاہو اپنا اطمینان کر سکتے ہو-''

''میں تو اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں ملکہ مادر'' شاپور نے مضبوط لہجے میں کہا-''لیکن مجھے کسریٰ ایران تاجدار خسرو پرویز کو بھی تو جواب دینا ہے اس لیے مجھے اجازت دی جائے کہ میں اس سلسلے میں شہزادی شیریں کی واضح رائے معلوم کر سکوں-آپ لوگوں کا اس سلسلے میں کیا مشورہ ہے؟''

مادر ملکہ اور اس کے شوہر نے شاپور کی بات کی تصدیق کی اور کہا-

''شاپور اگر چاہیں تو شہزادی کو یہاں بلا کر اس سے گفتگو کر سکتے ہیں یا پھر وہ میرے ساتھ شہزادی کے پاس تشریف لے چلیں۔ میں ان دونوں کی ملاقات کرا دوں گی اور انہیں تنہائی میں پوری طرح گفتگو کرنے کا موقع دوں گی تا کہ تمام معاملات قبل از وقت مکمل اور اطمینان بخش ہوں۔''

پس ایسا ہوا کہ شاپور کو ملکہ مادر کے ساتھ شیریں کی خوابگاہ میں بھیج دیا گیا تا کہ وہ کھل کر گفتگو کر سکے۔ شیریں کے انکار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس نے جس وقت کسریٰ ایران خسرو پرویز کی چوکھٹے میں لگی تصویر دیکھی تھی اسی وقت وہ شہنشاہ پرسو جان سے عاشق ہو چکی تھی اور اس وقت بھی اپنے کمرے میں پریشانی کے عالم میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی۔ وہ دل و جان ہی سے یہ چاہتی تھی کہ اسے جلد از جلد ایران بھیج دیا جائے اور وہ شاہی محل میں پہنچ کے ایران کی ملکہ عجم کا خطاب حاصل کرے۔

ادھر شاپور اور ملکہ مادر شہزادی کی خوابگاہ کی طرف گفتگو کے لیے روانہ ہوئے ادھر شہزادی شیریں کی جاسوس کنیزیں یہاں سے بھاگ کر شہزادی شیریں کے پاس پہنچ گئیں اور انہوں نے شہزادی کو مطلع کر دیا کہ شاپور اور ملکہ مادر اس سے (شیریں سے) گفتگو کرنے اور اس کی مرضی معلوم کرنے کے لیے ادھر آ رہے ہیں۔ چند ہی لمحوں بعد ملکہ مادر اور شاپور شہزادی شیریں کی خوابگا میں پہنچ گئے۔ شہزادی کی سہیلیاں اور کنیزیں انہیں دیکھ کر وہاں سے چلی گئیں تا کہ وہ لوگ کھل کے گفتگو کر سکیں۔ شاپور اور ملکہ مادر شیریں کے سامنے ایک خوبصورت صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ملکہ مادر نے نشست پر بیٹھتے ہی کہا۔

''شہزادی شیریں! ہم نے اپنے طور پر تمہاری اور کسریٰ ایران خسرو پرویز کی شادی خانہ آبادی طے کر دی ہے۔ اب ہم تمہاری آخری مرضی اور خواہش معلوم کرنے آئے ہیں۔ یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ اس وقت تمہیں جو کچھ کہنا سننا اور مطالبات پورے کرانا یا جو

شرائط منوانا ہیں ان کا کھل کر اظہار کر دو تا کہ آئندہ زندگی میں تم میں اور تاجدار ایران کسریٰ خسرو پرویز کے درمیان کوئی تنازع نہ واقع ہو سکے۔" پھر ملکہ مادر نے سانس لے کر آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"اب میں تم سے ایک ایک بات پوچھ رہی ہوں اور تم اس کا ہاں یا نہیں میں جواب دے سکتی ہو مگر یہ خیال رہے کہ جو تم اس وقت جواب دو گی اس پر تمام عمر قائم رہنا اور اس کی پابندی کرنا تمہارا فرض ہوگا۔"

"پوچھیے میری امی حضور اور ملکہ مادر" شہزادی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کے ہر سوال کا واضح جواب دوں گی۔"

"کیا تم یہ بتانا پسند کرو گی کہ تم نے کسریٰ ایران کی تصویر دیکھ کر اسے پسند کر لیا ہے؟"

"ملکہ مادر اور میری امی حضور" شہزادی شیریں نے سنبھل کر جواب دیا۔ "میں نے کسریٰ ایران کی تصویر دیکھ کر اسے دل سے پسند کیا ہے کیونکہ میرے خیال میں اس وقت دنیا جہاں میں خسرو پرویز سے زیادہ خوبصورت اور بارعب کوئی انسان موجود نہیں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ کسریٰ ایران کی پہلی ملکہ زندہ سلامت ہے اور اس کے شاہی محل میں موجود ہے۔" یہ مادر ملکہ کا دوسرا سوال تھا۔ اس سوال پر شہزادی شیریں قدرے سنجیدہ ہوئی پھر سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"ملکہ مادر! اگرچہ سوکن کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ بادشاہ اور شہنشاہ ایک عورت پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کے محلات میں کئی کئی بیویاں اور ملکائیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا جہاں کی خوبصورت عورتیں، شاہی محلات میں بطور داشتہ کے رہتی بستی ہیں اور اسی عالم میں اس دنیا سے گزر جاتی ہیں۔ پس میں بہ ہوش و حواس اعلان کرتی ہوں کہ میں کسریٰ کی ان خرابیوں اور عیبوں کے باوجود اس کی ملکہ بننا پسند کروں

گی بشرطیکہ......''

''بشرطیکہ......'' ملکہ مادر نے چونک کے پوچھا۔ ''کیا شادی کے لیے تمہاری کوئی شرط بھی ہے اور اگر ہے تو اس کی وضاحت کی جائے۔''

''جی ملکہ مادر میری بعض شرائط ہیں جن کی تکمیل کا مجھ سے شاپور نے وعدہ کیا ہے۔'' شہزادی شیریں نے صاف الفاظ میں کہا۔ ''میری پہلی شرط یہ ہے کہ میں کسریٰ کی پہلی ملکہ کے ساتھ ایک ہی محل میں نہیں رہ سکتی۔'' ملکہ مادر نے فوراً شاپور کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''محترم شاپور کیا آپ کو شہزادی شیریں کی اس شرط کا علم ہے اور اگر علم ہے تو آپ نے اس شرط کا کیا حل سوچا ہے؟''

''جی ہاں ملکہ مادر'' شاپور نے جواب دیا۔ ''اس سلسلے میں میں نے شہزادی شیریں سے وعدہ بلکہ عہد کیا ہے کہ ان کی کسریٰ ایران کی شادی کے ساتھ ہی ان کے لیے ایک الگ شاندار محل جو پہلے محل کے مقابلے کا ہوگا' دوسری جگہ تعمیر کرادیا جائے گا اور شہزادی شیریں بطور ملکہ عجم اپنے اس نئے محل میں قیام پذیر ہوں گی اور ان کے لیے وہی تمام لوازمات مہیا کر دیے جائیں گے جو اس سلطنت کی ملکہ کے شایان شان ہوتے ہیں۔''

''بہت خوب!'' ملکہ نے خوش ہو کر کہا۔ ''پس اب جبکہ تمام باتیں پہلے ہی سے طے پا چکی ہیں تو میرے اعتراض کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میرا خیال ہے کہ اس رشتے کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات اور زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے۔ شہزادی شیریں ملکہ عجم کہلائے گی اور ہماری عزت و توقیر میں اور زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔''

شہزادی شیریں کے والدین نے شاپور کی تمام باتیں بغور سنیں۔ شاپور اپنے ساتھ شہنشاہ ایران کی جو تصویر لایا تھا وہ اس نے شیریں کے باپ کے سپرد کر دی۔ اس نے تصویر کو الٹ پلٹ کے دیکھنے کے بعد تصویر اپنی بیوی یعنی شیریں کی ماں کے حوالے کرتے ہوئے

کہا-

''میرا خیال ہے کہ اس رشتے کو ضرور منظور کر لینا چاہیے- کیونکہ اب تک شہزادی شیریں کے جس قدر رشتے آئے ہیں ان میں یہ رشتہ سب سے افضل ہے- شیریں کے ملکۂ عجم بن جانے سے ہماری عزت میں اضافے کے علاوہ اور بہت سے فائدے بھی ہو سکتے ہیں- کیوں شیریں کے والد تمہارا کیا خیال ہے؟''

یہ سب باتیں تو اپنی اپنی جگہ درست اور ٹھیک ٹھاک ہیں'' شہزادی شیریں کے بوڑھے باپ نے کہا- ''مگر اس سلسلے میں شہزادی شیریں کی پسند اور رضامندی سب سے زیادہ ضروری ہے- کیونکہ ہم لوگ تو ان کی شادی کر کے اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جائیں گے مگر زندگی گزارنا تو شیریں کے صبر و تحمل اور رویے پر منحصر ہوگا- اس لیے میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں شہزادی کو پوری طرح اونچ نیچ سمجھا کر اعتماد میں لینا چاہیے-''

''ضرور......ضرور......'' شہزادی شیریں کی والدہ ملکہ مادر نے شوہر کی بات کی تائید کی- ''مگر اب یہ بتائیں کہ شیریں سے اس مسئلے میں گفتگو کون کرے گا؟''

''شیریں سے گفتگو کرنے کے لیے آپ سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے؟'' شیریں کے باپ نے فوراً کہا- ''پیٹ کا حال تو ماں سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے-''

''ٹھیک ہے'' شیریں کی ماں یعنی مادر ملکہ نے حامی بھری- ''میں ابھی جا کر تنہائی میں شیریں سے گفتگو کرتی ہوں اور واپس آ کر آپ سب کو بتاتی ہوں- میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جو فیصلہ ہو وہ جلد ہو اور سب کی مرضی سے ہو-'' اس طرح شیریں کی ماں محفل سے اٹھ کے اندر چلی گئی- اس کے اندر جانے کے بعد شیریں کے باپ نے شاپور سے پوچھا-

''اے وزیر محترم! آپ کا کیا خیال ہے- کیا میری معصوم بیٹی اتنے بڑے شاہی محل میں اکیلی رہ سکے گی؟'' شاپور مسکرایا اور جواب میں بولا-

''محترم میں نہیں بلکہ آپ ہیں- اس لیے کہ آپ کو شہنشاہ اور تاجدار ایران کسریٰ خسرو پرویز کے خسر ہونے کا فخر حاصل ہونے والا ہے- جہاں تک شہزادی شیریں کے شاہی محل میں اکیلے رہنے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں آپ بالکل مطمئن رہیں- اس لیے کہ شاہی محل میں کوئی بھی اکیلا نہیں رہتا- وہاں تو ایک دنیا آباد ہوتی ہے- دنیا جہاں کی منتخب اور ہر فن میں طاق اور مشاق خواتین شاہی محلات میں رہتی اور بستی ہیں- یوں سمجھیے کہ محل شاہی ایک سو بازاروں کا ایک بازار ہوتا ہے جہاں ہر طرح کی خواتین کے علاوہ ہر قسم کی چیزیں اور نایاب سے نایاب اشیاء دستیاب ہوتی ہیں- سیر و تفریح اور دل بہلانے کے سینکڑوں بہانے اور طریقے وہاں رائج ہوتے ہیں- کسی بھی شاہی محل میں تنہائی کا تو احساس نہیں ہوتا- ہر جگہ مجمع' قہقہے' چہچہے' اودھم دھاڑ' کھیل کود وغیرہ وغیرہ''

''مگر وہاں جو ایک ملکہ پہلے سے موجود ہے؟'' شیریں کا باپ بات کاٹ کر بولا- ''اس کی موجودگی میں کیا میری بیٹی خوش رہ سکے گی اور پرانی ملکہ اس نئی ملکہ کو برداشت کر سکے گی یا نہیں؟''

''میرے بھائی......'' شاپور نے اسے نرمی سے سمجھانا شروع کیا- ''تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے تمہاری بیٹی کی قسمت کھول دی ہے- اب یہ تمہاری بیٹی شہزادی شیریں کی عقل و دانش پر منحصر ہے کہ وہ محل کے پرانے باسیوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتی ہے- اگر انسان خود اچھا ہو تو وہ دوسروں کو بھی خواہ وہ برے ہی کیوں نہ ہوں اپنا دوست بنا لیتا ہے- پھر یہ تو طے پا چکا ہے کہ شہزادی شیریں کو پہلی ملکہ کے محل میں نہیں رکھا جائے گا بلکہ ان کے لیے ایک نیا محل تعمیر ہوگا اور یہ اپنی سہیلیوں اور خادماؤں کے ساتھ اس نئے محل میں قیام کریں گی-''

اس وقت تک شیریں اپنی سہیلی کے ساتھ برابر والے کمرے میں آ گئی تھی اور اس کی

آمد کی اطلاع پا کر شیریں کی ماں اس سے گفتگو کرنے جا رہی تھی۔

اس وقت شیریں کے باپ نے کہا۔ ''نیک بخت ذرا سنبھل کے اور خوب سوچ سمجھ کر گفتگو کرنا۔ کیونکہ یہ لڑکی کے فیصلے کے لیے پہلا اور آخری موقع ہوتا ہے۔''

''آپ بےفکر رہیں۔'' مادر ملکہ نے شوہر کو جواب دیا۔ ''میں شیریں کی ماں ہوں اور اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔'' اور شیریں کا باپ سر ہلا کر رہ گیا۔

مادر ملکہ نے بیٹی کے پاس جا کر اس سے پہلا سوال یہ کیا۔

''بیٹی شیریں کیا تمہیں معلوم ہے کہ کسریٰ ایران کے شاہی محل میں پہلے ہی سے ایک ملکہ ایران موجود ہے؟''

''مجھے علم ہے اے محترم مادر ملکہ'' شہزادی شیریں نے تحمل سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس محل میں ایک ملکہ کے علاوہ درجنوں اور ملک ملک سے آنے والی خوبصورت عورتیں اور بھی ہیں جو شہنشاہ ایران کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے رات دن کوشش میں لگی رہتی ہیں۔''

''تو کیا تم ان سب سے مقابلے کے لیے تیار ہو؟''

''جی مادر ملکہ۔ میرا جواب ہاں میں ہے۔'' شہزادی نے صاف لہجے میں جواب دیا۔

''تو کیا تمہیں امید ہے کہ تم اپنی ان تمام مخالف عورتوں کو شکست دے سکو گی؟'' یہ مادر ملکہ کا دوسرا سوال تھا۔

شہزادی شیریں نے چند لمحے ماں کو غور سے دیکھا پھر جواب دیا۔

''اے مادر ملکہ! آپ مجھ سے کہیں زیادہ باہوش اور عقلمند ہیں اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ جب دو پہلوانوں میں مقابلہ ہوتا ہے تو ان میں سے ایک جیتتا اور دوسرا ہارتا ہے۔''

''تو کیا تمہیں اپنی کامیابی کی پوری امید ہے؟'' مادر ملکہ نے پوچھا۔

''کیوں نہیں- اس کے علاوہ میں بغیر مقابلہ کے اپنی ہار کس طرح تسلیم کر سکتی ہوں- مجھ میں کیا کمی ہے- کیا میرے چہرے کے نقش و نگار دوسری دوشیزاؤں سے بہتر نہیں؟ کیا میرا رنگ وروپ سرخی مائل دودھیا نہیں؟ پھر میں اپنی شکست پہلے ہی سے کیوں تسلیم کروں- میں آپ کے سامنے اعلان کرتی ہوں کہ مجھے شہنشاہ ایران خسرو پرویز پسند ہے اور اسے پانے اور اپنانے کے لیے میں آگ کے دریا میں بھی چھلانگ لگا سکتی ہوں-''

''بس بس میری بیٹی'' مادر ملکہ نے اس کی بات کاٹ دی- ''میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ تو ضرور کامیاب ہوگی اور آخری فتح تیری ہی ہوگی-''

''اے میری ماں!'' شہزادی شیریں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا- ''مجھ میں مقابلہ کرنے کی طاقت ہے- اس لیے میں اس مقابلے کے لیے تیار ہوں- میں یہ بھی جانتی ہوں کہ انسان غلط بھی سوچ سکتا ہے- پس اگر مجھے اس مقابلہ میں ناکامی ہوئی تو میں آپ سے یا دوسروں سے کوئی شکوہ نہ کروں- یہی نہیں بلکہ میں ناکام ہونے کے بعد اپنی زندگی بھی ہار دوں گی- میں آپ کے سامنے اعلان کر رہی ہوں کہ ناکام ہونے پر میں اپنی زندگی کو خود ختم کر دوں گی- میں خودکشی کرلوں گی اور موت کو سینے سے لگا لوں گی-''

شاباش اے میری شیر دل بیٹی شاباش'' شہزادی شیری کی ماں نے کہا- ''مجھے پوری امید ہے کہ تو قیصر روم کی بیٹی کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرے گی-''

''تو پھر فیصلہ ہو گیا-'' شاپور خوش ہو کے بولا- ''میرا بھی یہی خیال ہے کہ شہزادی شیریں اس مقابلے میں ضرور کامیاب ہوگی- اچھا تو کیا اب میں یہ سمجھوں کہ شہزادی شیریں اور ان کے والدین نے میرا لایا ہوا رشتہ منظور کرلیا ہے اور میں واپس جا کر شہنشاہ ایران کو اپنی کامیابی کی خبر دے سکتا ہوں-''

اب تمام معاملات بخیر خوبی طے پا گئے تھے- شہزادی شیریں ہر چند کہ ایک ملک کی

شہزادی تھی مگر اس کا ملک تاجدار ایران کا مقابلہ تو نہ کر سکتا تھا- پس شہزادی شیریں کی یہ کامیابی تھی اس نے دنیا کے ایک عظیم شاہ اور شہنشاہ کا دل جیت لیا تھا- شیریں کے والد نے اعلان کیا-

"اے کسریٰ ایران خسرو پرویز کے قابل اعتماد وزیر شاپور! ہم نے تمام گفتگو کے بعد تمہارا تاجدار ایران کا شہزادی شیریں کے لیے لایا ہوا رشتہ منظور کیا اور اب تم تاجدار ایران کو ہماری طرف سے اس نسبت کے قبول کرنے کی مبارک باد دے سکتے ہو-"

شاپور نے جلدی سے کھڑے ہو کر شیریں کے باپ کو گلے سے لگایا اور کہا-

"میں بادشاہ اور شہنشاہ ایران کی طرف سے شہزادی شیریں اور ان کے قابل احترام والدین کو بہت بہت مبارک باد پیش کرتا ہوں-"

شہزادی شیریں کے والد نے مزید وضاحت کی-

"میری اور میری بیوی کی طرف سے تاجدار ایران کو یہ شادی مبارک ہو- چونکہ ہم نے رشتہ منظور کر لیا ہے اس لیے دستور کے مطابق شہزادی شیریں کو ایک ماہ بعد ایران بھیج دیا جائے گا تاکہ تاجدار ایران اپنی رسوم کے مطابق شہزادی سے شادی کر لیں- شہزادی کو اپنی ملکہ یعنی ملکۂ عجم بنالیں-"

شاپور اس قدر خوش تھا کہ اس نے بڑھ کر دوبارہ شیریں کے باپ کو اپنے سینے سے لگایا اور کہا-

"میں آپ لوگوں کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ اس جگہ سے کامیاب اور کامران واپس جا رہا ہوں- میرے بادشاہ اور تاجدار کی جو آرزو تھی وہ پوری ہو گئی ہے- شاہ خسرو پرویز یہ خبر سن کر بہت خوش ہوں گے-"

پھر اسی دن شام کو شیریں کے باپ نے شاپور کو بہت سے تحائف دے کر اپنے ملک

سے باعزت واپس بھیج دیا۔ شاپور کو مدائن واپس جانے کی بہت جلدی تھی اس لیے وہ قطع منازل کرتا ہوا بہت جلد ایران پہنچ گیا۔ اس نے جب خسرو پرویز کو بتایا کہ شیریں کا رشتہ منظور کرلیا گیا ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس نے غریبوں اور ناداروں کے لیے لنگر کھول دیا اور ایک ہفتے تک مسلسل ان غریبوں کو شاہی مطبخ سے دونوں وقت کھانا ملتا رہا۔

منہ سے نکلی بات پرائی ہوتی ہے۔ جب شاہی مطبخ سے مفت کھانا تقسیم ہونے کی خبر دارالسلطنت میں عام ہوئی تو لوگوں کو اس کی حقیقت معلوم کرنے کی فکر لگ گئی۔ چنانچہ لوگوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ شاہ ایران کا وزیر شاپور اپنے تاجدار کے لیے نئی ملکہ تلاش کرنے دوسرے ملک گیا تھا اور وہاں سے کامیاب لوٹا ہے تو اس خوشی میں غرباء میں کھانا تقسیم ہو رہا ہے۔

اڑتے اڑتے یہ خبر خسرو پرویز کی پہلی ملکہ یعنی قیصر روم کی بیٹی کے کانوں تک پہنچی تو اس نے اپنی جاسوس عورتوں کو چاروں طرف دوڑایا اور جلد ہی یہ عقدہ کھلا کہ وزیر شاپور ایران کے تاجدار کے لیے نئی ملکہ ڈھونڈنے گیا تھا اور وہ کامیاب و کامران واپس آیا ہے۔ یعنی وہ ایران کے تاجدار کے لیے نئی ملکہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو کر آیا ہے اور اس خوشی میں یہ لنگر جاری ہوا ہے۔ رومی ملکہ نے اور زیادہ تحقیق کی تو اسے پتہ چلا کہ ملک عجم کی ایک شیریں نام کی شہزادی ہے اور وزیر شاپور نے اس کا رشتہ خسرو پرویز سے طے کرا دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ چند دنوں کے بعد نئی ملکہ ایران آ جائے گی۔

اب تو رومی ملکہ نے قیامت برپا کر دی۔ اس نے رو رو کے اور چیخ چیخ کے شاہی محل سر پر اٹھا لیا۔ ملکہ نے تاجدار ایران خسرو پرویز کو ایسی ایسی سنائیں کہ سننے والوں نے تھو تھو مچا دی۔ اب تو یہ حال ہوا کہ ملکہ اور شاہ میں دن رات میں کئی کئی بار جنگ ہوتی اور وہ تھڑی مچتی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ پورا شاہی محل ہر وقت میدان جنگ بنا رہتا۔ خسرو پرویز نے تنگ

آ کر دربار چھوڑ دیا اور ایک کمرے میں خود کو قید کر لیا-

یہی نہیں بلکہ ملکہ نے شاپور کا داخلہ شاہی محل میں بند کر دیا- اب تو خسرو پرویز اور شاپور دونوں ہی تنگ ہو گئے- ملکہ کا خیال تھا اور صحیح خیال تھا کہ اس فتنہ کی جڑ شاپور ہے- اس لیے اس نے سخت پہرہ لگا دیا کہ وہ شاہی محل میں داخل نہ ہونے پائے- اب تو خسرو پرویز اور زیادہ پریشان ہوا- آخر شاپور نے خسرو سے ملنے کی ایک ترکیب نکال ہی لی- اس نے ملکہ ایران کی کنیزوں کی سردار کو کچھ لے دے کر اپنی طرف کر لیا اور پھر بادشاہ اور شاپور میں اس کنیز کے ذریعے ملاقاتیں ہونے لگیں-

اسی دوران شاپور نے ایک دن خسرو پرویز کو بتایا-

''شہزادی شیریں نے پیغام بھیجا ہے کہ وہ مدائن آنے کے لیے تیار ہے اس لیے اسے فوراً بلایا جائے-'' خسرو پرویز کو یہ سن کر پسینے چھوٹ گئے- اس نے شاپور کو بتایا-

''شہزادی شیریں کو میں خود بلانا چاہتا ہوں مگر ملکہ ایران تو اس کا نام بھی نہیں سننا چاہتی- وہ کہتی ہے کہ اگر شیریں یہاں آئی تو میں اس کا سر پھاڑ دوں گی-''

''واہ یہ کیا بات ہوئی؟'' شاپور کو غصہ آ گیا- ''ملکہ ایران ملکہ ہیں- شہزادی شیریں ابھی صرف شیریں ہے- مگر یہاں آنے پر حضور شاہ سے شادی کرنے کے بعد وہ بھی ملکہ ایران بن جائے گی- اس وقت دونوں کا مرتبہ برابر ہو جائے گا- ملکہ کو یہ حق تو نہیں پہنچتا کہ وہ آپ کو دوسری تیسری یا چوتھی شادی کرنے سے روکیں- آپ کی جونئی ملکہ آئے گی وہ اپنی تقدیر اپنے ساتھ لائے گی-''

''یہ تو ٹھیک ہے شاپور'' خسرو پرویز نے شکست خوردہ لہجے میں کہا- ''مگر ملکہ کو سمجھائے کون؟'' ٹھیک اسی وقت اس کمرے میں بڑا دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا اور ملکہ ایران دندناتی ہوئی وہاں نازل ہو گئی- اس نے شاپور کو دیکھتے ہی اسے پھٹکارا-

''شاپور! یہ سب کچھ کیا دھرا تمہارا ہے۔ تم نے تاجدار ایران کو بہکایا ہے اور تم اس نئی شادی کے ذمہ دار ہو۔ میں قیصر سے کہہ کر تمہارا دماغ درست کراؤں گی اور تمہیں ایران سے نکلوا کے رہوں گی۔''

''اے ملکہ ایران!'' شاپور گڑگڑایا۔ ''آپ خواہ مخواہ میرے خلاف ہو رہی ہیں۔ قسم لے لیجیے جو میں نے شہنشاہ خسرو پرویز کو اس سلسلے میں کوئی غلط مشورہ دیا ہو۔ میں نے صاف کہہ دیا ہے کہ اگر شیریں ایران کے دارالسلطنت مدائن میں داخل بھی ہوئی تو میں شہنشاہ کی ملازمت چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔'' اس کے ساتھ ہی ملکہ ایران چیخ کے بولی۔

''اور میں اپنے شہنشاہ باپ سے کہہ کر خسرو کی وہ درگت بنواؤں گی کہ یہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔ ذرا اس شیریں کو یہاں آنے تو دو پھر دیکھنا کیسا تماشہ بنتا ہے اس کا۔ جوتیوں میں دال بٹے گی یہاں۔''

وزیر سلطنت شاپور نے کسریٰ ایران خسرو پرویز کے دل میں شہزادی شیریں کی جوت جگا کے سلطنت کا سب سے اونچا مقام تو حاصل کر لیا تھا مگر رومی ملکہ سے وہ بھی ڈرتا تھا اور اب تو وہ کھل کے سامنے آ گئی تھی۔ شاپور کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ رومی ملکہ کو کس طرح راضی کرے اور آنے والی ملکہ ایران شہزادی شیریں کو کیسے لائے اور کہاں رکھے۔

آخر اس شام شاپور نے کسریٰ خسرو پرویز کے سر پر جیسے بم مارا۔ اس نے سرگوشیوں میں خسرو کو مطلع کیا۔

''شہزادی شیریں اپنے مقام سے روانہ ہو چکی ہے۔ اس کے ٹھہرانے کا انتظام کیا جائے عالی جاہ۔''

خسرو پرویز کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس نے گھبرائے لہجے میں کہا۔

''شاپور تم نے یہ کیا غضب کیا؟ پہلے اس کے رہنے بسنے کا کوئی ٹھکانہ تو بنا لیا ہوتا پھر

اسے بلاتے۔''

''ہر آنے والا اپنی قسمت اپنے ساتھ لاتا ہے۔'' شاپور نے صاف جواب دیا۔'' آخر وہ بھی تو شہزادی ہے اور آپ کے کہنے پر میں نے اسے یہاں بلوایا ہے۔''

''شاپور! میرے وزیر!'' خسرو نے ادھر ادھر دیکھ کے کہا۔'' میں کب کہتا ہوں کہ شیریں شہزادی نہیں ہے۔ وہ صرف ایک ملک عجم کی شہزادی نہیں بلکہ دنیا کی تمام حسیناؤں کی ملکہ ہے۔ مگر اسے بلانے سے پہلے اس کے رہنے کا تو انتظام کر لیا ہوتا۔ تمہاری نظر میں ہے کوئی محفوظ جگہ؟ رومی ملکہ تو شیریں کے نام ہی سے چڑتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اس معاملہ میں کیا کیا جائے؟''

شاپور نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا پھر تن کر بولا۔

''اے تاجدار ایران! آپ کو فکر کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔''

''کیا؟ کیا؟ کیا حل ڈھونڈھا ہے تم نے؟'' کسریٰ نے جلد سے پوچھا۔

شاپور نے چبا چبا کے کہنا شروع کیا۔

''اے شاہ دوراں! میرا خیال ہے کہ آپ کے ملک میں جو کوہ بے ستوں حائل ہے وہاں شیریں کے لیے ایک نہایت خوشنما محل بنایا جائے اور حالات درست ہونے تک شہزادی شیریں کو وہاں ٹھہرایا جائے۔''

خسرو پرویز شاپور کی یہ بات سن کر پھڑک اٹھا اور اس نے کہا۔

''شاپور میں نے تمہیں یونہی تو اپنا وزیر نہیں بنایا۔ میں جانتا تھا کہ تم ضرور کوئی ترکیب ڈھونڈ نکالو گے۔ میں نے تمہاری تجویز پسند کی۔ اب دیر بالکل نہ ہونی چاہیے۔ اس پہاڑ پر ''قصر شیریں'' نام کا ایک عالی شان محل جلد سے جلد تیار کراؤ۔ اس کام میں ذرا بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں اے شاہ دوراں'' شاپور اور پھول گیا۔ ''شہزادی شیریں کے لیے محل دنوں میں تیار ہو جائے گا مگر......''

''مگر کیا؟'' خسرو پرویز نے گھبرا کے شاپور سے پوچھا۔

''مگر یہ کہ اس قصر کا نام ''قصر شیریں'' نہیں رکھا جا سکتا۔'' شاپور نے قدرے متانت سے کہا۔

''کیوں؟ کیا ہم اپنے ایک محل کا نام بھی نہیں رکھ سکتے؟'' خسرو پرویز نے ناگوار انداز میں پوچھا۔

''اس کی ایک وجہ ہے شاہ دوراں'' شاپور نے جواب میں کہا۔ ''آپ کہتے ہیں کہ رومی ملکہ کو لفظ شیریں سے چڑ ہے۔ وہ اس کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتیں۔ اگر محل کا نام قصر شیریں رکھا گیا تو رومی ملکہ اور زیادہ بھڑک اٹھیں گی اور خواہ مخواہ ان کی دشمنی میں اضافہ ہو جائے گا۔''

''پھر تم ہی کوئی دوسرا نام تجویز کرو'' خسرو پرویز تھکے لہجے میں بولا۔ دراصل رومی ملکہ کے ذکر نے اس کے منہ کا ذائقہ کڑوا کر دیا تھا۔

شاپور نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔

''اس شاہی محل کا نام تو اس محل کے اندر ہی چھپا ہوا ہے۔ ہم پہلے طے کر چکے ہیں کہ یہ قصر کوہ بے ستوں پر تعمیر کیا جائے گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' خسرو پرویز نے تائید کی۔ ''وہ جگہ مجھے قصر کے لیے بہت پسند آئی مگر اس کا نام کیا ہوگا؟''

شاپور نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''قصر بے ستوں پر شہزادی شیریں کے لیے تعمیر ہونے والا قصر بے ستوں ہوگا۔ یہی نام سب سے زیادہ مناسب اور مبارک ہے۔''

''بہت خوب!'' خسرو پرویز نے فوراً تسلیم کر لیا۔ قصر بے ستوں پر شیریں کے لیے تعمیر

ہونے والے محل کا نام قصر بے ستوں واہ واہ- کیا پیارا نام ہے-"

پس نام طے ہونے کی دیر تھی- شاپور وزیر نے پانی کی طرح روپیہ بہا کر قصر بے ستوں کی تعمیر کا کام زور وشور کے ساتھ شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اور شیریں کے وہاں آنے سے پہلے ایک نہایت خوبصورت محل بن کر تیار ہو گیا-

ادھر ناز آفریں شیریں ملکۂ عجم بننے کے خواب دیکھتی اس طرف آ رہی تھی کہ شاپور تاجدار ایران خسرو پرویز کا ایک پیغام لے کر شیریں کے پاس پہنچا-

شاپور نے شہزادی شیریں کو سلام کرنے کے بعد تاجدار ایران کا پیغام پہنچایا- وزیر نے شہزادی کے حضور عرض کیا-

"کسریٰ ایران خسرو پرویز کا شہزادی شیریں کے لیے یہ پیغام ہے کہ جب تک شہزادی شیریں اور تاجدار ایران کی باقاعدہ شادی نہیں ہو جاتی اس وقت تک شہزادی قصر بے ستوں میں قیام کریں گی-"

یہ محل نہایت سرسبز اور دلکشا مقام پر تعمیر کیا گیا تھا- اس کے جنوب میں نہایت وسیع مرغزار اور سرسبز چراگاہ تھی جو دور تک پھیلتی چلی گئی تھی-

شہزادی شیریں تنہا نہیں آئی تھی بلکہ اس کے ساتھ بے شمار کنیزیں اور اس کی سہیلیاں بھی تھیں- شہزادی شیریں نے قصر بے ستوں کو بہت پسند کیا- اس نے شاپور سے کہا-

"میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ جب تک کسریٰ خسرو پرویز سے میری شادی نہیں ہوتی میں اس محل میں قیام کروں-"

خسرو پرویز نے اس کی ضرورت کا ہر قسم کا سامان اس قصر میں مہیا کر دیا تھا- شہزادی کی مرغوب غذا تازہ دودھ تھا جو چراگاہ سے لایا جا سکتا تھا- پس شاپور، شہزادی شیریں کو قصر بے ستوں میں پہنچا کر دارالسلطنت میں پہنچ گیا اور بادشاہ کو شیریں کی آمد کی اطلاع دے دی-

شاپور نے خسرو پرویز کو بتایا-

''شہزادی شیریں نے اگرچہ قصر بے ستوں میں قیام کرنا منظور کر لیا ہے لیکن وہ بھی آپ کی محبت میں بے تاب ہیں-''

کسریٰ ایران خسرو پرویز شہزادی شیریں کی آمد حال سن کر خود بھی بے تاب ہو گیا تھا- وہ جلد از جلد شہزادی کو اپنے پہلو اور اپنے محل میں دیکھنا چاہتا تھا- شاپور چونکہ بہت ذہین اور عقلمند انسان تھا اور ہر کام کے لیے نئے نئے طریقے اختیار کرتا تھا اس لیے اس نے ایک دن خسرو پرویز کو سمجھایا-

''عالی جاہ! جب تک آپ کی رومی ملکہ زندہ ہیں اس وقت تک نہ تو شہزادی شیریں یہاں آ سکتی ہے اور نہ رومی ملکہ آپ کو شیریں کے پاس جانے کی اجازت دے گی-''

''یہ دونوں باتیں ہم جانتے ہیں-'' کسریٰ ایران خسرو پرویز نے قدرے غصے میں کہا- ''مگر ہم اس مشکل کا حل چاہتے ہیں اور شہزادی شیریں سے فوراً ملاقات کے خواہش مند ہیں- تمہیں اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا ہو گا-''

''میرے دماغ میں ایک ترکیب آئی ہے' عالی جاہ-'' شاہ پور نے آخر بہت سوچ بچار کے بعد کہا-

''بتاؤ...... بتاؤ...... کیا ترکیب آئی ہے تمہارے دماغ میں؟'' خسرو پرویز بے چین ہو گیا-

''ترکیب یہ ہے کہ شہزادی شیریں سے درخواست کی جائے کہ وہ کنیزوں کا لباس پہن کے آپ کے محل میں آئیں گی تو آپ ان سے بے دھڑک مل سکتے ہیں- آپ کی رومی ملکہ یہی سمجھیں گی کہ شیریں بھی کوئی کنیز ہے- اس طرح آپ کا راز چھپا رہے گا-''

خسرو پرویز یہ ترکیب سن کر پھڑک اٹھا- اس نے کہا'' ترکیب تو بہت اچھی ہے بشرطیکہ

شیریں اسے تسلیم کر لے-"

"واہ! شیریں تسلیم کیوں نہیں کرے گی- اسے میں راضی کرلوں گا-" شاپور نے خود اس کا ذمہ اٹھایا-

مگر جب شاپور نے قصر بے ستوں میں جا کر شیریں کو یہ ترکیب بتائی تو شیریں نے شاپور کو پھٹکار دیا- اس نے صاف الفاظ میں کہا-

"شاپور! مجھے بڑا افسوس ہے کہ تم مجھے ایک کنیز بنا کر کسریٰ کے محل میں لے جانا چاہتے ہو- میں یہ بے عزتی کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتی- تم خسرو پرویز کو صاف الفاظ میں بتادو کہ وہ فوراً مجھ سے شادی کر کے مجھے شاہی محل میں لے جائیں ورنہ میں اپنے وطن واپس چلی جاؤں گی-" شاپور کے ہاتھ پیر پھول گئے- اس نے فوراً خسرو پرویز کے حضور پیش ہو کے اپنی غلطی کا اعتراف کیا- شاپور نے کسریٰ سے کہا-

"اے شاہ محترم! میں نے شہزادی شیریں کو شاہی محل میں آنے کے لیے کنیزوں کا لباس پہننے کا مشورہ دیا تھا مگر شہزادی اس بات پر سخت ناراض ہوئیں- انہوں نے مجھ سے صاف طور پر کہا ہے کہ میں آپ کو ان کا یہ پیغام پہنچادوں کہ وہ کوئی گری پڑی عورت نہیں بلکہ ایک ملک کی شہزادی ہیں اگر انہیں کنیزوں کا لباس پہننے پر مجبور کیا گیا تو وہ ایران چھوڑ کر فوراً اپنے وطن واپس چلی جائیں گی-"

خسرو پرویز اپنی ہونے والی ملکہ اور محبوبہ کا یہ جواب سن کر سن پڑ گیا- اس نے فوراً شاپور سے کہا:

"میں نے کتنی کوشش سے شہزادی شیریں کو یہاں بلوایا ہے- اگر وہ ناراض ہو کر واپس چلی گئی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا- شاپور تم کوشش کرو کہ شیریں واپسی کا خیال دل سے نکال دے اور مجھ سے محبت کرنے لگے-" شاپور نے کسریٰ کو سمجھایا-

''اے تاجدار ایران! آپ بھی تو بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہیں- اپنے دل کو قابو میں رکھیے ورنہ آپ شہزادی شیریں کو اپنے ہاتھ سے کھو دیں گے- آپ مرد ہیں- صبر سے کام لیجیے- آج نہیں تو کل شہزادی شیریں آپ کی ہو جائے گی-''

شاپور کے زور دینے پر خسرو پرویز نے شیریں کو محل شاہی میں بلانے کا خیال چھوڑ دیا اور حالات بہتر ہونے کا انتظار کرنے لگا-

ادھر تو شیریں کا یہ مسئلہ دب گیا مگر دوسری طرف شہزادی شیریں کے سلسلے میں ایک نیا جھگڑا شروع ہو گیا اور وہ قصہ تھا شیریں فرہاد کا عشق یا حماقت- اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ شہزادی شیریں کو تازہ دودھ پینے کا جنوں کی حد تک شوق تھا مگر دودھ دینے والے جانوروں کی تمام چراگاہیں شمالی پہاڑی علاقوں میں تھیں- شہزادی کے لیے وہاں سے روزانہ دودھ منگایا جاتا تھا جو اس کے محل تک پہنچتے پہنچتے خراب اور بے مزہ ہو جاتا تھا-

چنانچہ ایک دن شہزادی شیریں نے وزیر شاپور سے درخواست کی-

''اے محترم وزیر! میری ایک مشکل آسان کیجیے-''

شاپور نے مسکرا کر جواب دیا-

''شہزادی شیریں اور مشکل؟'' آپ حکم دیجیے- میں فوراً تعمیل کروں گا-''

شیریں نے بتایا-

''آپ کو معلوم ہے کہ مجھے تازہ دودھ پینے کا جنوں کی حد تک شوق ہے مگر دودھ دینے والے مویشیوں کی چراگاہیں شمالی پہاڑوں میں ہیں- وہاں سے دودھ میرے محل تک آتے آتے بدذائقہ اور خراب ہو جاتا ہے-''

''آپ ٹھیک فرما رہی ہیں شہزادی-'' شاپور نے تائید کی-'' چراگاہیں واقعی بہت شمال میں واقع ہیں مگر اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟''

''علاج تو ہے مگر ذرا مشکل اور دشوار ہے۔'' شیریں نے جواب دیا۔

''آپ بتلائیے تو۔ اس دنیا کی ہر مشکل کا حل اسی دنیا میں موجود ہے۔ آپ فرمائیے تو'' شاپور نے زور دے کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے......'' شہزادی نے کہنا شروع کیا۔ ''اگر شمالی چراگاہ سے ایک سنگی نہر کھود کر میرے محل تک پہنچائی جائے تو اس نہر کے ذریعے فوراً اور تازہ دودھ مجھے روزانہ میسر آ سکتا ہے۔''

شاپور نے چند لمحے غور کیا پھر بولا۔

''شہزادی شیریں کی بات تو درست ہے مگر ہے ذرا مشکل۔''

اور اس کے جواب میں شہزادی نے مسکرا کر کہا۔

''اور اس مشکل کو شاپور آسان کر سکتے ہیں۔ کیوں اے وزیر با تدبیر! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' اگر آپ کوشش کریں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔''

شاپور سوچ میں پڑ گیا۔ شمالی علاقہ میں پتھر کی نہر نکال کر قصر شیریں تک لانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ شاپور کی خاموشی اور چپ نے طول کھینچا تو شہزادی نے ہنس کر کہا۔

''اے شاپور! آپ زیادہ فکرمند نہ ہوں اگر شمال سے میرے محل تک جوئے شیر جاری نہیں ہو سکتی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا ہرگز نہیں۔''

شاپور ایک دم چونک پڑا۔ جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اس نے شہزادی شیریں سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ کام زیادہ مشکل نہیں۔ میرے ذہن میں ایک ایسا آدمی ہے جو اس کام کو آسانی سے کر سکتا ہے۔''

''کون شخص ہے وہ؟'' شہزادی نے دلچسپی سے کہا۔

''وہی سنگتراش جس نے آپ کے اس محل کے لیے یہاں کی تمام پہاڑیوں کو ریزہ ریزہ کر کے زمین کو ایسا ہموار کیا تھا جس پر آج یہ محل کھڑا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ محل کی تعمیر سے پہلے اس جگہ اونچی نیچی پہاڑیاں ہی پہاڑیاں تھیں۔''

شہزادی نے جواب دیا۔ ''میں نے خود تو نہیں دیکھا مگر یہ ضرور سنا ہے کہ محل کی تعمیر سے پہلے یہ ایک ناہموار پہاڑی جگہ تھی۔''

''میں اسی سنگتراش کا ذکر کر رہا ہوں۔'' شاپور نے جواب دیا۔ ''میں سوچتا ہوں کہ جو سنگتراش پہاڑیوں کو میدان میں تبدیل کر سکتا ہے وہ پہاڑی علاقے میں نہر بھی کھود سکتا ہے تعمیر کر سکتا ہے۔''

''تو پھر آپ دیر نہ کیجیے شاپور'' شیریں لجاجت سے بولی۔ ''اس کو آج ہی بلوا لیجیے۔ میں ضروری باتیں اس کو سمجھا دوں گی۔''

چنانچہ شاپور نے اسی شام سنگتراش کو شہزادی شیریں کے حضور پیش کر دیا۔ یہ سنگتراش ایک گٹھیلے جسم کا ادھیڑ عمر کا انسان تھا۔ اس کے ساتھ اس کا نوعمر بیٹا بھی تھا جس کا نام ''فرہاد'' تھا۔ فرہاد ایک شرمیلا سا نوجوان تھا مگر اپنے باپ اور شہزادی شیریں کی گفتگو بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ سنگتراش اور شہزادی شیریں میں یہ گفتگو شہزادی کے ڈرائنگ روم میں ہو رہی تھی۔ شاپور اور فرہاد سنگتراش کے ساتھ تھے۔

شہزادی شیریں نے سنگتراش کو تفصیل سے نئی نہر کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھایا۔ ان کی گفتگو کے دوران سنگتراش کا نوعمر بیٹا فرہاد بار بار شہزادی شیریں کو دیکھتا رہا تھا۔ گفتگو کے اختتام پر شیریں نے سنگتراش سے پوچھا۔

''یہ تمہارے ساتھ کون آیا ہے؟''

''میرا بیٹا فرہاد ہے شہزادی صاحبہ۔'' سنگتراش نے بڑے فخر سے کہا۔ ''بہت ذہین ہے

میرا بیٹا۔اس نے اس عمر میں ہی سنگتراشی شروع کر دی ہے لیکن......"

"اچھا اچھا تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔" شاپور نے سنگتراش کو روک دیا کیونکہ اس نے فرہاد کی پوری تفصیل بیان کرنا شروع کر دی تھی۔

مختصر گفتگو کے بعد معاملات طے ہو گئے اور سنگتراش دوسرے دن سے کام شروع کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن سے شیریں کے لیے جوئے شیر کھدنا شروع ہو گئی۔ اس نہر کو استاد گر بوڑھا سنگتراش کھود رہا تھا۔ اس کے کام میں اس کا نوعمر مگر خوبصورت نوجوان بیٹا فرہاد بھی شامل تھا۔ فرہاد کا باپ اسے اس کام میں نہیں لگانا چاہتا تھا مگر فرہاد نے ملکہ شیریں کو جس وقت بہت قریب سے دیکھا تو اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔ ملکہ شیریں نہر کی کھدوائی میں پوری پوری دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ روزانہ موقع پر پہنچ جاتی اور شام تک وہیں رہتی۔

اس طرح سنگتراش کے نوعمر اور دل پھینک بیٹے فرہاد کو ملکہ شیریں کو دیکھنے کا روز ہی موقع ملتا تھا اور ملکہ شیریں اسے ایک ابھرتا ہوا سنگتراش سمجھتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ اس قربت سے فرہاد آہستہ آہستہ شیریں کے قریب ہوتا گیا۔ دوسری طرف شیریں کو فرہاد کے خیالات اور جذبات کا علم نہ تھا۔ مگر جب فرہاد کے باپ نے بیٹے کو ملکہ کے عشق میں مبتلا دیکھا تو اس نے فرہاد کی اچھی طرح پٹائی کی اور اسے کام پر اپنے ساتھ لے جانا بند کر دیا۔

فرہاد اس بندش سے کھل کھیلا۔ اس کا باپ جس قدر بیٹے کو ملکہ شیریں سے دور رکھنے کی کوشش کرتا فرہاد اتنا ہی شیریں کے قریب ہوتا گیا۔ فرہاد کو اب ملکہ شیریں سے محبت نہیں بلکہ عشق ہو گیا۔ وہ واقعی شیریں کے پیچھے دیوانہ ہو گیا۔ فرہاد کے باپ نے اسے قید میں رکھا مگر اس کے سر سے شیریں کے عشق کا بھوت نہ اترا اور وہ اس محبت میں دیوانہ ہو کر گلی گلی اور محلے

محلے شیریں شیریں کے نعرے لگانے لگا- پھر یہ بات اس قدر پھیلی کہ کسریٰ ایران خسرو پرو
کے کانوں تک پہنچ گئی-

اس وقت خسرو پرویز کی پہلی بیوی روم کی شہزادی کا انتقال ہو چکا تھا اور خسرو پرویز ـ
میدان صاف دیکھ کے شیریں سے شادی کر کے اسے ملکہء عجم بنا دیا تھا- اس بات کا پہ
اظہار کیا جا چکا ہے کہ کسریٰ ایران خسرو پرویز کے رومی شہزادی کے بطن سے ایک بیٹا تھا جس
نام شیرویہ تھا- جس وقت خسرو پرویز شیریں کو شاہی محل میں لایا تھا تو اس وقت شیرویہ ـ
شیریں کو دیکھ لیا تھا- شیریں کے حسن و جمال نے شہزادے شیرویہ کے دل پر ایسا اثر کیا کہ
بھی فرہاد کی طرح شیریں کو خود ہی دل دے بیٹھا-

اب شیریں، خسرو پرویز کی ملکہء عجم تھی اور اس کے دو عاشق زار پیدا ہو گئے تھے- ایک
سنگتراش کا بیٹا فرہاد اور دوسرا خسرو پرویز کی پہلی بیوی کا بیٹا شیرویہ- چنانچہ فرہاد اور شیرو
دونوں ہی عاشق زار، ملکہ شیریں کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گئے-

اب کسریٰ ایران نے ایک دن شاپور کو بلا کر اس سے شکوہ کیا- اس نے وزیر شاپور ـ
کہا-

''اے شاپور! یہ فرہاد کون ہے جو ہر جگہ شیریں شیریں کے نعرے لگاتا پھرتا ہے-''

شاپور نے جواب دیا ''یہ بات درست ہے عالی جاہ- سب نے ہی یہ سنا ہے-''

خسرو پرویز نے حکم دیا-

''اس نابکار کو گرفتار کر کے پیش کیا جائے تاکہ اسے قتل کرایا جا سکے-''

شاپور نے اس کی مخالفت کی اور عرض کیا-

''فرہاد کا قتل مناسب نہیں ہے عالی جاہ- اس سے ملکہ عجم کی بدنامی اور رسوائی ہو گی-''

خسرو پرویز نے کہا-

''پھر تم ہی بتاؤ کہ اس کم بخت فرہاد کا جھگڑا کس طرح ختم کیا جائے۔''

شاپور نے کسریٰ ایران کو رائے دی۔

''جہاں پناہ فرہاد کو بلا کر اس کو حکم دیں کہ دارالسلطنت اور جنوبی علاقے کے درمیان جو اونچی اونچی پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے اس کی وجہ سے فوج کو تمام ایران پر تسلط قائم رکھنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اس لیے ان پہاڑیوں کو کاٹ کر میدان میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس کے لیے فرہاد سے یہ وعدہ کیا جائے کہ اگر اس نے یہ کام بخوبی انجام دیا تو اس کی محبوبہ شیریں کو اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔''

خسرو پرویز چونک کے بولا۔

''اور اگر فرہاد نے یہ کام انجام دے دیا تو......؟''

''عالیجاہ!'' شاپور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''یہ کام ایک فرہاد تو کیا سو فرہاد بھی مل کر انجام دینا چاہیں تو پورا نہ کر سکیں گے۔ پس فرہاد اپنی جان عزیز اس کوشش میں ختم کر دے گا اور وہیں پتھروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر ختم ہو جائے گا۔''

شاہ ایران نے اس حکمت کو پسند کیا مگر ہمارے قلم کار دوستوں نے فرہاد کی موت پر طرح طرح کے حاشیے چڑھائے ہیں۔ ایک مہربان نے لکھا ہے کہ فرہاد ایران کے درمیان واقع پہاڑی سلسلوں کو کاٹنے اور تراشنے میں ہمہ تن مشغول ہو گیا اور اس نے سال دو سال کی کوشش میں پہاڑیوں کو میدان میں تبدیل کر دیا۔ اب اس نے شاہی دربار میں جانے کی تیاری کی کہ وہاں جا کر اپنی محبت اور محنت کا صلہ حاصل کرے۔ وہ یہ تیاری کر رہا تھا کہ ایک بوڑھی عورت فرہاد کے پاس روتی پیٹتی پہنچی اور اس نے اطلاع دی۔

''اے ناشاد اور نامراد فرہاد! تو اب کوشش کر رہا ہے جبکہ تیری شیریں تو قضائے الٰہی سے ملک عدم روانہ ہو چکی ہے۔''

فرہاد نے یہ جگر خراش خبر سنی تو اس کا سر پھر گیا- اس نے دلدوز چیخ ماری اور اپنے تیشے کو سر سے بلند کر کے اپنے ماتھے پر اس زور سے مارا کہ اس کا سر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا- وہ زمین پر گر گیا اور تڑپ تڑپ کر جان جان آفریں کے حوالے کر دی- فرہاد خواہ مخواہ مارا گیا کیونکہ یہ خبر خسرو پرویز نے ایک کٹنی کے ذریعہ فرہاد تک پہنچوائی تھی جس کی تاب نہ لا کر فرہاد نے خودکشی کر لی-

شیریں کی موت کے سلسلے میں یہ افسانہ گڑھا گیا کہ جب اسے فرہاد کے مارے جانے کی خبر ہوئی تو وہ ڈھونڈتی ڈھونڈتی فرہاد کی قبر پر پہنچی اور اس نے اللہ پاک سے یہ دعا کی-

''اے پاک پروردگار! میں زندگی بھر تو اپنے محبوب کی شکل نہ دیکھ سکی- اگر تو مجھ پر مہربانی کرے تو فرہاد کی قبر کھول دے تاکہ میں اس کا دیدار کر سکوں-''

پس خدائے ذوالجلال والاکرام نے شیریں پر رحم کیا اور فرہاد کی قبر کھول دی- شیریں نے فرہاد کو قبر میں سوتے ہوئے دیکھا تو ''ہائے فرہاد'' کا نعرہ لگایا اور قبر کے اندر خود بھی کود پڑی- پھر قبر حکم خداوندی سے بند ہو گئی اور اس طرح عاشق و معشوق مرنے کے بعد ایک دوسرے سے مل گئے-

شیریں کی موت کا ایک افسانہ اس طرح بھی بیان ہوا ہے-

کسریٰ ایران خسرو پرویز کا ایک بیٹا شیرویہ نام کا تھا- اس نے اپنے باپ کی محبوبہ یعنی اپنی سوتیلی ماں کو دیکھا تو اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس پر عاشق ہو گیا- اس کے بعد اس نے اپنی محبوبہ (شیریں) کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں- اس نے اپنے باپ خسرو پرویز کے خلاف بغاوت کر دی اور اسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا-

پھر اس نے شیریں کے پاس شادی کا پیغام بھیجا- شیریں نے دو شرطوں کے ساتھ یہ پیغام قبول کر لیا- شیریں کی پہلی شرط یہ تھی کہ اس کی تمام ضبط شدہ مال، دولت اس کے متعلقین

میں تقسیم کر دی جائے- دوسری شرط یہ تھی کہ اسے اپنے شوہر یعنی خسرو پرویز کی قبر پر جانے اور وہاں اس پر اس کا ماتم کرنے کی اجازت دی جائے-

شیرویہ نے دونوں شرطیں منظور کر لیں- شیریں کا مال اور دیگر قیمتی سامان اس کے عزیزوں اور ملازمین کو واپس کر دیا گیا- پھر شیریں کو خسرو پرویز کی قبر پر جانے کی اجازت دی گئی- شیریں نے اپنا سب سے زیادہ قیمتی لباس زیب تن کیا اور ہیرے جواہرات کے زیورات سے خود کو آراستہ اور پیراستہ کیا اور خسرو پرویز کی قبر پر گئی-

شیریں خسرو کی قبر سے لپٹ کر کچھ دیر روتی رہی پھر اس نے کپڑوں میں چھپی ہوئی ایک شیشی کو نکالا- اس شیشی میں زہر ہلاہل بھرا ہوا تھا- شیریں نے وہ زہر اپنے حلق میں الٹ لیا اور خسرو کی قبر پر تڑپ تڑپ کر مر گئی-

نور جہاں

اپنے حسن خداداد، تدبر اور فراست سے بننے والی ہندوستان کی با اختیار ملکہ

برصغیر پاک و ہند میں سلطنت اسلامیہ مغلیہ کا بانی شہنشاہ ظہیر الدین بابر کہا جاتا ہے۔ بر خاندانی طور پر بھی ایک عظیم شخصیت تھا کیونکہ اس کی رگوں میں دو عظیم فاتحوں کا خون دوڑ ہا تھا۔ وہ باپ کی طرف سے ایشیا کے نامور فاتح امیر تیمور کی اولاد تھا اور ماں کی طرف سے ں کا شجرۂ نسب چنگیز خاں سے جا ملتا تھا جسے خونیں فتوحات کی وجہ سے ''قہر الٰہی'' کہا جاتا ہے۔ بابر ہمیشہ اپنے آپ کو ترک کہتا تھا اور تا تاریوں یا منگولوں (مغلوں) سے اپنی نسبت کو پنے لیے باعث عار خیال کرتا تھا مگر اس زمانہ میں برصغیر کے لوگ شمال مغرب سے آنے الے ہر حملہ آور کو ''مغل'' کہتے تھے۔ اس لیے اس کا خاندان' خاندان مغلیہ کے نام سے حروف ہوا۔

امیر تیمور کی وفات پر اس کی وسیع سلطنت' تیموری شہزادوں میں تقسیم ہو گئی۔ شہنشاہ بر کا دادا ابو سعید مرزا وسط ایشیا اور خراساں کا بادشاہ تھا۔ اس کی سلطنت مکران اور دریائے ندھ تک پھیلی ہوئی تھی جس کا پایہ تخت ہرات تھا۔ پھر ابو سعید مرزا کے بعد اس کی سلطنت ں کی چاروں اولادوں میں تقسیم ہو گئی۔

بڑے بیٹے احمد مرزا کو سمرقند و بخارا ملا' دوسرا بیٹا بدخشاں کا حاکم ہوا' تیسرے بیٹے الغ زا نے کابل اور غزنی کی حکومت سنبھالی اور چوتھے بیٹے عمر شیخ مرزا نے فرغانہ پر قبضہ جمایا ر اس نے اندیجان کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ ہندوستان کا مغل شہنشاہ بابر اسی عمر شیخ کا بیٹا تھا۔

بابر ۱۴ فروری ۱۴۸۳ء جمعہ کے مبارک دن پیدا ہوا۔ اس کی عمر صرف گیارہ سال اور کچھ ماہ تھی کہ اس کے باپ نے انتقال کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کمسنی ہی میں بابر کو فرغانہ کے تخت پر بٹھایا گیا اور اس نے اس عمر میں خود کو ایک قابل تحسین شہ سوار، اچھا نشانہ باز اور ایک کامیاب شکاری ثابت کیا۔

بابر جب قصہ خوانوں سے اپنے جد اعلیٰ امیر تیمور کی جنگی فتوحات اور کارناموں کا ذکر سنتا تو خون اس کی رگوں میں تیزی سے گردش کرنے لگتا۔ اس کے دل میں روز اول ہی سے یہ خواہش چٹکیاں لیتی تھی کہ کسی طرح وہ اپنے مورث اعلیٰ امیر تیمور کے پایۂ تخت سمرقند پر قبضہ کرے۔

چنانچہ اس حوصلہ مند نوخیز جوان نے اپنے چچا کے انتقال پر ۱۴۹۶ء میں سمرقند پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے حوصلہ نہ چھوڑا اور اگلے سال دوبارہ کوشش کی اور وہ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت بابر کی عمر صرف پندرہ سال تھی اور اس عمر میں سمرقند کی فتح نے بابر کو بے پناہ شہرت دی۔ شاہی زمانوں میں فتح و شکست کا ہر جگہ او ہر وقت چرچا رہتا تھا چنانچہ بابر بھی اس سے دوچار ہوا۔ اگلے ہی سال بابر کے بھائی جہانگیر کے خلاف فرغانہ میں بغاوت ہو گئی۔ بابر بھائی کی مدد کے لیے سمرقند سے نکلا تو قسمت نے رنگ دکھایا کہ سمرقند بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اب بابر ایک بے تخت و تاج بادشاہ تھا مگر اس نے دل نہ چھوٹا کیا اور نہ ہمت ہاری چنانچہ موسم گرما آتے ہی اس نے فرغانہ پر حملہ کیا اور کامیاب و کامراں ہوا۔ بعد ازاں ۱۵۰۰ میں اس نے سمرقند کا پھر رخ کیا۔ اس وقت سمرقند پر ازبک سالار شیبانی خاں کا قبضہ تھا مگر با نے صرف اڑھائی سو ساتھیوں کو لے کر رات کے وقت حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ یہ فتح بابر دلیری کا ایک بڑا ثبوت تھا مگر یہ قبضہ زیادہ دن نہ رہا اور شیبانی خان نے صرف آٹھ ماہ بعد با

کو شکست دے کر سمرقند حاصل کر لیا اور بابر وسط ایشیا میں مارا مارا پھرنے پر مجبور ہو گیا۔

سمرقند ہاتھ سے نکل جانے پر بابر نے کابل کا رخ کیا اور بغیر کسی خونریزی کے وہ کابل پر قابض ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے غزنی تک کا علاقہ اپنے زیر نگیں کر لیا اور ۱۵۰۷ء میں اس نے ''پادشاہ'' کا لقب اختیار کر لیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ امیر تیمور کا جانشین اور تیموریہ خاندان کا بزرگ ترین فرد ہے۔

اس دوران یعنی ۱۵۱۰ء میں جب شیبانی خان، شاہ ایران کے ہاتھوں مرو کی جنگ میں شکست کھا کر مارا گیا تو بابر کے دل میں پھر سمرقند حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس سلسلہ میں اس نے شاہ ایران سے مدد طلب کی۔ شاہ ایران اسماعیل صفوی نے مدد کی لیکن یہ شرط رکھی کہ بابر ''شیعہ'' مذہب اختیار کرے۔ چنانچہ لالچی بابر نے سمرقند حاصل کرنے کے لیے اپنا مذہب بدل دیا اور وہ سنی عقیدہ چھوڑ کر شیعہ ہو گیا۔

شاہ ایران اسماعیل صفوی نے شرط کے مطابق بابر کی فوجی مدد کی اور بابر نے ایرانیوں کی مدد سے سمرقند حاصل کر لیا مگر وسط ایشیا کی سنی آبادی بابر کی سخت مخالف ہو گئی اور ازبکوں نے اسے ایک بار پھر وسط ایشیا سے نکال دیا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد بابر نے پھر برصغیر (پاک و ہند) پر اپنی نظریں جما دیں اور سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھی۔ (روایت ہے کہ اس دوران بابر کی ایک ترک ماہر استاد علی سے ملاقات ہوئی جس نے بابر کی قسمت کو پلٹ کر رکھ دیا۔ استاد علی، بابر کو روز دیکھتا اور اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بابر بھی اسے دلچسپی سے دیکھتا تھا مگر شناسائی نہ ہونے کی وجہ سے اس سے مخاطب ہونے سے ہچکچاتا تھا۔ یہی کچھ کیفیت استاد علی کی تھی۔

مگر جب قدرت کسی کی مدد کرنا چاہتی ہے تو اس کے سامان پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایک بار بابر کی استاد علی سے اتفاقیہ ایک قہوہ خانے میں ملاقات ہو گئی۔ بابر تھکا ہارا قہوہ خانے

میں داخل ہوا جبکہ استاد علی وہاں پہلے سے بیٹھا ہوا تھا- بابر کو قہوہ خانہ میں داخل ہوتے دیکھ کر استاد علی اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور محبت سے بولا-

''کیا جواں عمر بابر میرے ساتھ قہوہ پینے کی دعوت قبول کریں گے؟''

بابر نے چونک کر علی استاد کو دیکھا اور نرمی سے کہا-

''کیا آپ نے مجھے مخاطب کیا ہے؟''

''بالکل بالکل میں نے آپ کو صرف مخاطب ہی نہیں کیا ہے بلکہ میں ایک عرصہ سے آپ سے گفتگو کرنے کا آرزومند بھی ہوں-'' استاد علی نے بڑی نرمی اور سلیقے سے جواب دیا-

بابر پہلے تو جھجکا مگر جب اس نے اپنے مخاطب کو غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر بابر کو اپنائیت کے سائے نظر آئے- اس نے کہا

''مجھے خوشی ہے کہ ایک اجنبی نے مجھے اتنے خلوص سے مخاطب کیا- کیا میں آپ کے نام نامی اور اسم گرامی سے آشنا ہو سکتا ہوں؟''

''ضرور- ضرور'' استاد علی نے اسی محبت سے جواب دیا- ''میرا نام علی ہے مگر لوگ مجھے استاد علی کے نام سے پکارتے ہیں- میرا تعلق ایک ترک گھرانے سے ہے-''

''بہت خوب'' بابر ہنستے ہوئے بولا- چونکہ آپ کا نام علی ہے اس لیے مجھے خیال گزرا کہ آپ کو جنگ اور فنونِ جنگ سے کسی نہ کسی طور ضرور تعلق اور علاقہ ہوگا-''

''میں اپنے جواں عمر اجنبی دوست کے اندازے کی داد دیتا ہوں'' استاد علی نے بڑی مسرت سے کہا- ''مجھے دراصل جنگی آتشیں اسلحہ تیز کرنے کا شوق ہے بلکہ یہی میرا پیشہ ہے- اگر نوجوان میرے شوق اور پیشے کو پسند نہیں کرتے تو میں معذرت خواہ ہوں-''

''یہ آپ کیا فرما رہے ہیں استاد علی!'' بابر نے جواب دیا- ''آپ تو بڑے کام کے

آدمی ہیں- میں آپ سے مل کے بہت خوش ہوا اور انشاء اللہ ہماری یہ ملاقات ایک پختہ دوستی کی بنیاد بنے گی-''

''ضرور......ضرور......'' استادعلی نے تائید کی-

پھر ان دونوں میں پکی دوستی' یارانہ اور بھائی چارہ ہو گیا- استادعلی ایک اچھے اسکیمر بھی تھے- بابر نے ان کے مشوروں پر سنجیدگی سے غور کیا اور دوسری طرف استادعلی نے ان کے لیے آتشیں اسلحہ تیار کرنا بھی شروع کر دیا- بابر نے جلد ہی ایک چھوٹی سی فوج بنائی اور استادعلی نے اس مختصر فوج کے لیے توپ خانہ اور آتشیں اسلحہ تیار کرنا شروع کر دیا- یہ بابر کا ایک انقلابی قدم تھا جو آئندہ کے لیے اس کی کامیابیوں کا سبب بنا-

اب بابر نے اپنے آئندہ قدم کے بارے میں سوچنا شروع کیا- اس نے وسط ایشیا میں ٹھہرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور اپنی پوری توجہ برصغیر پر لگا دی- چنانچہ ۱۵۱۹ء میں بابر نے استادعلی کے مشورے اور ان کے تیار کردہ آتشیں اسلحہ کے ساتھ دریائے بھیرہ کو عبور کیا اور بھیرہ اور خوشاب کو فتح کر لیا- پھر ۱۵۲۳ء میں قندھار اور ۱۵۲۴ء میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر لاہور پر قبضہ کر لیا اور بازار کو نذر آتش کر دیا-

اب برصغیر پر مکمل قبضے کے لیے پانی پت کے میدان میں معرکہ شروع ہوا- بابر کے سامنے سلطان ابراہیم ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کے ساتھ موجود تھا- جنگ شروع ہوئی اور بابر نے کچھ ایسی حکمت عملی استعمال کی کہ دوپہر ہونے تک سلطان ابراہیم شکست سے دوچار ہوا اور بابر نے برصغیر میں زوال پذیر مسلم سیاست میں نئی جان ڈال دی- اس موقع پر گوالیار کے راجہ بکرماجیت کے خاندان کے افراد نے اسے ''کوہِ نور'' ہیرا پیش کیا جس کے متعلق بابر نے ''تزک بابری'' میں لکھا ہے-

''کوہِ نور ہیرے کی قیمت پوری دنیا کے نصف یوم کے خرچ کے برابر ہے-''

یہ سب کچھ تھا اور مغلوں نے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا مگر پاک وہند کی شدید گرمی کی وجہ سے مغل امرا کے دل سرد پڑ گئے تھے اور وہ کابل واپس جانے کے لیے بے تاب تھے۔ چنانچہ بابر لکھتا ہے۔

''مجھے جیسے ہی ایسی سرگوشیوں کا علم ہوا' میں نے امراء اور بیگ اپنے پاس طلب کیے اور کہا کہ تائید ایزدی سے میں نے اپنے حریفوں کو شکست دے کر ان کے علاقوں کو زیرنگیں کیا ہے۔ اب وہ کون سی مجبوری ہے کہ ہم کسی سبب کے بغیر اپنے اس مقصود سے منہ موڑ لیں اور یاس وحرماں کا پیکر بنے کابل کی راہ لیں۔ پس جو میری دوستی کا دم بھرتا ہے وہ ایسی بات منہ سے نہ نکالے تاہم جو شخص یہاں رہنے کی ہمت نہیں رکھتا وہ جا سکتا ہے۔''

بابر کے ان الفاظ نے تریاق کا کام کیا۔ فوج میں احساس غیرت بیدار ہوا اور انہوں نے برصغیر میں ٹھہرنے کا عزم کیا۔

بابر کی وفات عجیب وغریب انداز میں ہوئی تھی۔ اسے ابراہیم لودھی کی والدہ نے زہر دلوایا تھا جس کی وجہ سے اسے بار بار بخار آتا تھا۔ انہی دنوں بابر کا بیٹا ہمایوں بیمار ہوا اور ایسا شدید بیمار ہوا کہ اس کی زندگی سے ناامیدی ہوگئی۔ اس وقت بابر نے اس کی چارپائی کے تین چکر لگائے اور خلوص دل سے بیٹے کے لیے دعا کی اور خدا نے اس کی دعا قبول کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہمایوں صحت یاب ہوا اور بدلے میں بابر نے ۱۵۳۰ء میں وفات پائی۔

بابر کے بعد ہمایوں اور اکبر نے برصغیر میں مغل تخت وتاج سنبھالا اور اس میں چار چاند لگائے۔ ان کے بعد نورالدین محمد جہانگیر نے مغل تخت وتاج کو رونق بخشی۔ شہنشاہ اکبر اپنی زندگی کی چھبیس بہاریں دیکھ چکا تھا لیکن اس کی کوئی اولاد نہ تھی چنانچہ وہ شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے اولاد کے لیے دعا کا طالب ہوا۔ آخر ۳۰ اگست ۱۵۶۹ء میں خدا نے اسے چاند سا بیٹا عطا کیا۔ چونکہ اس کی پیدائش کے لیے شیخ سلیم نے دعا کی تھی اس

لیے اکبر نے بیٹے کا نام شیخ سلیم کے نام پر ''محمد سلطان سلیم'' رکھا۔ مگر اکبر کو شیخ کے نام کا اس
ندر احترام تھا کہ وہ بیٹے کو سلیم کے نام سے نہ پکارتا بلکہ ''شیخو بابا'' کہہ کر آواز دیتا تھا۔
شہزادہ سلیم کی رسم ختنہ اکتوبر ۱۵۷۳ء میں ادا ہوئی۔ اس کے بعد شہزادے کی تعلیم و
زبیت کا آغاز ہوا۔ اس کے نامور استادوں میں عبدالرحیم خانِ خاناں کا نام سرفہرست ہے
وعربی، فارسی، ترکی، سنسکرت کا حنبل تھا اور شعروادب میں اس کا خاص مقام تھا۔ شہزادے
سلیم کو خدا نے مضبوط جسم اور ایک اعلیٰ ذہن عطا کیا تھا۔ اس نے عالموں اور فاضلوں کی
صحبت سے خوب فائدہ اٹھایا مگر اسے شراب کی بری عادت پڑ گئی جو عمر کے ساتھ بڑھتی رہی
ور اس کی صحت کو خراب کرتی رہی۔
ملکہ مہرالنساء نور جہاں اس شہزادہ سلیم یعنی ہند کے شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کی دلربا
بوی اور سب سے زیادہ چہیتی ملکہ ہند تھی۔
پندرہ سال کی عمر میں شہزادہ سلیم کی پہلی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی مان بائی جسے
ند میں ''شاہ بیگم'' کہا جاتا تھا، سے ہوئی۔ اس دوران اسے انتظامی فرائض سونپے گئے۔
ہاں تک کہ ۱۵۷۷ء میں اسے دہ ہزاری منصب عطا ہوا۔ عجیب اتفاق ہے کہ اسی سال
ہانگیر کی محبوب ملکہ نور جہاں کا باپ افلاس کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنے وطن سے بے وطن ہوا
ر قسمت آزمائی کے لیے برصغیر روانہ ہوا۔
نور جہاں کا اصل نام مہرالنساء تھا۔ وہ مرزا غیاث بیگ کی لڑکی تھی جو تہران کا باشندہ
ا۔ غیاث بیگ جب تہران سے ہندوستان آ رہا تھا تو قندھار کے قریب اس کے یہاں مہر
ء پیدا ہوئی۔ غیاث جو پہلے ہی دو لڑکوں اور ایک لڑکی کا باپ تھا اور اقتصادی بدحالی کا
رتھا، اس کے لیے یہ نئی بچی ایک نیا بوجھ تھا مگر ایک نیک دل تاجر ملک مسعود نے اس کی
وقت مدد کی اور پاک و ہند پہنچ کر دربار اکبری میں اسے ملازمت بھی دلا دی۔

مرزا غیاث بیگ نہایت زیرک اور ہوشیار آدمی نکلا- شعر وادب اور لغت پر اسے ا
عبور تھا- خوش نویسی اور خاص کر شکستہ رسم الخط میں اس نے نام پیدا کیا- گو اس کی سخاوت
مشہور تھی مگر وہ رشوت ستانی میں بھی کافی بدنام تھا- بہر حال اس نے جلد ترقی کی اور اکبر کے
عہد میں دیوان بیوتات (شاہی کارخانوں کے محکموں کا دیوان) مقرر رہوا- شہنشاہ جہانگیر کے
عہد میں اسے اور ترقی ہوئی اور اعناد الدولہ کا خطاب ملا-

سترہ سال کی عمر میں مہر النساء کی شادی علی قلی بیگ استجلو سے ہوئی- یہ شخص بھی ایرا
سے ترک وطن کر کے برصغیر آیا تھا اور مغلوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی- عہد اکبری میں
شہزادہ سلیم کی ملازمت میں تھا- ایک موقع پر جب اس نے شیر کو ہلاک کیا تو شہزادے سلیم
نے اسے ''شیر افگن'' کا خطاب دیا- اپنی تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے بروران (بنگال) کی
جاگیر عطا کی- ان دنوں بنگال میں افغان سر اٹھا رہے تھے- شیر افگن کے متعلق بھی بادشاہ
اطلاع ملی کہ وہ سرکشی پر آمادہ ہے- چنانچہ اس نے قطب الدین خاں صوبیدار کو حکم دیا کہ
شیر افگن کے رویے کی نگرانی کرے-

جب صوبیدار نے تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ یہ شک وشبہ درست ہے تو اس نے بادشاہ
کو لکھ بھیجا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ شیر افگن کو دربار روانہ کیا جائے- جب شاہی احکام کی تعمیل
کے لیے صوبیدار بردوان پہنچا تو دوران ملاقات شیر افگن نے اسے اچانک قتل کر دیا- اس
صوبہ دار کے محافظ شیر افگن پر پل پڑے اور اس کے ٹکڑے اڑا دیے-

شیر افگن کی بیوہ اور اس کی کمسن لڑکی (لاڈلی بیگم) کو شاہی دربار میں لایا گیا- مرزا
غیاث بیگ اس وقت بادشاہ کے ساتھ کابل میں تھا اور زیر عتاب تھا- اس لیے اس وقت
دستور کے مطابق مہر النساء کو بادشاہ کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کی تحویل میں دے دیا گیا- ا
واقعہ کے چار سال بعد ۱۶۱۱ء میں جب نیا بازار کے موقع پر جہانگیر نے اسے (مہر النساء)

دیکھا تو اس کے حسن و جمال، ناز و ادا اور حاضر جوابی پر ایسا فریفتہ ہوا کہ اس سے شادی کی تحریک کی اور بادشاہ کی اجازت سے شادی کر لی۔ جہانگیر نے شادی کے بعد اپنے نام کی مناسبت (نورالدین جہانگیر) سے نور محل کا خطاب دیا۔ بعد میں اسی بادشاہ کے لقب جہانگیر کی نسبت سے ''نور جہاں'' کا مشہور لقب عطا ہوا۔

جہانگیر اور نور جہاں کی شادی مغلوں کی تاریخ کا رنگین باب اور جہانگیر کے عہد حکومت کا اہم ترین واقعہ ہے۔ شہرت عام نے ملکہ کی داستان پر رومان کے حاشیے بڑھا دیے ہیں اور اسے افسانوی رنگ دے دیا ہے تاہم حقیقت سے پردہ اٹھنے سے اصل واقعات سامنے آ جاتے ہیں۔

۱۵۸۵ء میں جب شہزادہ سلیم کا منصب بارہ ہزاری ہو گیا تھا تو بادشاہ اکبر کو دکن کی مہم پیش آئی۔ جب اکبر دکن روانہ ہونے لگا تو اس نے سلیم کو پایۂ تخت میں اپنا نائب مقرر کیا اور اسے ہدایت کی کہ رانا میواڑ کی سرکوبی کرے مگر اس نے الٰہ آباد جا کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ وہ بہار کے خزانہ کو اپنے تصرف میں لایا۔ لوگوں کو جاگیریں عطا کیں اور بڑی فوج جمع کر لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے لیے شاہ کا لقب اختیار کیا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ بادشاہ کا لقب اختیار کرنے کے باوجود باپ کو شہنشاہ ہی کہتا تھا۔ سلیم کی ان بے اعتدالیوں کی وجہ سے اکبر کی زندگی کے آخری سال بڑی تلخی میں گزرے۔ اکبر کے دوسرے دو بیٹے مراد اور دانیال کثرت مے نوشی سے وفات پا چکے تھے۔ اس لیے جب سلیم نے معافی مانگی تو اس کی خطا معاف کر دی گئی۔

جب اکبر مرض الموت میں گرفتار ہوا تو خان اعظم عزیز کوکہ اور راجہ مان سنگھ نے سازش کی کہ سلیم کے سترہ سالہ لڑکے شہزادہ خسرو کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ شہزادہ خسرو خان اعظم کا داماد اور راجہ مان سنگھ کا بھانجا تھا۔ سلیم کی بغاوت کے دوران بھی یہ افواہیں اڑی تھیں کہ

بادشاہ' خسرو کو جانشین بنا دے گا- تاہم یہ سازشیں ناکام رہی تھیں اور دوسرے امرا
اکثریت نے اس کی مخالفت کی تھی- یہ امراء' حضرت مجدد الف ثانی سے متاثر تھے اور
سیاست میں دوبارہ اسلام کا غلبہ چاہتے تھے- ان کے نزدیک اس کام کے لیے سلیم زیا
موزوں تھا کیونکہ خسرو اپنے دادا کے افکار سے متاثر اور الحاد کی طرف مائل تھا- سلیم نے ا
گروہ سے اسلام کی حفاظت کرنے کا عہد کیا تھا- وفات سے پہلے اکبر نے سلیم کو بلا کر ا
کے سر پر شاہی پگڑی رکھنے اور اس کی کمر میں ہمایوں کی تلوار لٹکانے کا اشارۃً حکم دیا چنانچہ ا
نورالدین محمد جہانگیر کے لقب سے اکتوبر ۱۶۰۵ء میں تخت شاہی پر بیٹھا-

تخت شاہی پر بیٹھنے کے فوراً بعد جہانگیر نے "زنجیر عدل" لٹکانے کا حکم دیا- یہ زنج
خالص سونے کی تھی اور اس کا ایک سرا قلعہ آگرہ کے ایک برج پر اور دوسرا جمنا کے کنار
ایک مینار سے باندھا گیا تھا- اس میں چالیس گھنٹیاں تھیں تاکہ مظلوم اسے کھینچ کر بادشاہ
باخبر کر سکیں اور انصاف حاصل کریں- جہانگیر نے بارہ احکامات بھی جاری کیے جن کو وہ دستو
العمل کہا کرتا تھا- ان احکامات کے ذریعہ بہت سے محصولات کی معافی' رہزنی کے خاتم
امتناع شراب' متروکہ املاک کو اصل ورثاء تک پہنچانے' اعضا کاٹ دینے کی سزا کی منسوخی
جائداد پر ناجائز قبضے کی روک تھام' شفاخانوں کی تعمیر' مخصوص دنوں اور جمعرات اور اتوار کو
جانوروں کو ذبح کرنے پر پابندی اور خیراتی اداروں کے لیے جاگیروں کی بخشش کا اہتمام کیا
گیا- تمام قدیم منصب دار رکھے گئے اور قیدیوں کو رہا کر دیا گیا-

اگرچہ شاہزادے خسرو کو تخت پر بٹھانے کی سازش ناکام ہو گئی تھی اور جہانگیر نے اس
کے حامیوں سے درگزر کیا تھا لیکن خسرو کے دل میں باغیانہ خیالات موجزن رہے- وہ ناپختہ
کار جوان تھا اور اپنے اخلاق' حسن و جمال' شائستگی اور اعلیٰ اوصاف کی بنا پر عوام میں بے حد
مقبول تھا- ۶ اپریل ۱۶۰۶ء شام کے وقت وہ اپنے دادا کے مقبرے پر جانے کے بہانے محل

سے نکلا اور پنجاب کی راہ لی- اس وقت اس کے ہمراہ ساڑھے تین سو سوار تھے- متھرا کے مقام پر حسین بیگ تین ہزار سواروں کے ساتھ اس سے آ ملا اور یوں راستے میں اس کی فوج میں اضافہ ہوتا گیا ترن تارن کے مقام پر سکھوں کے گرو ارجن نے نہ صرف اسے کامیابی کی دعا دی بلکہ مالی امداد بھی دی- لاہور کے گورنر دلاور خاں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا- چنانچہ شہر لاہور کا محاصرہ کر لیا گیا-

ادھر شہزادے کے فرار کی اطلاع پاتے ہی بادشاہ نے شیخ فرید بخاری کو اس کے تعاقب میں روانہ کر دیا اور دوسرے دن علی الصبح خود بھی پایہء تخت سے نکلا- بادشاہ کی آمد کا سن کر خسرو نے محاصرہ چھوڑ کر بھاگنے کی کوشش کی- تاہم دریائے چناب کے کنارے بھیرووالی کے مقام پر اسے شاہی فوج نے شکست دی- اس موقع پر اس کے مشیروں میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا- بعض کا خیال تھا کہ کابل کی طرف جانا چاہیے بعض بنگال جانے کا مشورہ دیتے تھے جہاں کا گورنر شہزادے کا ماموں راجہ کان سنگھ تھا- آخر کار کابل چلنے کا فیصلہ ہوا لیکن خسرو کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ دریائے چناب کو عبور کرنے کی کوشش میں تھا-

پھر مرزا کامران کے باغ میں خسرو کو کھلے دربار میں بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا- اس وقت شہزادے کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور پاؤں میں زنجیر تھی- آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور جسم خوف سے کانپ رہا تھا- باپ کی شفقت پدری پر حکومت کا مفاد غالب آ چکا تھا- چنانچہ بادشاہ نے شہزادے کو قید کرنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھیوں کو سخت سزائیں دی گئیں- باغ سے شہر تک دورویہ سولیاں کھڑی کی گئیں اور ان پر باغیوں کو لٹکا دیا گیا- گرو ارجن کو سزائے موت دی گئی اور اس کی جائیداد ضبط کر لی گئی- اگرچہ سکھ روایات نے اپنے گرو کی موت کو دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سزا کی وجہ سیاسی تھی- اسے بغاوت کا خمیازہ بھگتنا پڑا- مذہبی تعصب کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا-

۱۶۰۷ء میں جب بادشاہ کابل میں تھا اسے اپنے خلاف ایک سازش کا علم ہوا جس کا مرکزی کردار شہزادہ خسرو تھا۔ چنانچہ سازشیوں کو سزائیں دی گئیں اور شہزادے کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد شفقت پدری نے زور کیا تو بادشاہ نے بیٹے کا علاج کرایا جس سے ایک آنکھ کی بینائی کسی حد تک بحال ہوگئی۔ پھر ۱۶۲۰ء میں جب شہزادہ خرم (شاہ جہاں) دکن کی مہم پر روانہ ہوا تو خسرو کو اس کی تحویل میں دے دیا گیا۔ اس طرح شہزادہ خسرو نے ۱۶۲۳ء میں وہیں وفات پائی۔ مگر بادشاہ جہانگیر نے ''تزک جہانگیری'' میں لکھا ہے کہ شہزادہ قولنج کے مرض سے فوت ہوا۔ حالانکہ ایسے شواہد بھی موجود ہیں جن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خسرو کی موت میں شہزادہ خرم کا ہاتھ تھا جو اسے اپنا رقیب سمجھتا تھا اور اسے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ خسرو کی لاش کو دکن سے لا کر اکبر آباد میں دفن کیا گیا جہاں اس کا مقبرہ اس کی دردناک موت کی یاد دلاتا ہے۔

مرزا غیاث کی بیٹی نور جہاں کا اصل نام مہرالنساء تھا۔ وہ ایک بلند حوصلہ عورت تھی۔ وہ بادشاہ جہانگیر اور اپنے مرحوم شوہر شیر افگن کے تنازع سے واقف تھی اور بادشاہ کو اس کے قتل کا ذمہ دار سمجھتی تھی اور اس سانحہء جانکاہ سے بے قرار تھی اور کامل آزادی یعنی ایک مہربان شوہر کے سایہء عاطفت سے ایک مطلق العنان اور خودسر آقا کی حراست میں منتقل ہونے پر بے حد آزردہ تھی۔ شوہر کی مظلومیت کا خیال رہ رہ کر اس کے زخمی دل پر نمک پاشی کرتا تھا۔ اس نے بادشاہ کے اقتدار سے بیزاری کے اظہار کے طور پر اس کی شکل دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا اور اپنے مرحوم شوہر کے ماتم میں خود ساختہ خلوت نشینی اختیار کر لی۔ تاہم وہ اس زمانہ میں بھی بیکار نہ رہی کیونکہ اس کا دماغ جس قدر غیر معمولی تھا اتنا ہی جامع کمالات تھا۔

مہرالنساء ہر قسم کی زردوزی، گلکاری اور ریشمی پوشاک پر نقاشی کرنے میں مہارت تامہ رکھتی تھی۔ اس کی ہنرمندی اور حسن مذاق کے کارنامے دارالسلطنت میں زبان زد خواص اور

عوام ہو گئے تھے- دہلی' آگرہ اور لاہور کے امراء اور شرفاء کی عورتیں جشن و تقریب کے موقع پر مہر النساء کے سوا کسی اور کاریگر کے کمخاب استعمال نہ کرتی تھیں-

مگر مہر النساء خود بہت سادہ لباس پہنتی تھی اور اپنے کاروبار کو مشتہر کرنے کی غرض سے اپنی خادماؤں کو بیش قیمت اطلس اور زربفت کی خلعتیں پہناتی تھی کیونکہ اس کے مرحوم شوہر شیر افگن کے کمالات کے سامنے اس کی لیاقت کے جوہر ماند پڑ گئے تھے- اس کی ولادت کے وقت جو عجیب و غریب واقعات رونما ہوئے تھے وہ اس کے نزدیک غیر معمولی شاندار مستقبل کی پیش گوئی کرتے تھے-

ایک روز مہر النساء کو اطلاع ملی کہ محل میں ایک بوڑھی عورت ہے جو انسانی تقدیر کے بارے میں پیشین گوئی کرنے کا دعویٰ کرتی ہے- چنانچہ مہر النساء نے فوراً اس کاہنہ کو طلب کیا- وہ ضعیفہ اس کے پاس آئی جو حد درجہ لاغر تھی- شیر افگن مرحوم کی بیوہ کو دیکھ کر اس نے اپنے پتلے مرجھائے ہوئے بازو اٹھائے- اپنی سوکھی انگلیوں سے مٹھیاں بند کیں اور چند بے معنی الفاظ گنگنائے جو دیوانگی کا نتیجہ معلوم ہوتے تھے لیکن بخلاف اس کے اس کا سکوت' اس کی ہوشیاری کا ثبوت تھا اور یہی اس کا صحیفۂ علم غیب کا عنوان تھا-

''مادرِ محترم! ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟'' نور جہاں (نور محل) نے نرمی سے پوچھا- ''اگر آپ میری تقدیر کا نوشتہ پڑھ سکتی ہیں تو مجھ کو اس کے ایک حصے سے آگاہ کر دیجیے ورنہ میرے حق میں دعائے خیر کیجیے کیونکہ بڑی بوڑھیوں کی بددعائیں خوفناک عذاب سے کم نہیں ہوتیں-''

یہ کہتے ہوئے نور جہاں نے ایک اشرفی اس کے ہاتھ پر رکھ دی-

بڑھیا خوشی سے کھلکھلائی- پھر ناک چڑھا کر اور دانت نکال کر گنگنی آواز میں پیش گوئی کی-

''تمہاری پیدائش صحرا میں ہوئی مگر وفات تخت شاہی پر ہوگی- جو بچی ایک سانپ کی آغوش میں بیٹھی تھی وہ آئندہ ایک بادشاہ کی شریک زندگی ہوگی- جو بچہ قحط کے درمیان دنیا میں نازل ہوا وہ افراط و فراوانی کے درمیان سے رخصت ہوگا جو ستارہ تمہاری پیدائش کے وقت ایک نقطہ تھا وہ بڑھتے بڑھتے دائرہ ہو جائے گا اور آفتاب کی برابری کرے گا- مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی- میرے قول پر اعتماد کرو اور اپنے یقین کا ثبوت دو-''

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور معاوضے کے طور پر دوسری اشرفی لے کر چلی گئی-

نور محل کا دل کاہنہ کی پیشین گوئی کو تسلیم کرتا تھا- اس کی باتیں غیر معین ہونے کے باوجود ان تصورات کے مطابق تھیں جو چند روز سے اس کے دماغ میں جاگزیں ہو رہے تھے- مہر النساء بلند نظر اور جاہ طلب تھی- عزت اور شہرت حاصل کرنا اس کی سب سے بڑی تمنا تھی- اس لیے وہ بوڑھی عورت کی پیشین گوئی غیر معقول سمجھنے کے باوجود اس کو اہمیت دیتی تھی- علاوہ ازیں اس کو یہ قوی امید تھی کہ اس کی موجودہ حالت جتنی ذلیل و پست ہے اتنا ہی اس کا مستقبل شاندار ہوگا- اس کے ذاتی کمالات کا غلغلہ حرم شاہی سے تجاوز ہو چکا تھا- چنانچہ ایک سر برآوارہ امیر نے جو سلطنت میں ایک بڑے منصب پر فائز تھا مہر النساء کو شادی کا پیغام دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور و نزدیک اس کے نکاح کی افواہ گرم ہوگئی چنانچہ مہر النساء نے اس افواہ کی تردید نہ کی-

یہ حالت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی- جب امیر موصوف نے شادی کے جواب پر اصرار کیا تو مہر النساء نے صاف انکار کر دیا- اس وقت جو لوگ اس سلسلہء بات چیت کو اہمیت دے رہے تھے انہیں مہر النساء کے انکار پر تعجب ہوا لیکن وہ امیر جس نے شادی کا پیغام دیا تھا وہ ناکامی کی صورت میں زبردستی اپنا مقصد حاصل کرنے کا تہیہ کر چکا تھا- چنانچہ ایک روز وہ موقع پا کر آداب حرم شاہی کی خلاف ورزی کر کے نور محل (نور جہاں) کے سامنے جا کھڑا

ہوا- اس وقت نور محل اپنے کمرے میں بالکل تنہا تھی- امیر نے نور جہاں کی خودسری اور انکار پر اس کو ملامت کی- نور جہاں نے بڑے تحمل سے اس کی باتیں سنیں مگر وہ بدذات نور جہاں کی خاموشی پر غضب ناک ہوگیا اور اس نے نور جہاں کا ہاتھ پکڑ لیا- امیر کافی تندرست و توانا تھا اور نور محل اس کے مقابلے میں دھان پان تھی مگر اس نے ایک زبردست جھٹکے سے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرالیا-

پھر نور جہاں دوڑ کر کمرے سے ایک خنجر اٹھالائی اور امیر کو فوراً وہاں سے جانے کا حکم دیا مگر امیر اپنی خودسری پر اڑا رہا جس کے جواب میں نور جہاں نے خنجر سے اس پر کاری ضرب لگائی- امیر لہولہان ہو کر بے ہوش ہوگیا- بے ہوشی کی حالت میں اسے وہاں سے لے جایا گیا- وہ جانبر تو ہوگیا مگر اس نے ایسا سبق سیکھا تھا کہ پھر اسے دوبارہ اس قسم کی جرات کی ہمت نہ ہوئی- اس واقعہ کے بعد بھی چند اور امرا نے مہر النساء کو شادی کا پیغام دیا مگر وہ سب ناکام اور نامراد رہے-

آخر اس عجیب عورت کے اوصاف اور کمالات کا غلغلہ بادشاہ جہانگیر کے کانوں تک پہنچا جو اس وقت تک شاید مہر النساء کو بھول چکا تھا یا شاہانہ غیرت کے تقاضے سے خود ملاقات کرنے سے قاصر تھا مگر چاہتا تھا کہ مہر النساء خود اس سے ملاقات کی کوشش کرے- بہرحال بادشاہ نے ملاقات سے قبل اس بات کی تحقیق ضروری سمجھی کہ آیا مہر النساء ان صداقتوں اور حقیقتوں کا واقعی مجسمہ ہے جس کے سلسلے میں اس کے کانوں تک طرح طرح کی باتیں پہنچی ہیں-

پس بادشاہ جہانگیر اپنی دلی خلش کو دور کرنے یا دل میں لگی بات کو پورا کرنے کے لیے ایک شام بڑے تزک و احتشام کے ساتھ مہر النساء (نور جہاں) کے کمرے میں خود گیا- اس کی نظر جیسے ہی مہر النساء پر پڑی ویسے ہی اس کو تمام پچھلی ملاقاتیں' باتیں اور یادوں کی

باراتیں تمام کی تمام اس کی آنکھوں میں گھوم گئیں۔

نور جہاں ایک صوفے پر دراز تھی۔ اس کی سفید اور سادہ ململ کی پوشاک اس کے بے عیب خط و خال پوری طرح نمایاں کر رہی تھی۔ بادشاہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مہرالنساء فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ادب سے بادشاہ کو سلام پیش کیا پھر نظریں نیچی کر کے زمین کو دیکھنے لگی۔

بادشاہ جہانگیر کی ہر چند زبان خاموش تھی مگر دل کے احساسات کچھ اس طرح تھے جیسے کہہ رہے ہوں۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم، سمرقند و بخارا را
(حافظ)

جہانگیر اس کے حسن و جمال سے مسحور ہو گیا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کے بولا۔

"اے نور محل! ایک وسیع اور زرخیز مملکت کا فرمانروا تیرے کمالات کا واجبی اعتراف کرتا ہے۔ کیا تو شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ بننا پسند کرتی ہے؟"

"رعایا کی رائے کوئی وقعت نہیں رکھتی خصوصاً کسی عورت کو اپنے بادشاہ کے خلاف کوئی اختیار حاصل نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کا کام حکم دینا ہے، عورت کا فرض اس کی اطاعت ہے۔" نور محل نے جواب دیا۔

جہانگیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو اپنی بیگم بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ نور محل فوراً رضامند ہو گئی۔ چنانچہ اسی وقت شیر افگن کی بیوہ سے بادشاہ کی شادی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس شادی کی خوشی میں تمام ملک میں ایک عام جشن منایا گیا۔ اب مہرالنساء، ملکہ ہند تھی۔ اس نے اپنا زردوزی کا کام بند کر دیا۔ اس کی بجائے اب وہ دنیا کی ان چند غیر معمولی

خواتین کے زمرے میں شمار ہونے لگی تھی جن کے حالات قلمبند کرنے کا شرف مورخین کو حاصل ہوا۔ وہ سلطنت کے پیچیدہ امور کی خاص نگران اور مہتمم ہوگئی اور اس کا لقب ''نور محل'' کے بجائے نور جہاں قرار پایا۔

اب وہ شہنشاہ جہانگیر کی محبوب ملکہ ہوگئی۔ اس کے اختیارات روز بروز وسیع ہونے لگے۔ اس کے بے اندازہ عروج اور رسوخ کے اعلان کے طور پر اس کا نام بادشاہ کے ساتھ سکہ رائج الوقت پر کندہ کیا گیا۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور

بنامِ نور جہاں بادشاہ بیگم نور

اس کے خاندان کے لوگ شہزادوں سے دوسرے نمبر پر قرار دیے گئے اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیے گئے۔ ان کو وہ حقوق اور رعایتیں دی گئیں جو اس سے بیشتر سلطنت مغلیہ میں رعایا کے کسی طبقے کو حاصل نہ ہوئی تھیں۔ بلکہ خود سیاسی امور میں بادشاہ کی شریک ہوگئی اور حرم شاہی میں دربار لگانے لگی۔ جہاں ملکی آئین اور قوانین اور نظم و نسق پر ایسی آزادی اور بے باکی سے بحث کی جاتی تھی جس کی مثال شخصی حکومتوں میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

یہ امر پایہء ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ اکثر مشہور فرمان جن پر بادشاہ کی مہر ثبت ہوتی تھی دراصل اس کی ملکہ کی طرف سے جاری ہوتے تھے جو جہانگیر کی سیاسی کامیابی کا ایک بڑا سبب مانا جاتا ہے ملکہ کی مہر کا سجع یہ تھا۔

نور جہاں گشت بحکم اللہ

ہمدم و ہم راز جہانگیر شہ

اس کو تمام مملکت میں نہ صرف بڑے بڑے امیر امراء بلکہ بادشاہ سے بھی زیادہ اقتدار حاصل تھا۔ شاہان مغلیہ جس شدید احتیاط سے عورتوں کو انتظام سلطنت میں مداخلت کرنے

سے باز رکھتے تھے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نور جہاں بیگم کے سوا صنف نازک کے کسی فرد کو اتنی وسیع السلطنت پر ایسی با اختیار حکومت اور اتنی کثیر رعایا پر ایسا کامل سیاسی تسلط کبھی نصیب نہ ہوا۔

نور جہاں اور جہانگیر کی شادی کے کئی سال بعد بادشاہ کے تیسرے بیٹے شہزادہ خرم نے جسے جہانگیر نے شاہجہان کا خطاب دے رکھا تھا' سلطنت میں فساد برپا کرنا شروع کیا۔ شاہجہاں کو جہانگیر نے دشمنوں کی ایک خطرناک سازش کے انسداد کے لیے دکن بھیجا تھا اور اسے ایک لشکر عطا ہوا تھا مگر دکن پہنچ کر وہ سازش کو ختم کرنے کی بجائے خود بادشاہ بننے کی تدبیریں کرنے لگا اس نے اپنے بھائی خسرو آصف خاں ابن مرزا غیاث کی سازش سے جہانگیر کو فریب دے کر سب سے بڑے بیٹے خسرو کو بغاوت کے جرم میں قید کرا دیا تھا۔

دکن کی کامیاب مہم نے اسے ہر دلعزیز بنا دیا تھا چنانچہ اس نے اپنے بھائی خسرو کو قید اور بعد میں قتل کرنے کے بعد اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نور جہاں بہت دنوں سے شاہجہاں کی حرکات سے بدظن تھی۔ شہزادے کے ارادے اگرچہ خفیہ تھے مگر ملکہ نور جہاں اس کی تہہ تک پہنچ گئی تھی اور اس کی غداری کو قابل تدارک خیال کرتی تھی مگر اس کی شاہجہاں کے مقابلہ میں فوری فتح مشکل نظر آتی تھی اور ملکہ کو شاہجہاں کی کامیابی ہی کامیابی نظر آتی تھی۔ پس ملکہ نے دبے دبے الفاظ میں جہانگیر کو شاہجہاں کی نیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر اول اول بادشاہ نے اس کا مشورہ قابل التفات نہ سمجھا لیکن ملکہ کو اپنے شوہر کے مزاج میں اس قدر دخل تھا کہ وہ اس کے مشورہ کو جلد یا بدیر توجہ سے سننے پر خود کو مجبور پاتا تھا۔

چنانچہ ملکہ نے جہانگیر کو سمجھایا۔

''شہزادے خرم (شاہجہاں) کی نقل و حرکت کی نگرانی ہونی چاہیے اور اسے سپہ سالاری سے معزول کر کے کسی وفادار اور مفید شخص کو سپہ سالاری دی جانی چاہیے۔''

یہی نہیں بلکہ ملکہ نے بادشاہ سے صاف الفاظ میں کہا

''آدمی صرف اپنی ذاتی غرض کے لیے رسوخ حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ جب شہزادے ہردلعزیزی کی تمنا کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ عوام الناس کو اپنا آلہ ءکار اور رعایا کو اپنے قصر سلطنت کا سنگِ بنیاد بنائیں جو شخص ایک مرتبہ بھی دھوکہ دے وہ کبھی معتبر نہیں ہوسکتا۔ میں وثوق کے ساتھ کہتی ہوں کہ حضور میں شاہزادہ خرم کے چہرے پر فرمانبرداری اور سعادت مندی کا جو تبسم بسا اوقات ظاہر ہوتا ہے اس کے پردے میں ریاکاری اس طرح پوشیدہ ہے جس طرح پھولوں کی کیاری میں سانپ چھپا رہتا ہے۔''

قلیل بحث کے بعد جہانگیر کو خرم کی مکاری اور بدنیتی کا یقین آ گیا۔شہزادہ خسرو کا خرم کے ہاتھوں قتل بھی اس یقین کی تائید کرتا تھا۔ چنانچہ وہ خرم کی اس ظالمانہ غداری پر غضب ناک ہوکر اس کو برادرکشی کی سزا دینے کے درپے ہوا۔ شاہجہاں کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اس نے اپنی بدنامی کو دور کرنے کی غرض سے بھائی کی موت پر اس قدر شدید غم والم کا اظہار کیا کہ بہت سے لوگ اس کو خسرو کے قتل سے بری الذمہ خیال کرنے لگے۔ جہانگیر اور اس کی ملکہ اس منافقت سے دھوکہ نہیں کھا سکتے تھے۔ چنانچہ شاہجہاں کو ایک خط لکھا جس میں اسے قتل برادر کا مرتکب قرار دیا۔

چونکہ شاہجہاں کی شادی نور جہاں کی بھتیجی ممتاز محل سے ہوئی تھی اس لیے ملکہ کو شاہزادے سے سخت برہمی تھی۔ شاہجہاں یہ بھی جانتا تھا کہ باپ کی خفگی کا سبب اس کی ملکہ ہے اس لیے وہ تاحدامکان اس کا استقبال کرنے پر کمربستہ تھا جبکہ بادشاہ سے مصالحت کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس لیے اس نے بغاوت کا سلسلہ جاری رکھا۔

جہانگیر نے ملکہ کے مشورہ سے اپنے باغی بیٹے کی سرکوبی کا قصد کیا مگر اس کا لشکر اس

وقت بہت دور تھا اس لیے فوراً میدان میں نہ آ سکا- اس نازک موقع پر ایک قاصد نے آ کر اطلاع دی کہ شاہی سپاہ سالار اعظم مہابت خاں پنجابی سپاہ کے ساتھ بادشاہ کی کمک اور مدد کے لیے آ رہا ہے-

پھر چند ہی روز بعد شاہی فوج نے باغیوں کو بر سر میدان شکست فاش سے دو چار کیا- اس ناگہانی ہزیمت سے شہزادہ ایسا حواس باختہ ہوا کہ اپنا پورا ساز و سامان چھوڑ کر میوات کی پہاڑیوں میں جا چھپا جہاں اسے کچھ عرصہ کے لیے ملکہ اور بادشاہ کے غصہ سے نجات ملی مگر بدقسمتی نے یہاں بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا اور اس نے گجرات میں شکست کھائی مگر اس کی اہمیت اتنی تھی کہ اس کی گرفتاری کو لازمی سمجھا گیا-

شاہجہاں بھی قسمت آزمائی کے لیے اپنی جائے پناہ سے نکلا- اس کی بڑی فوج اب ایک مختصر فوج میں تبدیل ہو چکی تھی- اسی وقت شاہی لشکر نے یلغار کر دی اور شاہجہاں کی فوج کا قتل عام شروع ہو گیا- آخر وہ گولکنڈہ کے راستے سے بنگال کی طرف نکل گیا-

ملکہ نور جہاں کو شاہجہاں کے بنگال بھاگ نکلنے کا بہت ملال ہوا- وہ جانتی تھی کہ جب تک شہزادہ گرفتار نہیں ہوتا اس وقت تک امن و امان نہیں ہو سکتا- ایک بات یہ بھی تھی کہ نور جہاں کی جولڑکی شیر افگن سے تھی وہ جہانگیر کے چوتھے بیٹے شہریار سے بیاہی گئی تھی- اس لیے نور جہاں چاہتی تھی کہ شاہجہاں کی بجائے مغل تخت و تاج کا وارث اس کا داماد شہریار ہو-

شاہی کے زمانہ میں اگر بادشاہ کا اپنے باپ سے اختلاف ہو جاتا تو امیروں وزیروں کی بن آتی تھی- ان کا مفاد ہی اس بات میں ہوتا تھا کہ شاہی خاندان میں اختلاف رہے اور وہ جاسوسی کے فرائض انجام دیتے رہیں- ایسے مواقع پر بعض چالاک اور شاطر امیر دونوں طرف کی جاسوسی کرتے تھے- وہ بادشاہ کے سامنے اس کے وفادار ہوتے اور باغی شہزادے کی مخالفت میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتے مگر انہیں جب بھی موقع ملتا تو وہ چوری چھپے

باغی شہزادے سے رابطہ کر کے اسے ضروری یا غیر ضروری اطلاعات پہنچاتے رہتے تھے۔
شاہجہاں نے کئی بار ارادہ کیا کہ دربار شاہی میں حاضر ہو کر باپ سے معافی مانگے کیونکہ وہ بڑا بیٹا تھا اور تخت و تاج پر اس کا سب سے زیادہ حق تھا مگر اس کے اس ارادے میں وہ امیر جو شاہجہاں کی بجائے ملکہ نور جہاں کے بیٹے شہریار کو بادشاہ بنانے کا ڈول ڈال رہے تھے وہ ایک طرف تو شاہجہاں کو خوف دلاتے:
''شہزادے بہادر! آپ اپنی مرضی کے مالک ہیں مگر یہ خادم آپ کو خودکشی نہیں کرنے دے گا۔ میرے مخبر نے خبر دی ہے کہ مہر النساء نے شہنشاہ کو اس بات پر رضامند کر لیا ہے کہ ان کا جانشین شہریار ہو۔ اس لیے اگر آپ نے شہنشاہ سے صلح کا راستہ اختیار کیا تو آپ کو ایسا نقصان اٹھانا پڑے گا جو تصور سے بھی باہر ہے۔''
شہنشاہ کے مزاج میں ہندو امرا کا بھی بہت عمل دخل تھا کیونکہ شاہی خاندان کے بیشتر عزیز و اقارب نے ہندو خواتین سے شادیاں رچا رکھی تھیں۔ ان کے پیش نظر یہ نکتہ رہتا تھا کہ بادشاہ کا جانشیں ایسا شہزادہ ہو جو اسلام سے دور اور ان کے خیال میں آزاد خیال کا مالک ہو تا کہ ہندو مسلمان میں کوئی فرق نہ سمجھا جائے۔ اس لیے وہ شہنشاہ کو سمجھاتے۔
''عالی جاہ! آپ جس طرح مسلمانوں کے بادشاہ ہیں اسی طرح ہندوؤں کے بھی ان داتا اور جان و مالک کے مالک ہیں۔ یوں تو تمام شہزادے تخت و تاج کے وارث ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اہل بھی ہیں مگر کسی ایسے شہزادے ہی کی بادشاہی پسند ہے جو آزاد خیال ہو اور بھارت ورش کے ہندو مسلمان تمام رعایا کو ایک نظر سے دیکھے۔ اس لیے ملکہ نور جہاں کے حضور روز ایک نہ ایک کاہن اور شعبدہ باز ضرور پیش ہوتا ہے جو ملکہ کو ایسے شہزادے کی نامزدگی کا مشورہ دیتا ہے بلکہ ملکہ کو یقین دلاتا ہے کہ اگر فلاں شہزادہ بھارت کا شہزادہ ہو جائے تو مغل حکومت ہند کے علاوہ آس پاس کے تمام ممالک پر قبضہ کر سکتا ہے۔''

اس طرح سرکار دربار میں روز نئے نئے شوشے چھوڑے جاتے تھے اور ملکہ نور جہاں کی مرضی کے مطابق آئندہ کے شہنشاہ کی نامزدگی کی رائے دیتے اور کوشش کرتے تھے بادشاہ کے علاوہ ملکہ کے اپنے دربار میں بھی ہر وقت اسی قسم کی چہ میگوئیاں پیدا کرتیں اور امرائے دربار کی جاسوس عورتیں ملکہ نور جہاں کو راہ سے بے راہ کرنے کی کرشش کرتی تھیں۔

تاہم اب حالات شہزادہ شاہجہاں کے حق میں ضرور موافق ہونے لگے تھے۔ اس نے بنگال میں مزید فوج فراہم کر کے وہاں کے قلعہ ''قلی گڑھ'' کا محاصرہ کیا اور قلعہ والوں کی سخت جدوجہد کے باوجود ایک زبردست حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس غیر مترقبہ کامیابی سے شاہجہاں کے حوصلے اور بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ شاہجہاں نے پورے ضلع کو پامال کر ڈالا اور پھر اس نے ڈھاکہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ ایک بڑا شہر تھا اور ایک زمانہ میں بنگال کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ وہاں شہزادے شاہجہاں کو سونے چاندی' ہیرے اور سامان حرب کا ایک بڑا ذخیرہ دستیاب ہوا۔ اس نے بادشاہ کے عامل کو برخاست کر کے فوراً اپنی جانب سے ایک نیا عامل مقرر کیا جو اس کے باجگذار کی حیثیت سے بنگال میں حکومت کرنے لگا۔

ملکہ نور جہاں نے اس وقت بہت ہاتھ پیر مارے مگر اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ دوسری طرف شاہجہاں نے ''بہار'' کا رخ کیا۔ شاہجہاں کے لشکر کی خبر پا کر بہار کا صوبہ دار بھاگ کھڑا ہوا مگر وہاں کے دولتمند زمیندار اظہار وفا اور عہد و پیمان کے استحکام کے طور پر گراں قدر تحفے لے کر شاہجہاں کے پاس آئے جسے شاہجہاں نے بخوشی قبول کر لیا۔ اس زمانے میں قلعہ روہتاس ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا مگر یہ شاہجہاں کی خوش قسمتی تھی وہاں کے قلعدار مبارک نے مغل لشکر گاہ میں حاضر ہو کر قلعہ کی کنجیاں شاہجہاں کے حوالے کر دیں اور اس کی دائمی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ باغی شہزادہ شاہجہاں معہ اپنے اہل وعیال کے اس قلعہ میں پناہ لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے فی الفور اپنے بیوی بچوں کو قلعہ روہتاس میں منتقل کر دیا

اور پہلے سے زیادہ مطمئن ہوکر زمانے کے نشیب وفراز برداشت کرنے کا زیادہ اہل ہو گیا۔

شہزادے شاہجہاں کی اس کامیابی نے اس کا دماغ ہفت اقلیم پر پہنچا دیا اور وہ فوراً حصولِ سلطنت مغلیہ کی غرض سے شاہی لشکر سے دو دو ہاتھ کرنے روانہ ہوا جس سے وہ پہلے دو بار شکست کھا چکا تھا۔ مغل سپہ سالار مہابت خاں پھر اس کے مقابلے پر نکلا۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے بنارس تک آ گیا۔ شاہجہاں کی فوج چالیس ہزار سے زیادہ سواروں پر مشتمل تھی اور مقدار کے لحاظ سے کسی طرح بھی شاہی لشکر سے کم نہ تھی۔

یہ لڑائی بڑی خونریز اور فیصلہ کن تھی۔ اس موقع پر شہزادے کی دلاوری اور جانفشانی دیکھنے کے قابل تھی۔ چنانچہ وہ اپنے پانچ سو جانباز سواروں کے ساتھ جو اس پر قربان ہونے کا عزم کر چکے تھے۔ دشمنوں کی صفوں میں بے خوف وخطر گھس گیا اور اپنے سے دوگنی فوج سے مقابلہ کرنے لگا۔ اگر اس کے بعض سردار اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اسے میدان کارزار سے باہر نہ لے جاتے تو وہ یقیناً اپنی شجاعت کا خود شکار ہو جاتا۔ شہزادہ قلعہ روہتاس میں پناہ گزیں ہو گیا۔ دشمن کی فوج اس کی قبضہ گاہ کی دولت لوٹنے میں لگ گئی اس طرح وہ کسی تعاقب سے محفوظ رہا۔

شہزادہ اپنے خاندان کو قلعہ رہتاس میں چھوڑ کر اپنے پراگندہ لشکر کی درستی میں پھر لگ گیا۔ فوج جمع ہوتے ہی شہزادے نے پٹنہ پر قبضہ کر کے وہاں سکونت اختیار کر لی مگر دشمنوں کے حملے کی تاب نہ لا کر اسے بنگال کے راستے دکن بھاگنا پڑا۔ اس طرح اس کے تمام مقبوضہ قلعے اور علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے جن پر مہابت خاں نے قبضہ کر لیا۔ قلعہ اور اضلاع کا انتظام کرنے کے بعد مہابت خاں نے پھر شہزادے کا تعاقب شروع کیا۔

شہزادے نے پیہم شکستیں کھانے کے بعد بھی ہمت نہ ہاری اور مقابلے پر ڈٹا رہا۔ اس دوران انبر کا راجہ جو جہانگیر کا مخالف تھا وہ شہزادے سے مل گیا۔ اس کی مدد سے شہزادے نے

برہانپور کو تسخیر کیا لیکن شاہی لشکر نے اسے محاصرہ اٹھانے اور بالاکوٹ کی پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس دوران شہزادے نے خاندش کے ایک قلعہ پر قبضہ کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔

اب شاہجہاں نے بادشاہ کو خطوط لکھے جن میں اس نے اپنی غلطیوں کا صاف الفاظ میں اعتراف کیا۔ جہانگیر ایک نرم طبیعت اور سادہ مزاج انسان تھا۔ وہ اپنے فرزند کی خستہ حالی پر بہت دل گرفتہ ہوا کیونکہ شاہجہاں اسے سب سے زیادہ محبوب تھا۔ چنانچہ جہانگیر کے آنسو شاہجہاں کے خط پر ڈھلک آئے۔ اس نے آخر کار بیٹے کو لکھا۔

''اگر تم روہتاس اور دیگر قلعوں کے حاکموں کو جو اس وقت تمہارے نام سے حکومت کر رہے ہیں برطرف کر دو اور اپنے دونوں لڑکوں دارالشکوہ اور اورنگ زیب کو دربار میں بھیج دو تو میں تمہاری گزشتہ تقصیر کو معاف کر دوں گا۔''

شاہجہاں نے فوراً یہ شرائط منظور کر لیں۔ اس نے مقبوضات چھوڑ دیے اور دونوں بیٹوں (دارا اور اورنگ زیب) کو آگرہ بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی غیر حاضری کا یہ عذر پیش کیا:

''میں اپنے باپ کے سامنے جاتے ہوئے جن کو میں نے اتنی تکلیف دی ہے شرم محسوس کرتا ہوں۔''

مگر اصل حقیقت یہ تھی کہ وہ ملکہ نور جہاں کے منصوبوں سے خائف تھا۔ اس نے سیر و تفریح کے بہانے پانچ سو سواروں کے ہمراہ تمام مغل مقبوضات کا دورہ کیا۔ وہ کبھی اجمیر میں ہوتا تو کبھی ٹھٹھہ میں۔

یہ انجام تھا اس بغاوت کا جس کے فرو کرنے میں جہانگیر اپنی ملکہ نور جہاں کی بصیرت اور دور اندیشی کا قائل تھا۔ یہ یگانۂ روزگار عورت زمانہ کے شور و شر کا مقابلہ کرنے میں ہمیشہ

پیش پیش رہتی تھی اور اپنی زندگی کی ہر مشکل میں ایسی غیر معمولی ذہانت اور فراست کا مظاہرہ کرتی تھی جس نے اس کے اقتدار سے پہلے ہی اس کو دیگر خواتین سے ممتاز کر دیا تھا۔

''دراصل وہ تخت وتاج کی ملکہ تھی۔ اگرچہ عنان حکومت بظاہر جہانگیر کے ہاتھوں میں تھی لیکن اس عنان حکومت کی مضبوطی اور تخت کی پائیداری کا باعث اس کی ملکہ نور جہاں تھی۔''

مہابت خان نے جب شاہجہان کو شکست دے کر امن وامان قائم کر دیا تو اس کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی لیکن دوسرے امرا آتش حسد سے مشتعل ہو گئے۔ دیگر امرا کے علاوہ ملکہ نور جہاں بھی مہابت خاں کے اثر ورسوخ کو خطرناک سمجھ کر اس کو بادشاہ کی نظروں سے گرانے کی کوششیں کرنے لگی۔ شہنشاہ جہانگیر' بیٹے کی بغاوت کی وجہ سے بہت بدظن ہو گیا تھا۔ مہابت خاں نے بادشاہ کے مزاج میں تغیر محسوس کیا مگر وہ جانتا تھا کہ اس کا سبب ملکہ کی غلط بیانی ہے اس لیے اس کے دل میں ملکہ کی طرف سے ایسا کینہ پیدا ہوا کہ وہ ملکہ نور جہاں کا جانی دشمن ہو گیا۔

اس خطرناک کشیدگی کا بہانہ یہ تھا کہ ملکہ کو بعض امیروں نے یہ بتایا تھا کہ مہابت خاں در پردہ شہنشاہ کو معزول کرنے اور شاہجہاں کو تخت پر بٹھانے کی سازش کر رہا ہے۔ ملکہ نے جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی' بادشاہ کو اس بات کی اطلاع دے دی جس سے وہ برافروختہ ہوا اور اس کی نظر میں سپہ سالار دغادار ہو گیا۔ اس موجودہ شورش کا تصور کر کے وہ اب پریشان ہوا کہ اس نے اپنے تمام نامور کارکنوں کی خدمات فراموش کر دیں اور اس حاسدوں کے بیانات کا یقین کر لیا۔

مہابت خاں اس وقت بنگال میں تھا۔ اس کو بادشاہ کی طرف سے دربار میں فوراً حاضر ہونے کا حکم موصول ہوا۔ وہ ابھی واپسی کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اسے حاضری کا دوسرا پروانہ ملا

جس میں عدمِ تعمیل کے لیے عتاب اور دھمکیوں کا ذکر تھا- چنانچہ مہابت خان نے دربار میں حاضری کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ایک قلعہ میں پناہ لینے کی کوشش کی مگر اسے قلعہ میں پناہ نہ مل سکی کیونکہ شہنشاہ نے ایک حکم کے ذریعے اس قلعہ کے قلعدار کو تبدیل کر دیا تھا-

پس مہابت خاں نے فیصلہ کیا کہ وہ اب خطرہ کا اندازہ کیے بغیر دربار میں حاضر نہیں ہوگا- اس سلسلے میں اس نے بادشاہ کو ایک خط لکھا جس میں اس نے خلوصِ دل سے اظہار کیا کہ اسے جہاں پناہ کی شرافت پر حد درجہ اعتماد ہے مگر وہ دربار کے حاسد امیروں اور وزیروں پر بھروسہ نہیں کر سکتا-

مگر مہابت خاں کو اس عاجزانہ خط کے جواب میں دربار میں بلا تاخیر حاضر ہونے کا ایک نہایت سخت حکم نامہ موصول ہوا- مہابت خاں نے اس حکم کی بھی تعمیل نہ کی اور بادشاہ کو دوسرا خط روانہ کیا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا-

''میں اپنے بادشاہ کے دشمنوں سے لڑ کر اپنی جان بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کروں گا مگر اپنے آپ کو درباریوں کے بغض و کینہ کے بھی حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں- اگر جہاں پناہ میری سلامتی کا وعدہ کریں تو میں خود حاضر ہو کر اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کر سکتا ہوں-''

ملکہ نور جہاں جس کے مشورے کے بغیر بادشاہ کوئی کام نہ کرتا تھا- اس نے مہابت خاں کے اس خط کو ذہانت آمیز ثابت کیا اور شہنشاہ جہانگیر نے مہابت خاں کے پاس ایک قاصد بھیجا اور مہابت کے نام خط سے ملامت آمیز الفاظ میں اسے فوری دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا-

مہابت خاں نے مجبوراً یہ حکم منظور کیا اور پانچ ہزار راجپوت سواروں کے ساتھ لاہور روانہ ہوا جہاں ان دنوں جہانگیر کا دربار لگتا تھا-

ادھر جب ملکہ کو معلوم ہوا کہ مہابت خاں ایک کثیر تعداد سواروں کے ساتھ لاہور آ رہا ہے تو اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں بادشاہ مرعوب ہو کر تصفیہ پر آمادہ نہ ہو جائے اس لیے اس نے کہا۔

''شہنشاہ کو اس باغی کو اس طرح منہ نہ لگانا چاہیے۔''

''مگر اس نے تو ہمارے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے؟'' بادشاہ نے ٹالنے کے لیے کہا۔

''بظاہر کوئی نقصان نہیں نظر آتا۔'' ملکہ نور جہاں نے بات بڑھائی۔ ''مگر مہابت خاں کا پانچ ہزار سواروں کے ساتھ لشکر گاہ میں آنا کسی طرح مناسب نہیں اور یہ بات ملکی مصلحتوں کے خلاف ہے۔''

جہانگیر اس وقت کابل جا رہا تھا۔ اس لیے اس نے ملکہ کو کوئی قطعی جواب نہ دیا۔

جہانگیر کے کابل جانے کے بعد مہابت خاں لاہور پہنچا اور سواروں کے ساتھ خیمہ میں داخل ہونے کا قصد کیا تو اس وقت ایک قاصد نے مہابت خاں کو ایک شاہی فرمان دیا۔ جس میں درج تھا۔

''جب تک تم بنگال کی آمدنی اور بنارس کے مال غنیمت کا حساب نہیں دو گے، تم کو بادشاہ کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''

مہابت خاں نے اس مطالبہ سے ناراض ہو کر اپنی توہین کی شکایت کرنے کے لیے اپنے داماد کو بھیجا لیکن جیسے ہی یہ شخص دربار میں پہنچا اس کا عمامہ اور جبہ اتار لیا گیا۔ اس کے چابک مارے گئے اور اسے پھٹے پرانے کپڑے پہنا کر ایک مریل ٹٹو پر دم کی طرف منہ کر کے بٹھایا گیا اور اسی حالت میں تمام سپاہ کی طعنہ زنی کے درمیان اسے خسر کے پاس واپس کر دیا گیا۔

یہ تذلیل نا قابل برداشت تھی۔ چنانچہ مہابت خاں نے صرف بادشاہ کی کمزوری پر افسوس کیا اور اس کینہ حرکت کو بھی ملکہ نور جہاں سے منسوب کیا جس کی ہر تدبیر کو وہ بادشاہ کی عداوت کا باعث قرار دیتا تھا۔ مہابت خاں کو یقین تھا کہ اگر اس نے خود کو ملکہ کے رحم و کرم کے حوالے کیا تو اسے کم از کم اپنی زندگی یا آزادی سے ضرور ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ چانچہ مہابت خان نے نہایت بے باکی سے بادشاہ پر حملہ کر کے اور اسے لے بھاگنے کا مصمم فیصلہ کیا۔

شاہی لشکر دریا کنارے خیمہ زن تھا جس پر پل بندھا ہوا تھا۔ دوسرے دن صبح کو لشکر نے کوچ کیا۔ کوچ بہت سویرے شروع کیا گیا اس لیے جہانگیر اطمینان سے اپنے خیمے میں بیٹھا رہا۔ جب شاہی سپاہ دریا پار کر گئی تو مہابت خان کے راجپوتوں نے بڑھ کر پل میں آگ لگادی جس سے بادشاہ کا راستہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد مہابت خاں شاہی خیمے میں داخل ہوا۔

مہابت خاں کا چہرہ اگرچہ زرد تھا مگر اس سے عزم و استقلال نمایاں تھا۔ اس کی ہر نقل و حرکت سے اس کا مقصد ظاہر ہوتا تھا جس کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے راجپوت اس کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے شاہی پاسبانوں سے ہتھیار چھین لیے۔

جہانگیر اپنے دیوانِ خاص میں چلا گیا۔ مہابت خاں نے بادشاہ کا تعاقب کیا۔ دربانوں نے اسے روکنا چاہا۔ مہابت خاں نے فوراً تلوار بے نیام کر لی۔ دربان خوفزدہ ہو گئے اور مہابت خاں نے دیوان خاص میں قدم رکھا۔ اس نے وہاں موجود امراء کو گھورا۔

بادشاہ جہانگیر نے اپنے خیمے کے باہر شور سن کر تلوار نکال لی مگر جب اس نے مہابت خاں اور اس کے ساتھ دلیر سپاہیوں کا ایک دستہ دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنے سپہ سالار کے احسان کی قدر نہیں کی۔

''تمہارا کیا مطلب ہے؟'' جہانگیر نے مہابت خاں سے سوال کیا۔

مہابت خان نے زمین چھوئی پھر پیشانی پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔

''اپنے دشمنوں کی سازشوں سے جو وہ میرے قتل کے لیے کر رہے ہیں مجبور ہو کر میں اپنے شہنشاہ کے دامن میں پناہ لیتا ہوں۔''

''تم محفوظ ہو۔'' بادشاہ نے کہا۔ ''لیکن تمہارے مسلح سپاہی کیا چاہتے ہیں؟''

''وہ میرے اور میرے خاندان کے لیے کامل امان کے طالب ہیں اور اس کے بغیر یہاں سے نہیں جائیں گے۔'' مہابت خاں نے جواب دیا۔

''میں تم کو جانتا ہوں۔'' جہانگیر نے کہا۔ ''اپنے مطالبات پیش کرو میں انہیں منظور کروں گا لیکن مہابت خاں تم نے میرے معاملے میں بے انصافی کی ہے۔ میں نے تمہاری جان لینے کی کوشش نہیں کی۔ میں تمہاری خدمات سے واقف تھا۔ گو تمہاری ظاہری نافرمانی سے ناراض ہو گیا تھا۔ تم مجھ پر کامل اعتماد رکھو۔ میں تمہارے اس برتاؤ کو جو تمہاری مجبوری کا نتیجہ ہے نظر انداز کر دوں گا۔''

مہابت خان نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اور ایک گھوڑا منگوا کر بادشاہ سے اس پر سوار ہونے کی درخواست کی۔ چنانچہ دونوں سوار ہو کر راجپوتوں کے ہمراہ خیمے سے نکلے۔ جب وہ لشکر گاہ کی حدود سے گزر گئے تو مہابت خان نے بادشاہ سے باادب درخواست کی۔

''جہاں پناہ! ہاتھی پر سوار ہو جائیں تاکہ حضور کی روانگی سے اگر کوئی فتنہ برپا ہو تو اس میں کسی شدید حادثے کا امکان نہ رہے۔''

جہانگیر اس کی مخالفت بیکار سمجھ کر ہاتھی پر سوار ہو گیا۔ شاہ کے سوار ہوتے ہی تین راجپوت اس کی نگہبانی کے لیے ہودج کے گرد بیٹھ گئے۔ بعض امرا اپنے بادشاہ کو دیکھ کر اسے روکنے اور رہا کرانے کے لیے بڑھے مگر مہابت خاں کے آدمیوں نے انہیں فوراً قتل کر دیا۔

اس کے بعد کسی نے تعارض نہیں کیا اور مہابت خاں جہانگیر کو خیمے میں لے گیا۔ وہاں

اس نے بادشاہ کے سامنے اپنی معذرت پیش کی اور بادشاہ کو یقین دلایا کہ وہ جہاں پناہ کی ذات یا سلطنت کے خلاف کوئی برا ارادہ نہیں رکھتا- پھر اس نے رعب دار آواز میں اعلان کیا
''میں اپنے دشمنوں کے شر سے بچنے کا تہیہ کر چکا ہوں-''

بادشاہ کی گرفتاری کے وقت شاہی خیمے میں جو ابتری پھیلی اس سے فائدہ اٹھا کر ملکہ چپکے سے نکل گئی اور فوراً ایک ہاتھی پر سوار ہو کر دریا پار کر گئی- اب وہ اپنی فوج میں تھی جسے اس نے بادشاہ کی رسیدی سے مطلع کر دیا-

مہابت خان کو ملکہ کے فرار کا بہت افسوس تھا کیونکہ وہ ملکہ کو اپنے لیے بہت خطرناک سمجھتا تھا اور اسی لیے اسے گرفتار کرنے کی امکانی کوشش کر رہا تھا- اب وہ بادشاہ کی مخالفت کر کے اعلانیہ علم بغاوت بلند کر چکا تھا اور اس سے بہتر کوئی اور صورت نہ تھی جس کام کو اس نے جاں بازی اور ثابت قدمی سے کیا ہے اسے انجام کو پہنچائے- اسے اپنی لیاقت کا احساس تھا- اس کی سپاہ اس کی فرمانبردار تھی- وہ ملکہ نور جہاں اور اس کے بھائی آصف خاں وزیر کے تدبر کا قائل تھا مگر بخوبی جانتا تھا کہ یہ دونوں اپنی فوج میں ہر دلعزیز نہیں ہیں اور یہ کہ امراء کی ایک بڑی تعداد ملکہ اور اس کے خاندان کے اقتدار سے ناراض ہے-

جب مہابت خاں بادشاہ کو لے کر دریا کے کنارے اپنے پہلے لشکر گاہ میں آیا تو اس نے دیکھا کہ شجاعت خاں نام کا ایک مشہور امیر شاہی فوج میں شامل ہونے کے لیے اس وقت وہاں آیا ہے- لشکر گاہ کو خالی اور بادشاہ کو باغی سپہ سالار کی قید میں دیکھ کر اس امیر نے راجپوتوں کے بھرے مجمع میں مہابت خاں کو اس کی غداری پر ملامت کی- سپہ سالار نے خائف اور غضبناک ہو کر اپنے آدمیوں کو اس گستاخ امیر پر حملہ کرنے کا حکم دیا جنہوں نے اسے مع اس کے ساتھیوں کے قتل کر دیا- اس تشدد سے دیگر امراء جو بادشاہ کو آزاد کرانے کا موقع تلاش کر رہے تھے وہ دہشت زدہ ہو کر دریا پار بھاگ گئے جہاں انہوں نے شاہی فوج

کو شجاعت خاں کے سپہ سالار کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل کیے جانے سے مطلع کیا- اس ہولناک خبر سے تمام لشکر میں سنسنی پھیل گئی-

بادشاہ کی گرفتاری سے ملکہ اور آصف خاں بہت پریشان تھے- ملکہ نے لشکر گاہ میں موجود امیروں کو جمع کیا اور انہیں اس بزدلی پر بہت لعنت وملامت کی- ملکہ نے صاف الفاظ میں کہا:

''کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تمہارے سامنے تمہارے بادشاہ کو گرفتار کیا گیا اور تم لوگ سر جھکائے کھڑے رہے- اگر تم مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتے تو بادشاہ کو کوئی بری نظر سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا-''

تمام امیر و وزیر اپنی بزدلانہ خاموشی پر شرمندہ تھے- آخر صلاح ومشورے شروع ہو گئے- وقت نازک تھا اور طول طویل بحث ومباحثہ کی گنجائش نہ تھی- تاخیر میں کامیابی کا موقع ہاتھ سے نکل جانے اور دشمن کی طاقت اور زیادہ بڑھ جانے کا امکان بلکہ اندیشہ تھا- پس مختصر گفتگو اور مشورے کے بعد طے پایا کہ علی الصبح دریا کو دوبارہ عبور کر کے مہابت خاں پر پھر فوج کشی کی جائے-

پتہ نہیں یہ خبر بادشاہ تک کس طرح پہنچ گئی یا اسے کیسے الہام ہوا کہ دوبارہ حملہ کی صورت میں اس کی جان کو سخت خطرہ ہے چنانچہ اس نے فوراً ایک نامہ برکی معرفت وزیر کو اس اقدام سے منع کیا مگر وزیر جو اپنے آپ کو ایک قیدی بادشاہ کے حکم کا پابند نہ سمجھتا تھا اپنی رائے پر قائم رہا-

صبح ہوتے ہی وزیر مع اپنی فوج کے پسپا ہو گیا- چونکہ پل کو آگ لگا دی گئی تھی اس لیے اس نے دریا میں اترنے کا تہیہ کیا لیکن دریا اتنا گہرا تھا کہ اس کوشش میں بہت سے آدمی ڈوب گئے- دوسرا ساحل اس قدر ڈھلوان تھا کہ جو آدمی وہاں تک پہنچ بھی سکے غنیم کے

مقابلے میں بہت تکلیف اٹھانی پڑی- دشمن اس قدر چالاک تھے کہ جیسے ہی یہ لوگ کنارے پہنچتے تھے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا- راجپوتوں کی بے پناہ شجاعت کا طوفان کسی طرح نہ رکتا تھا- جو سپاہی دریا عبور کر کے کنارے پر چڑھنے کی کوشش کرتا فوراً قتل کر دیا جاتا تھا-

مگر شاہی لشکر کثیر تعداد میں تھا اور پیچھے والے آگے والوں کو بڑھنے کی تاکید کر رہے تھے جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد ساحل پر چڑھ گئی مگر اسے ایک ایسے دشمن سے سابقہ پڑ جس نے جنگ میں مارنے اور مرنے کے سوا اور کوئی سبق نہ پڑھا تھا- اس طرح کئی گھنٹے لڑائی جاری رہی جس میں شاہی فوج کا شدید نقصان ہوا- وزیر نے حتی الامکان اپنے آدمیوں کی حوصلہ افزائی کی مگر بے سود- کیونکہ وہ دشمن سے مرعوب ہو چکے تھے اور صرف اپنی کثرت اور تعداد کے بھروسے پر جنگ کر رہے تھے-

نور جہاں نے جب دوسرے کنارے سے یہ کیفیت دیکھی تو اس کی غیرت اور حمیت نے جوش مارا اور وہ تیر کمان سے مسلح ہو کر مع اپنی نوعمر لڑکی کے ایک ہاتھی پر سوار ہوئی اور بے خوف ہو کر دریا میں اتر گئی- ایک عورت کا یہ عزم واستقلال دیکھ کر مغل اور دوسرے امراء شرم سے پانی پانی ہو گئے اور وہ خود بھی ملکہ کے ہمراہ پانی میں اتر گئے- بیچ منجدھار میں پہنچ کر ملکہ نے اپنی فوج کی ہمت بڑھانے کے لیے اپنا رومال ہلایا اور ہودج میں کھڑے ہو کر دشمن پر تیروں کی بارش شروع کر دی- اس کے جواب میں غنیم نے بھی اس پر تیر برسائے جس سے یکے بعد دیگرے تین مہاوت مارے گئے لیکن ملکہ بدستور تیر برساتی رہی حتیٰ کہ اس کا ترکش خالی ہو گیا- ملکہ نے فوراً دوسرا ترکش منگایا- ملکہ کا ہاتھی تین بار مجروح ہوا اور نڈھال ہو کر پانی میں غوطے کھانے لگا تاہم ملکہ بے باکی سے تیر برساتی رہی- اس کی بیٹی کے ہاتھ میں زخم آیا مگر اس سے اس کی شیر دل ماں کے جوش وخروش میں مزید اضافہ ہو گیا- اس نے اپنا ہاتھی

بڑھایا اور کنارے کے قریب پہنچ کر تیسرا ترکش طلب کیا۔

ملکہ کی دلاوری نے شاہی لشکر میں نئی روح پھونک دی اور مغل سپاہی جوق در جوق کنارے پر چڑھنے لگے۔ اب لڑائی نہایت خونریز ہوگئی لیکن مغل لشکر کا پلہ بھاری نہ ہوا۔ ملکہ کی موجودگی کے باوجود وہ راجپوتوں کا تند سیلاب نہ روک سکے تاہم ان کی بہادری قابل داد تھی۔ جب ملکہ اپنے ہاتھی کو کنارے پر چڑھانے لگی تو ایک راجپوت نے اس کی سونڈ کی جڑ پر تلوار کا ایسا شدید وار کیا کہ وہ ایک دردناک چنگھاڑ کے ساتھ گر پڑا لیکن اس کے گرنے کے دوران ملکہ نے اپنی کمان میں تیر چڑھایا اور ایسا صحیح نشانہ باندھ کر پھینکا کہ تیر حملہ آور کے مغز میں گھس گیا جس سے وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

ادھر ہاتھی کے گرتے ہی دونوں ماں بیٹی دریا میں گر پڑیں۔ چونکہ پانی بہت تیزی سے بہہ رہا تھا اس لیے ان کے غرق ہونے کا خطرہ تھا لیکن ملکہ نور جہاں اپنی کمان کو دانتوں سے پکڑ کر تیرتی ہوئی پہلے کنارے کی طرف جانے لگی جہاں سے چند امراء اس کی مدد کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ملکہ کی لڑکی دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہوگئی۔

ملکہ آبِ رواں کو چیرتی ہوئی اور موجوں سے لڑتی' ہاتھیوں کی چنگھاڑ' ہتھیاروں کی جھنکار' تیروں کی بوچھاڑ اور سپاہیوں کی چیخ و پکار کے درمیان کامل اطمینان سے ساحل کی طرف چلی مگر اثنائے راہ میں امراء مذکور نے ایک ہاتھی اس کی نذر کیا جس پر وہ سوار ہوگئی پھر واپس ہو کر دوسرے ساحل کے قریب پہنچ گئی۔

ملکہ نے اس حادثہ کا مطلق خیال نہ کیا اور دشمنوں پر بدستور تیر برسانے شروع کر دیے۔ اس کے تیروں کا خاص نشانہ مہابت خاں تھا مگر وہ کنارے سے اس قدر دور تھا کہ تیر اس تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ خود ملکہ کی زندگی خطرے میں تھی مگر وہ بے پروائی اور جان بازی سے اپنے ہاتھی کو آگے کی طرف بڑھا رہی تھی۔

ملکہ نور جہاں کا تیسرا ترکش بھی خالی ہو گیا اور اسے چوتھا ترکش منگانا پڑا جس کا پہلا تیر اس نے ایک دشمن سپاہی کے بازو میں مارا- سپاہی نے فوراً اپنے بازو میں چبھے ہوئے تیر کو کھینچ لیا اور انتقام لینے کے لیے تلوار سونت کر دریا میں کود پڑا- اس نے ملکہ کے ہاتھی پر وار کرنے کے لیے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ ہودج میں سے دوسرا تیر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا اور وہ نہنگ اجل کا لقمہ بن گیا اور گرداب میں ڈوب گیا-

اپنے ایک ساتھی کا انجام دیکھ کر چند راجپوت دریا میں کود پڑے تا کہ ملکہ کو گرفتار کریں- انہوں نے ملکہ کو گھیر لیا مگر ملکہ نے اپنے تیروں سے ان میں سے اکثر کو زخمی کر دیا تاہم راجپوتوں نے ہمت نہ ہاری اور ہوشیاری سے ملکہ کے حملوں کی مدافعت کی- اتنے میں راجپوتوں کی ایک اور بڑی جماعت ان کی کمک پر آ گئی جس سے ملکہ کی حالت اور زیادہ تشویش ناک ہو گئی-

اس وقت ایک راجپوت ملکہ کے ہاتھی کی پشت پر چڑھ گیا اور اس کے خادم سے زور آزمائی کرنے لگا- دفعتاً ہاتھی کی ران میں ایک زخم آ گیا جس سے بے قرار ہو کر وہ گھومنے لگے اور دریا کی طرف دوڑا لیکن راجپوتوں کے ایک دستہ نے اس کو گھیر کر تلواریں مار مار کر ڈھیر کر دیا-

ہاتھی کے گرتے ہی ملکہ نور جہاں ہودج میں کود کر زمین پر آ گئی اور اپنے بعض سرداروں کو جو دشمن سے لڑ رہے تھے اپنی مدد کے لیے بلایا- شاہی امرا اور سردار ملکہ کی آواز کو جسے وہ بادشاہ کی آواز سمجھتے تھے' لبیک کہتے ہوئے ملکہ کی مدد کو دوڑے اور ان لوگوں سے آ کے بھڑ گئے جو ملکہ کو گھیرے ہوئے تھے- اس وقت ملکہ نور جہاں نے اپنی شمشیر آبدار کے وہ جوہر دکھائے کہ راجپوت بھی عش عش کر اٹھے- ملکہ کے کندھے پر ایک کاری زخم آیا جس سے وہ اور زیادہ غضبناک ہو گئی- جس شخص نے ملکہ کو یہ زخم پہنچایا تھا اسے فوراً ہی اپنی گستاخی کی سزا مل گئی اس

طرح کہ ملکہ نور جہاں نے تلوار کے ایک ہی وار میں اسے واصل جہنم کردیا۔

جنگ بڑی شدت سے جاری تھی کہ شاہی فوج کے پیر اکھڑنے لگے۔ یہاں تک کہ ملکہ کے گرد صرف چند سپاہی رہ گئے۔ یہ موقع بہت نازک تھا۔ دو سپاہی ملکہ کو گرفتار کرنے کے لیے بڑھے۔ یہ حالت دیکھ کر ملکہ دریا کے کنارے کی جانب بڑھی۔ اس دوران وہ اشاروں سے غنیم کو دعوت مبارزت دیتی ہوئی آخر دریا میں کود گئی۔ دونوں راجپوتوں نے اس کو قید کرنے یا اس کوشش میں خود مر جانے کا عزم کر کے ملکہ کا تعاقب کیا۔ زخم سے ناتواں ہونے کے باوجود ملکہ لہروں کا مقابلہ کرتی ہوئی تیر رہی تھی مگر پانی اس قدر تیزی سے بہہ رہا تھا کہ وہ اس کی رو میں بہنے لگی۔ دشمن سپاہی بھاری زرہ اور بالا پوش کی وجہ سے خود بہت بھاری ہو گئے تھے اس لیے وہ ملکہ تک نہ پہنچ سکے۔

کنارے کھڑے مغل سپاہی ملکہ اور اس کے تعاقب میں آنے والوں کی کشمکش اور زور آزمائی کو دیکھ رہے تھے مگر تیز پانی میں کودنے کی ان کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ آخر ایک شدید جدوجہد کے بعد ملکہ نور جہاں دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ تعاقب کرنے والے بھی اس کے قریب پہنچ گئے تھے اس لیے ملکہ کو پہلے ان سے نبٹنا پڑا۔ ایک راجپوت اپنے ساتھی سے پہلے کنارے پر پہنچ گیا مگر کنارا ڈھلوان تھا اس لیے چڑھتے وقت اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گرنے لگا مگر اس نے جلدی سے کنارے پر اگی ہوئی ایک جھاڑی کو پکڑ لیا۔ ملکہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر میان سے خنجر نکالا اور پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر رسید کیا۔

پس ملکہ کا یہ وار مہلک ثابت ہوا۔ اس سے سپاہی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور خون میں ڈوبا ہوا دریا میں گر گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی جو بہت پیچھے رہ گیا تھا وہ اس خونی حرب اور ضرب کے بعد وہاں پہنچا۔ وہ ملکہ کی اس غیر معمولی دلیری اور پھرتی سے اس قدر مرعوب ہوا کہ اس نے نہایت ادب سے ملکہ کو سلام کر کے کہا۔

''جہاں پناہ! آپ کی بہادری کا اجر قید سے بہتر ہونا چاہیے- ہر چند کہ آپ اس وقت میرے قبضے میں ہیں لیکن آپ نے بے نظیر شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے میں حد درجہ متاثر ہوا ہوں کہ آپ کو گرفتار کرنے سے معذور ہوں- اگر آپ مجھ کو صحیح سالم میری لشکر گاہ میں پہنچانے کا وعدہ کریں تو آپ آزاد ہیں اور اگر آپ انکار کریں گی تو میں آپ کو لے کر دریا میں کود جاؤں گا جہاں ہم دونوں تباہ ہو جائیں گے-''

''میں تمہاری شرط منظور کرتی ہوں اور تم کو تمہارے آدمیوں کے پاس پہنچانے کا ذمہ لیتی ہوں- تمہارا انداز شریفانہ اور واجب الاحترام ہے- میں تم کو کیا انعام دوں؟'' ملکہ نے شاہانہ وقار سے پوچھا-

''راجپوت اپنے دشمن سے انعام نہیں لیا کرتے- اس کے علاوہ میں آپ کی فیاضی کا مستحق نہیں ہوں- میں نے آپ کو اس لیے نہیں چھوڑا ہے کہ آپ ''ملکہء ہند'' ہیں بلکہ اس لیے کہ آپ نے ایک عورت کی حیثیت سے جو دادِ شجاعت دی ہے' میں اس کا مداح ہوں- عورتوں میں یہ وصف بہت کمیاب ہے لہٰذا آپ قابل قدر ہیں- اگر کسی راجپوت عورت سے بھی اس قسم کے کارنامے ظہور میں آتے تو میں اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کرتا-''

شاہی لشکر نے نعروں سے ملکہ کا خیر مقدم کیا- ملکہ نے حسب وعدہ راجپوت سپاہی کو دریا سے کچھ فاصلے پر ایک گزرگاہ تک پہنچا دیا جہاں سے وہ مہابت خاں کی لشکر گاہ میں چلا گیا-

ملکہ کو صحیح وسالم دیکھ کر دو مغل سردار مع اپنے سپاہیوں کے دریا عبور کر کے آئے اور شاہی فوج میں شامل ہو گئے جو اس وقت منتظر ہو رہی تھی- ان سرداروں کی آمد سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ از سر نو منظم ہو کر میدان میں ڈٹ گئی- اس طرح لڑائی کا میدان پہلے سے زیادہ گرم ہو گیا-

اب راجپوت پسپا ہونے لگے اور اور اس خیمے کی طرف چلے جس میں جہانگیر نظر بند تھا- جب تیروں اور بندوق کی گولیوں سے خیمے کے پردے چھلنی ہو گئے تو ایک نگہبان سپاہی نے بادشاہ کی حفاظت کی اور وہ ڈھال لے کر بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا- اس اثناء میں مہابت خاں نے اپنی سپاہ کو عقب میں جمع کر کے مغل فوج کے پہلو پر حملہ کیا- یہ حملہ ایسا سخت تھا کہ مغل اس کی تاب نہ لا سکے اور شکست کھا کر بھاگ گئے- میدان جنگ میں لاشوں کے انبار لگ گئے اور ایک شدید جدوجہد کے بعد مہابت خاں کو نمایاں فتح حاصل ہوئی-

وزیر اس ہزیمت سے دل برداشتہ ہو کر میدان سے بھاگ گیا اور پانچ سو آدمیوں کے ساتھ مغربی اہتاس کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوا- یہ قلعہ گو کہ مضبوط تھا مگر ایک ایسے لشکر کے مقابلے میں جس کا حوصلہ کامیابی نے بہت بڑھا دیا تھا اور جو زمانہ کے بہترین سپہ سالار کے ماتحت تھا' اپنے پناہ گیروں کی یقینی حفاظت نہیں کر سکتا تھا- ملکہ نور جہاں نے لاہور کا راستہ لیا لیکن اس کی سلامتی بھی مشکوک تھی کیونکہ فوج اس کے ہمراہ بالکل نہ تھی اور تمام چیدہ مغل امراء مقتول یا قید ہو چکے تھے مگر وہ اپنے مصائب کو ایسی ثابت قدمی سے برداشت کر رہی تھی جو اس کی متین طبیعت اور بلند ہمتی کے بالکل مطابق تھی-

مہابت خان نے ایک قاصد کے ذریعہ وزیر کو سلامتی کا یقین دلایا مگر وزیر نے اپنے آپ کو ایک فاتح باغی کے رحم و کرم کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا- اس پر مہابت خان نے ناراض ہو کر اپنے بیٹے کو ایک بڑی جمعیت کے ساتھ قلعہ روہتاس کا محاصرہ کرنے کے لیے بھیجا اور پھر خود بھی مع اپنے تمام لشکر کے اس سے جا ملا- وزیر نے خفیف مقابلہ کے بعد اس کی اطاعت کر لی- مہابت خاں نے اس کے ساتھ ایسی خوش خلقی اور التفات کا سلوک کیا جس سے ان دونوں میں دلی دوستی ہو گئی-

اس وقت بادشاہ نے نور جہاں کو ایک خط لکھا کہ مہابت خان کا حسن سلوک قابل

تعریف ہے- مجھے یقین ہے کہ اگر تم یہاں آؤ تو وہ پورے احترام کے ساتھ تمہارا استقبال کرے گا- گزشتہ دشمنی کو بھول جاؤ اور عداوت کا خیال دل سے نکال دو تا کہ سلطنت خانہ جنگی کی مصیبت میں مبتلا نہ ہو- میں اب کابل کا قصد کرنے والا ہوں' لہٰذا تم بھی میرے ساتھ چلو- مجھ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی اور میں کامل آزادی کے ساتھ جہاں چاہوں جا سکتا ہوں-

نور جہاں نے فوراً حالات کا اندازہ کر کے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کا ارادہ کیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ موجودہ صورت میں اس کی عدم تعمیل زیادہ خطرناک ہوگی- اس لیے وہ بہتر صورت اختیار کرنے کے لیے لاہور سے روانہ ہوئی اور اپنے قیدی شوہر کے پاس پہنچ گئی جو اس وقت کابل کی طرف کوچ کر رہا تھا-

مہابت خان نے ملکہ نور جہاں کا شایانِ شان استقبال کرنے کے لیے اپنی فوج کا دستہ ارسال کیا مگر ملکہ صریح دھوکہ کھانے والی نہیں تھی اور مہابت خان اور اس کے آدمیوں کو اپنا دشمن تصور کرتی تھی- تاہم وہ اس نمائشی وفد سے بظاہر اچھی طرح پیش آئی اور بادشاہ سے خوش ہو کر ملی-

اس کے بعد ہی دفعتاً وہ سخت حراست میں لے لی گئی- اس کے خیمہ کے گرد پہرہ لگا دیا گیا اور اس کو باہر نکلنے کی سخت ممانعت کر دی گئی- مہابت خان نے اس پر حکومت کے خلاف بغاوت کا الزام لگایا اور اس کو ایک خطرناک مجرم کی حیثیت سے واجب تعزیر قرار دیا-

پھر مہابت خان نے بادشاہ سے کہا-

''جہاں پناہ! ہندوستان کے فرمانروا ہیں اور ہم لوگ جناب والا کو عام سطح انسانی سے بالاتر سمجھتے ہیں لہٰذا حضور کو خدا کے حکم کی پیروی کرنا چاہیے جو کسی کا لحاظ نہیں کرتا-''

مہابت خاں نے اس خیال سے کہ جب تک نور جہاں کو بالکل معطل اور بے اثر نہیں کیا

جائے گا' اس کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوگی- پس اس نے ایک سپاہی کو اس کی گرفتاری کے لیے مقرر کیا- وہ شخص آدھی رات کے وقت ملکہ کے خیمے میں داخل ہوا- ملکہ ایک ایرانی قالین پر محو خواب تھی- بستر کے قریب چاندی کے شمعدان میں ایک شمع جل رہی تھی جس کی روشنی میں قالین کے شوخ رنگ اپنی حقیقی آب وتاب کا مظاہرہ کر رہے تھے- ملکہ کے رشک ملائک چہرے پر ایسا سکون طاری تھا جو اس کی گہری نیند کو ظاہر کرتا تھا- اس کے گداز سینے سے لطیف اور باقاعدہ سانس اس طرح خارج ہو رہی تھی جس طرح کسی صاف انگیٹھی سے عود کی خوشبو نکلا کرتی ہے- اس کا دایاں ہاتھ جو کندھے تک برہنہ تھا اور جس پر تلوار کا زخم اب تک سرخ اور تازہ نظر آتا تھا' اس کے دل پر' سینے کے اس طرف سے اس طرف تک پھیلا ہوا تھا-

ملکہ نور جہاں کو دیکھکر سپاہی ایسا مرعوب ہوا کہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکا اور بے حس وحرکت کھڑا رہ گیا یہی نہیں بلکہ سپاہی ملکہ کی بے باکی اور دلاوری کا خیال کر کے اس درجہ لرزہ براندام ہوا کہ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی- تلوار گرنے کی آواز سے ملکہ نور جہاں کی آنکھ کھل گئی اور وہ چونک کے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی-

ملکہ نے نفرت اور حقارت سے گھورا اور بے پروائی سے کہا-

''میں تمہاری نیت سے واقف ہوں- تم میرے قتل کے ارادے سے آئے ہو لیکن نور جہاں بھی ایک چھپے قاتل کے خنجر سے ہلاک ہونے کے لیے آمادہ ہے- آگے بڑھ کر وار کرو''

یہ کہہ کر ملکہ نے اپنا سینہ کھول دیا اور سختی سے کہا-

''وقت ضائع نہ کرو اور اپنا کام انجام دو-''

سپاہی حواس باختہ ہو گیا اور فوراً ملکہ نور جہاں کے پیروں پر گر پڑا- پھر اس نے اپنی گری ہوئی تلوار کی طرف اشارہ کر کے اپنے مقصد سے توبہ کی اور کہا-

''میں ایک دوسرے شخص کا محض گماشتہ ہوں- میں آپ کو گرفتار کرنے کی غرض سے آیا تھا- یہ تلوار میں نے صرف اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھی تھی-''

ملکہ نے باوقار لہجے میں اسے جواب دیا-

''جاؤ اور اپنے ولی نعمت سے کہہ دو کہ ملکہ موت سے بھی نہیں ڈرتی کیونکہ موت کا ایک وقت مقرر ہے- لیکن ملکہ انصاف کی متمنی ہے مگر اس طرح درپردہ اور ناگہاں گرفتار کرنا انصاف نہیں بلکہ ظلم ہے- میں پہلے ہی اس کے ہاتھوں میں قید ہوں مگر اس کو ایک بہادر اور شریف آدمی کی طرح اپنے اقتدار سے کام لینا چاہیے-''

مہابت خاں کو اپنی تدبیر پر تعجب نہیں بلکہ رنج ہوا- وہ جہانگیر کے پاس گیا اور اس نے شاہ سے ملکہ کی سخت گیری کی شکایت کی تاکہ وہ ملکہ سے بدظن ہو کر اس کے اختیارات چھین لے-

جہانگیر بخوبی جانتا تھا کہ مہابت خاں کا مطالبہ کسی حد تک درست ہے اور موجودہ حالات میں اس مطالبے کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں- چنانچہ اس نے مہابت کو اطمینان دلانے کے لیے کہا-

''ہم مہابت خاں کی شکایت پر غور کرنے کا وعدہ کرتے ہیں-''

مہابت خاں کو بادشاہ کے اس جواب سے اطمینان ہو گیا-

نور جہاں کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ مطلق نہ گھبرائی اور متانت سے بولی-

''جب بادشاہوں کی آزادی سلب ہو جاتی ہے تو وہ کسی رعایت کے بھی مستحق نہیں رہتے تاہم میں اس نازک وقت میں تھوڑی دیر کے لیے بادشاہ سے ملاقات کی اجازت چاہتی ہوں-''

ملکہ کو ملاقات کی اجازت مل گئی اور وہ بادشاہ کے پاس گئی- اس کے چہرے سے ظاہر

ہوتا تھا کہ وہ اپنے حزن و ملال کو ضبط کر رہی ہے مگر اس کیفیت نے بھی اس کے خداداد حسن کو دوبالا کر دیا تھا- ملکہ منہ سے کچھ نہ بولی مگر اس نے سر جھکایا اور بادشاہ کا پیار بھرے انداز سے ہاتھ چوم لیا- جہانگیر کا دل بھر آیا اور ملکہ کی مجبوری سے بادشاہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں تب اس نے دل ہی دل میں مہابت خان پر لعنت بھیجی-

ملکہ کو مہابت خاں کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری اور وہ اس سے انتقام لینے کے درپے ہو گئی مگر اس نے مہابت خاں کو شبہ نہ ہونے دیا- مہابت خاں کو اپنی راجپوت سپاہ پر پورا بھروسہ تھا اس لیے وہ اپنی جان کا خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا- دوسرے بادشاہ اس کا طرفدار تھا اس لیے وہ ملکہ کی مخالفت کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا- دراصل مہابت خان نے ملکہ کی فطرت کو سمجھنے میں سخت غلطی کی تھی- ملکہ جب تک اپنا مقصد حاصل نہ کر لیتی تھی وہ چین سے نہیں بیٹھتی تھی-

ملکہ نور جہاں کو اس کی بیٹی دے دی گئی تھی مگر اس کی کیفیت بھی کسی قیدی جیسی تھی- ملکہ اس کو اپنی شدید توہین سمجھتی مگر زبان سے کچھ نہ کہتی تھی- اس نے بادشاہ سے مہابت خاں کے بارے میں شکایت کرنا بھی چھوڑ دیا مگر وہ اندر ہی اندر انتقام کے منصوبے باندھ رہی تھی-

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ مہابت خاں صبح کے وقت اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ بادشاہ کے سلام کو جا رہا تھا- جب وہ ایک تنگ راستے سے گزر رہا تھا تو ناگہاں اس پر دونوں جانب سے حملہ کیا گیا- بہت سے گھروں کی کھڑکیوں سے اس پر تیر برسائے گئے جس سے سخت ہنگامہ برپا ہو گیا چونکہ مہابت خاں کے آدمی پوری طرح مسلح تھے اس لیے وہ مخالفین کے ہجوم کو چیرتا ہوا صاف نکل گیا- اس کی سلامتی ایک معجزہ سے کم نہ تھی- ہر چند کہ اس کے کئی محافظ اور ساتھی اس ہنگامہ میں مجروح اور قتل ہوئے مگر مہابت خاں صاف بچ گیا-

اس سازش کا اہتمام اس خوبی سے کیا گیا تھا کہ مہابت خاں کے محافظوں میں سے نہ

کسی کوخبر ہوسکی اور نہ ہی کسی قسم کا شبہ ہوا-مگر اس سازش کا اثر جلد پھیل گیا-شہر کابل میں کھلبلی مچ گئی-اگر مہابت خاں شہر سے باہر اپنے خیمہ میں پناہ نہ لیتا تو وہ اہل شہر کے غضب کا شکار ہو جاتا- وہ انتقام کی کوشش میں لگ گیا- دوسری طرف ملکہ کو اس سازش کے ناکام ہونے کا شدید احساس ہوا اور خطرہ پیدا ہو گیا-

ادھر جب شہر والوں کو معلوم ہوا کہ مہابت خاں ان سے ناراض ہو کر انہیں غداری کی سزا دینے کی فکر کر رہا ہے تو وہ بہت خوفزدہ ہوئے- اہل شہر نے چند معززین شہر کا ایک وفد مہابت خاں کے پاس بھیجا اور معافی کی درخواست کی- ان معززین نے غیر ذمہ دار راہگیر کو فساد کا بانی بتایا اور ان سرغنوں کو گرفتار کر کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا-

مہابت خاں کا قیاس کہتا تھا کہ اس قتل وفساد کی سازش میں ملکہ نور جہاں پوری طرح ملوث ہے تاہم اس نے ان لوگوں کو معاف کر دیا لیکن اس نے کابل میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھا لی اور دوسری صبح وہ بادشاہ کے ہمراہ لاہور کی طرف روانہ ہو گیا-

اثنائے سفر میں مہابت خاں کا دماغ اک دم الٹ گیا اور اس نے اقتدار سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کیا- اسے سلطنت کی مطلق آرزو نہ تھی- اس نے بادشاہ سے اپنی گزشتہ خطاؤں کی معافی حاصل کر کے اسے کامل آزادی دے دی- پھر اس نے ایک مختصر فوجی دستہ کے سوا پوری فوج منتشر کر دی مگر نور جہاں اس شخص کی فیاضی سے بالکل متاثر نہ ہوئی- بلکہ اب بھی وہ انتقام لینے کا موقع تلاش کر رہی تھی- اسے اچھی طرح یاد تھا کہ مہابت خاں نے ایک بار اسے قتل کرنے‘ اسے رعایا کی نظروں میں ذلیل کرنے اور اسے بادشاہ کی نظروں سے گرانے کی تمام تر کوششیں کی تھیں- اس بنا پر ملکہ چاہتی تھی کہ مہابت خان کو بادشاہ قتل کرا دے یا کم از کم قید میں ڈال دے-

پس ملکہ نے ایک دن بادشاہ سے سرگوشیوں میں کہا-

''جو شخص اپنے بادشاہ کو گرفتار کرنے میں تامل نہ کرے اس کے خطرناک ہونے میں کیا شک ہے- اگر آپ اس شخص کو جس نے بادشاہ کا تخت الٹ دیا' معاف کر کے اپنے حضور میں محض ظاہری اور نمائشی کورنش اور آداب بجالانے کی اجازت دیں گے تو رعایا کی نظروں میں ایسی بادشاہت کی کوئی وقعت نہ ہوگی-''

مگر جہانگیر نے مہابت خاں کے تحمل کی تعریف کی اور اس کی وجہء اشتعال کو حق بجانب خیال کیا اور ملکہ کی نصیحت پر توجہ نہ دی اور اسے نرمی سے سمجھا کر خاموش کرا دیا-

نور جہاں بادشاہ کے گلے سے خاموش ہوگئی مگر اپنے پختہ ارادے سے باز نہ آئی- دراصل اس کی مخالفت کی ایک معقول وجہ تھی وہ یہ کہ اس کی بیٹی جو شیر افگن سے تھی بادشاہ کے چوتھے بیٹے شہریار سے بیاہی گئی تھی اس وجہ سے وہ اپنے داماد شہریار کی جانشینی اور بادشاہت کی آرزومند تھی- اس وجہ سے ملکہ وراثت کے دوسرے مدعی شہزادے شاہجہاں سے رقابت رکھتی تھی- مہابت خاں' شاہجہاں کا طرفدار تھا اس لیے ملکہ نور جہاں اسے مارِ آستین سمجھتی تھی-

چند روز بعد جب مہابت خاں پر دوسرا قاتلانہ حملہ ہوا تو وہ دارالحکومت سے فرار ہو گیا- شاہی میں یہی کچھ ہوتا ہے- شاہی ملازم کے پاس جب تک اقتدار رہتا ہے وہ زمین پر قدم نہیں رکھتا لیکن جب اقتدار چھن جائے تو وہ دو کوڑی کا نہیں رہتا- مہابت خاں دارالحکومت سے فرار ہوا تو ملکہ نور جہاں نے ایک دستہ اس کی گرفتاری پر لگا دیا- ملکہ کا بھیجا ہوا یہ دستہ اگرچہ مہابت خاں کو گرفتار نہ کرسکا اور وہ ملکہ کی دست درازی سے صحیح وسالم باہر ہوگیا مگر وہ شخص جو پچھلے دنوں ایک زبردست لشکر کا قائد تھا' وہ اقتدار چھن جانے کے بعد ایک مفرور مجرم کی حیثیت رکھتا تھا اور اپنی جان بچانے کے لیے تنہا مارا مارا پھرتا تھا-

مہابت خاں کی ساری دولت ضبط کرلی گئی تھی- پوری مملکت میں اس کے باغی ہونے

کا اعلان کرا دیا گیا تھا- اس کی گرفتاری کے فرمان جاری ہو چکے تھے- جہانگیر اگرچہ اپنی طرف سے مہابت خاں کو معاف کر چکا تھا لیکن نور جہاں کی وجہ سے وہ مہابت خاں کی کوئی عملی مدد نہیں کر سکتا تھا-

دوسری طرف ملکہ نور جہاں کا بھائی آصف خاں وزیر اپنے داماد شاہجہاں کی تخت نشینی کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا- اس لیے وہ مہابت خاں کا لازماً دوست اور مددگار ہو گیا تھا- وہ جانتا تھا کہ اس وقت ملک میں مہابت خاں جیسا بہادر سپہ سالار اور دور اندیش مدبر کوئی دوسرا نہیں ہے- اس لیے وہ اس کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا- مہابت خاں بھی اس کو اپنا ہمدرد سمجھتا تھا اور اس کے بھروسے پر مہابت خاں صبر و سکون سے تمام مصائب برداشت کر رہا تھا-

جب آصف خاں وزیر نے اس کو اپنی دوستی کا یقین دلایا اور اپنے حضور طلب کیا تو مہابت خاں گھوڑے پر سوار ہو کر تن تنہا چار سو میل کی مسافت طے کر کے اس کے لشکر میں پہنچا جو اس وقت لاہور سے دہلی جانے والی سڑک کے درمیان خیمہ زن تھا-

وزیر کا دیوان، مہابت خاں کو فوراً اندر لے گیا- اس کی حالت زار دیکھ کر وزیر (آصف خاں) کا دل بھر آیا اور وہ اس کی دلجوئی کرنے لگا-

مہابت خان نے اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور شاہجہاں کی جانشینی کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کا بیڑا اٹھایا جس سے آصف خاں کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی-

مگر آصف خاں اور مہابت خاں کی اس سازش کے چند ہی روز بعد جہانگیر کا انتقال ہو گیا

چو تاریخ وفاتش جست کشفی
خرد گفتار ''جہانگیر از جہاں رفت''

اس وقت شاہجہاں جو اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر چکا تھا دکن میں بھاگا

بھاگا پھرتا تھا لیکن تخت وتاج کا دوسرا مدعی شہریار دارالحکومت کے قریب موجود تھا- آصف خاں ڈرا کہ کہیں شہریار کامیاب نہ ہو جائے اس لیے اس نے نہایت چالاکی سے جہانگیر کے سب سے بڑے بیٹے خسرو مرحوم کے نوعمر لڑکے داور بخش کو برائے نام تخت پر بٹھا کر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور نور جہاں کو نظر بند اور شہریار کو اندھا کر دیا-

اس کے بعد شاہجہاں کو جلد از جلد دارالحکومت میں طلب کیا گیا- چنانچہ وہ کوچ در کوچ کرتا آگرہ آیا جہاں اس نے بڑے جاہ وجلال سے تخت پر جلوس کیا اور شہریار، داور بخش، طہمورث وہوشنگ الغرض تمام شہزادوں کو جن کی طرف سے رقابت کا اندیشہ ہو سکتا تھا در پردہ قتل کرادیا-

نور جہاں کے اقبال کا آفتاب غروب ہو گیا- وہ جملہ سیاسی اختیارات سے محروم کر دی گئی اور اپنی حیات مستعار کے آخری لمحے پورے کرنے کے لیے مضافاتِ لاہور میں اپنے شوہر جہانگیر کے مقبرے کے قریب رہنے لگی-

نور جہاں اور جہانگیر کے رومان کے متعلق کئی افسانے مشہور ہوئے ہیں- کہا جاتا ہے کہ دونوں میں آغازِ شباب ہی سے محبت تھی لیکن اکبر ان کی شادی میں حائل ہوا- تخت نشینی کے بعد جہانگیر نے شیر افگن کو مروا کر اپنے راستے سے ہٹا دیا اور نور جہاں سے خود شادی کر لی لیکن مشہور مورخ پرشاد نے ''ہسٹری آف جہانگیر'' میں ان حکایتوں کو بے بنیاد ثابت کیا ہے- اس کے دلائل یہ ہیں:

۱- کسی ہم عصر مورخ نے اس بات کی طرف اشارہ تک نہیں کیا-

۲- شاہ جہانی دور کے مورخ جو نور جہاں کے مداح نہیں تھے- وہ اس بارے میں بالکل خاموش ہیں-

۳- ہم عصر یورپیوں کی تحریریں بھی اس کے ذکر سے سراسر خالی ہیں حالانکہ وہ لوگ مغلوں کی نجی زندگی کے بارے میں من گھڑت اور

بے ہودہ باتیں مشہور کرنے پر تلے رہتے تھے۔

۴۔ اگر اکبر کو دونوں کی محبت کا علم تھا تو اس نے شیر افگن کو سلیم کے ماتحت کیوں رکھا؟

۵۔ یہ کیسے ممکن ہوا کہ جہانگیر ایسے رقیب پر جس سے وہ مات کھا چکا تھا' ہمیشہ مہربان رہا۔ تخت نشینی سے پہلے اور بعد میں اسے ترقی دی۔ جاگیر عطا کی اور خطاب دیا۔

۶۔ نور جہاں کا کردار ایسا تھا کہ وہ کبھی ایسے شخص سے محبت نہ کرتی جس نے اس کے خاوند کو قتل کروایا تھا۔

۷۔ قطب الدین خاں کو اس لیے بنگال کا صوبہ دار نہیں بنایا گیا تھا کہ وہ شیر افگن کو ہلاک کرے بلکہ جہانگیر چاہتا تھا کہ اپنے سیاسی مخالف راجہ مان سنگھ جیسے اہم صوبہ سے ہٹا دیا جائے۔

اصل حقیقت یہ تھی کہ نور جہاں نے اپنے بے مثال حسن' غیر معمولی ذہانت اور مزاج شناسی سے بادشاہ کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ ملکی معاملات میں اس کا دخل بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ حکومت کا کوئی کام نور جہاں کے مشورے کے بغیر طے نہیں پاتا تھا۔ بعض اوقات شاہی احکامات ملکہ کے دستخطوں سے جاری ہوتے تھے۔ شاہی مہر پر بھی ملکہ کا نام کندہ تھا۔ اس عہد کے کئی سکوں پر نور جہاں کا نام موجود ہے۔

بہ حکم شاہ جہانگیر یافت صد از ور۔ بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

آخر یہ حالت ہوئی کہ ملکہ سیاہ و سفید کی مالک ہو گئی۔ جہانگیر کہا کرتا تھا کہ میں نے اختیارات شاہی نور جہاں بیگم کو سونپ دیے ہیں۔ خود مجھے ایک سیر شراب اور آدھا سیر گوشت سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

ملکہ نور جہاں کے عہد اقتدار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور ۱۶۱۱ء سے شروع ہو کر ۱۶۲۲ء میں ختم ہوا- اس دور میں ملکی سیاست پر نور جہاں کا جتھہ چھایا رہا- اس گروپ کے دوسرے اراکین شہزادہ خرم، ملکہ کا باپ اعتمادالدولہ اور ملکہ کا بھائی آصف خاں تھے- ملکہ کے اثر ورسوخ کی وجہ سے ان اشخاص کو بلند ترین مناصب عطا ہوئے- یہ ایک کامیاب دور تھا جس میں گروپ کے تمام اراکین کی صلاحیت سلطنت کے مفاد کی نگرانی میں استعمال ہوئی-

دوسرا دور ۱۶۲۲ء سے لے کر جہانگیر کی وفات یعنی ۱۶۲۷ء تک جاری رہا- اس دور میں نور جہاں نے بلا شرکت غیرے اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھا کیونکہ شاہجہاں کی بغاوت اور اعتمادالدولہ کی موت سے گروپ ٹوٹ گیا تھا- دوسری طرف بادشاہ کی صحت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ وہ ملکی معاملات میں دلچسپی لے ہی نہیں سکتا تھا- اس دور میں ملکہ کی ہوس اقتدار اور سازشوں کی وجہ سے بغاوتیں ہوئیں- بدنظمی پھیلی اور خانہ جنگی کا آغاز ہوا-

جہانگیر سے شادی کے وقت نور جہاں کی عمر ۲۲ سال ہو چکی تھی لیکن اس کے حسن و جمال میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی- اس پر اعلیٰ تعلیم، شائستگی، فنکارانہ مزاج اور سخن آرائی کے اوصاف نے اسے فطرت کا ایک شاہکار بنا دیا تھا- ملکہ کو برجستہ شعر کہنے کا ملکہ حاصل تھا- قدرت نے ملکہ کو ایسی ذہانت اور معاملہ فہمی عطا کی تھی کہ وہ نظم مملکت کی ہر گتھی آسانی سے سلجھا لیتی تھی- اس کے فیصلوں کے آگے بڑے بڑے جرنیلوں اور امرا کو سر جھکانے پڑتے تھے- نور جہاں ملکی معاملات کی مکمل نگرانی کرتی تھی- وہ محض ایک نازک اندام حسینہ نہیں تھی بلکہ ایک مضبوط قلب و ذہن اور قوتِ ارادی کی مالکہ تھی-

ملکہ نور جہاں کو شکار سے بھی دلچسپی تھی- اکثر شاہی شکار میں شریک ہوتی اور کئی موقعوں پر اس نے شیر کو اپنے ہاتھ سے ہلاک کیا تھا- وہ بلا کی حاضر دماغ تھی- نازک اور مشکل مرحلوں پر اس کی ذہنی صلاحیتیں زیادہ اجاگر ہوتی تھیں- جب مہابت خاں نے بادشاہ کو اپنی

حفاظت میں لے لیا تو وہ فوراً ہاتھی پر سوار ہوئی۔ اس کے بازوؤں میں کم سن نواسی تھی پھر بھی اس نے فوج کی کمان سنبھال کر بادشاہ کو بچانے کی جرات مندانہ کوشش کی۔

ملکہ نور جہاں میں مردانہ صفات کے ساتھ نسوانی جوہر بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ وہ اپنے رشتہ داروں پر ہمیشہ مہربان رہی۔ اس کی کوشش اور اثر و رسوخ سے اس کے باپ اور بھائی اعلیٰ عہدوں پر پہنچے یہاں تک کہ آصف خاں کا مقام تمام قدیم امرا سے بھی بلند ہو گیا۔ اسے جہانگیر سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی وجہ سے بادشاہ بھی اس پر جان دیتا تھا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد وہ ۱۸ سال تک اس کی قبر کی مجاوری کرتی رہی اور بالآخر وہیں انتقال کیا۔

نور جہاں میں لطیف جمالیاتی ذوق بھی تھا۔ اس نے نئے نئے فیشن ایجاد کیے۔ لباس کی نئی نئی طرزیں رائج کیں اور جواہرات کے نئے نمونے تخلیق کیے جس سے مغل دربار کی ظاہری شان و شوکت دو بالا ہو گئی۔ خس کی ٹٹیاں اور چاندی کا فرش بھی نور جہاں کے ذہن اختراع کا نتیجہ تھا۔ اس کی طبیعت میں سخاوت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کم و بیش پانچ سو یتیم لڑکیوں کی شادی اور جہیز کا اہتمام اس نے اپنی گرہ سے کیا تھا۔ ملکہ نور جہاں کو لوگ بے کسوں کی پناہ گاہ کہتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی مجرموں نے بھی اس کا سہارا لیا تو ان کو بھی معافی مل گئی۔

ملکہ نور جہاں میں بے شمار اوصاف کے ساتھ کچھ خامیاں اور کمزوریاں بھی تھیں۔ اس کی ہوس اقتدار اور غرور نے سلطنت مغلیہ کو نقصان پہنچایا۔ وہ کسی کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پس پردہ رہ کر جس انداز سے تار ہلائے اس سے قدیم امرا بددل ہو گئے اور ان میں گروہ بندی کا آغاز ہوا۔

ملکہ نور جہاں نے سب سے پہلے شہزادہ خرم کو آگے بڑھایا مگر اس کے بعد نور جہاں شیر افگن سے بیٹی لاڈلی بیگم کی شادی جہانگیر کے چھوٹے بیٹے شہریار سے ہوئی تو ملکہ شہزادہ خرم کے خلاف ہو گئی اور شہزادے شہریار کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ

شہزادہ نکما اور نااہل تھا- یہاں تک کہ لوگ اسے ''ناشدنی'' کہتے تھے-شہزادہ خرم جس نے سلطنت کی گراں قدر خدمات انجام دی تھیں- وہ ان حالات سے دل برداشتہ ہوگیا اور اس نے بغاوت کر دی-- جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قندھار پر ایرانیوں کا قبضہ ہوگیا اور ملک خانہ جنگی کی بھیٹ میں آ گیا-

مہابت خاں کا بھی ایسا ہی حشر ہوا- اس نے شاہجہاں کی بغاوت کچلنے میں بڑی ستعدی دکھائی تھی مگر ملکہ اس کی شہرت سے بھی خائف ہوئی اور اسے رسوا کرنا شروع کر دیا- بنانچہ وہ بھی بغاوت پر مجبور ہوگیا- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ نور جہاں نے بادشاہ کی عیش کوشی ورتساہل پسندی کی بھی حوصلہ افزائی کی- یہاں تک کہ اس نے ملکی معاملات میں دلچسپی لینا لکل ترک کر دیا- بہرکیف اگر یہ کہا جائے کہ جہانگیر کا عہد اگر کچھ زیادہ شاندار نہیں تھا تو لکہ نور جہاں بھی کافی حد تک اس کی ذمہ دار تھی-

جہانگیر کی صحت دن بدن خراب ہو رہی تھی- یہاں تک کہ کشمیر سے واپسی پر دمہ کا ندید دورہ پڑا اور ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۸ء کو راجوری کے مقام پر اس نے وفات پائی- اس کی لاش ہور لائی گئی اور وہ شاہدرہ کے قریب دلکشا باغ میں دفن ہوا جہاں اس کا شاندار مقبرہ آج ھی دعوت نظارہ دیتا ہے-

ملکہ نور جہاں، جہانگیر کی وفات کے بعد تقریباً اٹھارہ سال تک اس کی قبر کی مجاوری کرتی ہی پھر آخر وہیں انتقال کیا- اس کا مقبرہ بھی جہانگیر کے مقبرے کے قریب ہی ہے-

ہیہات باحیات کسے در جہاں نماند
از دست مرگ ہیچ کسے دراماں نماند
ہر بلبلے کہ آمدہ در باغِ ایں جہاں
فریاد کرد رفت در بوستاں نماند

انارکلی

ایک کنیز جو ولی عہدِ سلطنت سے محبت کے "جرم" میں جان ہار گئی

شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کے دور حکومت میں قلعہ لاہور کی رونقیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کسی نے کہا تھا اور ٹھیک ہی کہا تھا کہ شاہی محلات کے دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ مگر دن کے درمیان جو دوپہر کا وقفہ ہوتا تھا اس میں حرمِ شاہی اور پائیں باغ کے درمیان واقع بارہ دری پر شاہی کنیزوں کا ایسا زبردست قبضہ ہوتا کہ خدا کی پناہ۔ دراصل کنیزوں نے اس بارہ دری کو دوپہر کے اوقات میں اپنی نزہت گاہ میں تبدیل کر دیا تھا۔

دوپہر ہوتے ہی وہاں طرح طرح کے ضروری اور غیر ضروری کام شروع ہو جاتے۔ کچھ چوسر کے کھیل میں لگ جاتیں۔ کچھ شطرنج کی چالوں میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتیں۔ جگہ جگہ پاندان کھل جاتے جو آیا اس نے ایک بیڑہ لگا کے گال میں دبایا پھر یہ جاوہ جا۔ کہاں کی کہاں پہنچتی تھی۔ سر گوندھنا' دوپٹے رنگنا یا ان پر لچکا لگانا ان کنیزوں کا خاص شغل تھا۔ ادھیڑ عمر کنیزیں یا جنہیں زمانہ کے سرد و گرم اور گرانباریوں نے بے حس بنا دیا تھا ان کے نزدیک فراغت کا بہترین مقصد نیند اور صرف نیند تھا۔ وہ اس جگہ اور دوپہر کے دوران بھٹکتی ہوئی ادھر نکل آتیں تو کسی سہارے سے سر ٹکاتیں اور پھر خراٹے بھرنے لگتیں۔

ایک دوسرے کی برائیاں کرنے یا ان کی تعریف کرنے کے لیے بھی کنیزوں کی نزہت گاہ کافی مصروف تھی۔ اس دوپہر کی آرام گاہ کی بلاشرکت غیرے دلآرام مالک اور خالق تھی۔ اس کا اس بازار میں طوطی بولتا تھا۔ جس وقت دلارام اپنی دونوں چمچیوں یعنی مروارید

اور عنبر کے ساتھ اس بزم میں آتی تو تمام کنیزیں اس کی طرف متوجہ ہو جاتیں- دلا رام کو سرکار دربار میں کافی اثر ورسوخ حاصل تھا- بعض کنیزیں تو سرعام کہتی پھرتی تھیں کہ شہنشاہ ہند کی دلا رام پر خاص عنایت ہے اور بعض کے خیال میں دلا رام کے اس عروج کا سبب ولی عہد بہادر یعنی شہزادے بہادر صاحبِ عالم سلیم تھے جن کے دست شفقت نے دلا رام کو تمام کنیزوں کا سرخیل اور سردار بنا دیا تھا- صاحب عالم اپنا ہر کام دلا رام کے ذریعہ انجام دیتے تھے جس کے جواب میں دلا رام کی یہ حالت تھی کہ

''منہ لگائی ڈومنی ناچے تال بے تال''

ایک طرف شہنشاہ ہند اکبر اعظم اور دوسری طرف صاحب عالم شہزادہ معہ اپنی ہندو رانی ماں کے دلا رام پر اس قدر مہربان تھے کہ وہ فرش پر پیر بھی نہ رکھتی تھی اور اوپر ہی اوپر اڑتی پھرتی تھی- چنانچہ اس وقت بھی دلا رام اپنی دونوں چمچیوں یعنی رازدار سہیلیوں کے ساتھ ایک کونہ سنبھالے دوسروں کی غیبت میں مصروف تھی-

دلا رام بلاشبہ ایک دراز قامت اور متناسب ناک نقشے کی کنیز تھی جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ چرب زبان بھی تھی- شہنشاہ، رانی اور شہزادے کی خوشامد کرنا بلکہ خوشامد میں ہر دم لگے رہنا اس کا خاص فن تھا اسی لیے وہ بیگمات میں کافی مقبول تھی مگر ادھر کچھ دنوں سے دلا رام کی عزت وشہرت کا آفتاب گہنایا گہنایا محسوس ہوتا تھا- دلا رام کو یہ گہن نئی حلقہ کنیزاں میں شامل ہونے والی ایک پری وش کنیز انارکلی سے لگا تھا-

انارکلی واقعی انارکلی تھی- ستواں ناک، چھریرہ بدن، نازک نازک، گورے گورے ہاتھ پاؤں اندھیرے میں بھی انارکلی کا ساتھ نہ چھوڑتے تھے- انارکلی کا گداز مگر پھرتیلا جسم اور ناگن کی طرح بل کھاتی چال دیکھنے والے کو بے خود کر دیتی تھی اور شاید اسی زور پر انارکلی، دلا رام جیسی کہنہ مشق اور مقبول کنیز کے مقابلے پر سینہ تان کے کھڑی ہو گئی تھی- اس طرح یہ

دونوں کنیزیں اس پرائیویٹ محفل کی جان تھیں۔

چنانچہ اس مقام کی خلوت کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے انارکلی کی دونوں چنچل اور منہ پھٹ ساتھی گانے بجانے کا شوق فرما رہی تھیں۔ ان کی نشست دالان کے دائیں جانب تھی اور دوسری طرف دلارام اپنی دونوں سہیلیوں اور ساتھیوں مروارید اور عنبر کو ساتھ لیے بیٹھی تھی اور گھور گھور کے بار بار زعفران اور ستارہ کو دیکھ رہی تھی جنہوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کے پوری بارہ دری کو سر پر اٹھا لیا تھا۔

آخر دلارام سے برداشت نہ ہوا تو منہ بنا کے بولی۔

''اللہ توبہ! کیسے گلے پھاڑ پھاڑ کے چیخ رہی ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔''

مروارید نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی اور بولی۔

''کم بختوں نے دوپہر کا آرام بھی غارت کر دیا ہے۔''

انارکلی کچھ زیادہ تیز طرار نہ تھی۔ اس لیے وہ تو ٹال گئی لیکن اس کی دونوں ساتھی یعنی زعفران اور ستارہ بھلا کیسے برداشت کرتیں۔ چنانچہ زعفران منہ چڑھا کے بولی۔

''ہم تو یونہی گائیں بجائیں گے جسے باتیں کرنی ہوں وہ کہیں اور جا بیٹھے۔''

''ہم کہیں اور جا بیٹھیں مگر یہ تان سین کی خالہ گائیں گی ضرور'' یہ کڑک دار آواز عنبر کی تھی جو دلارام کی دست راست بنی ہوئی تھی۔

انارکلی پھر بھی طرح دے گئی مگر زعفران کو کب برداشت ہوتا۔ بس وہ تنک کے بولی۔

''منہ سنبھال کے بول ورنہ......''

آخر دلارام کو پھر دخل دینا پڑا۔ اس نے رعب دار آواز میں کہا۔

''بہت بڑھ بڑھ کے نہ بول زعفران ورنہ چھوٹی بیگم سے تیری شکایت کروں گی۔''

زعفران کو شاید اسی وقت کا انتظار تھا۔ اس نے انگلیاں نچا کر دلارام کو منہ توڑ جواب

دیا۔

"اب وہ دن گئے جب کمان چڑھی ہوئی تھی۔ کسی بیگم سے بات کر کے تو دیکھو۔ کوئی منہ بھی نہیں لگائے گا۔"

دلارام کے تن بدن میں اور آگ لگ گئی۔ وہ غصے سے کھڑی ہو گئی۔

"ٹھہر تو جا مردار! تیری زبان گدی سے نہ کھینچ لوں تو میرا نام دلارام نہیں۔"

انارکلی نے دیکھا کہ بات بہت بڑھ گئی ہے اس لیے اس نے زعفران کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور زعفران کو اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ بارہ دری ان لوگوں نے اپنے نام لکھا لی ہے۔ چلو ہم کہیں اور بیٹھ کر باتیں کریں"

انارکلی اپنی دونوں سہیلیوں کو لے کر چلنے لگی مروارید نے پھر طنز کیا۔

"لے جاؤ مگر ذرا سنبھال کے رکھنا۔ کہیں انہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔"

زعفران اور ستارہ مورچہ چھوڑ کے جانا نہیں چاہتی تھیں مگر انارکلی ان دونوں کو پکڑ کے دالان سے نکل گئی۔

اس وقت کسی کنیز کی آواز آئی۔

"کیوں بھئی کیسی رہی؟"

مگر کسی نے بھی اس بات پر توجہ نہ دی۔

انارکلی کے جانے کے بعد مروارید نے دلارام سے کہا۔

"باجی! یہ سب تمہاری کمزوری کا نتیجہ ہے۔"

"لو! اس میں میری کیا کمزوری ہے۔" دلارام ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "کیا ستارہ اور زعفران سے میں نے کہا تھا کہ وہ ایسی بدتمیزی سے سوال و جواب کریں۔"

مروارید نے دیکھا کہ انارکلی کے جانے کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے تو اس نے پھر

ایک شوشہ چھوڑا۔

''باجی! اب تو نقشہ ہی بدل گیا ہے۔''

''اور کیا'' عنبر نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ''پورا محل کا محل اس مردار کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔''

مروارید کب خاموش رہنے والی تھی۔ اس نے پھر بھس میں چنگاری پھینکی۔

''باجی دلارام! سچ پوچھو تو تم نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔''

''اور کیا'' عنبر نے بات فوراً پکڑ لی۔ ''میں کہتی ہوں یہ تمہیں چھٹی لینے کی کیا سوجھی تھی؟''

''چھٹی تو میں نے نہیں کی بیماری کی وجہ سے لی تھی۔'' دلارام نے ماتھے پر انگوٹھا ٹکا کے بتانا شروع کیا۔ ''مجھے کیا خبر تھی کہ ہفتہ بھر میں نقشہ ہی بدل جائے گا۔''

''نقشہ تو پہلے ہی دن بدل گیا تھا'' عنبر نے انکشاف کیا۔ ''رات کو جشن تھا۔ نادرہ نے میدان جب باجی دلارام سے خالی دیکھا تو جھٹ بن ٹھن کے جشن میں شامل ہوگئی۔ ایک تو اللہ ماری وہ پہلے ہی چاند کا ٹکڑا تھی اب جو اس نے سنگھار کیا تو پھر قیامت ہی آ گئی۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اس قیامت نے پھر اس قیامت کا گانا سنایا کہ ساری محفل لوٹ لی۔ جہاں پناہ کو کیا سوجھی۔ کہنے لگے تم نہ نادرہ ہو اور نہ شرف النساء۔ میرے خیال میں تم عین یمن کے انار کی کلی معلوم ہوتی ہو۔''

''پھر کیا تھا'' مروارید نے لقمہ دیا۔ ''اس کے گانے اور حاضر جوابی سے خوش ہو کر اپنا موتیوں کا ہار انعام میں اسے بخش دیا۔ اب تو پل بھر میں پورا محل انارکلی، انارکلی کے نام سے گونج اٹھا۔''

بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ پائیں باغ کی ڈیوڑھی میں سے ایک گرجدار آواز گونجی

''عنبر! مروارید! اری او ماہ پارہ! کہاں مرگئی ہو سب کی سب۔''

یہ کنیزوں کے داروغہ خواجہ سرا کافور کی پکار تھی جو ڈیوڑھی میں کھڑا غل مچا رہا تھا۔

دلا رام منہ بنا کے بولی۔

''چھوڑو بی کافور کو۔ یہ تو ایک گھڑی چین سے نہیں بیٹھتا۔ ہاں یہ بتاؤ کیا جشن میں ''صاحب عالم'' بھی موجود تھے؟''

''لو! وہ کیوں نہ ہوتے۔'' مروارید نے بتایا ''وہ تو جھوم جھوم کے انارکلی کو داد دے رہے تھے۔ اسی وقت بی کافور کی آواز پھر ابھری۔

''ارے اللہ ماریو! کہاں مر گئیں سب کی سب۔ اری کم بختو کیا کان چور لے گئے۔''

''بکنے دو بی کافور کو'' مروارید نے منہ بنایا۔ ''ہاں باجی دلا رام۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب بتاؤ دم خم باقی ہے یا انارکلی سے دب کے رہو گی؟''

''توبہ کرو۔ اس کل کی چھوکری سے دبوں گی کیا؟'' اور دلا رام نے زمین پر تھوک دیا۔

''پھر کیا کرو گی؟'' عنبر نے پوچھا۔

''ناگن کی دم پر کوئی پاؤں رکھ دے تو وہ کیا کرتی ہے؟''

اسی وقت کنیزوں کا داروغہ خواجہ سرا کافور پیر پٹختا آ گیا۔ سیاہ رنگت، لحیم شحیم، جھریوں بھرا چہرہ۔ سب کنیزیں خاموش ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

''اری مردارو! اللہ ماریو!'' کافور نے اپنی لن ترانی شروع کر دی۔ ''کانوں میں روئی ٹھونس کے بیٹھی تھیں۔ چھوٹے منہ سے جواب تک نہیں دیتیں۔ خدا کی پناہ۔ دوپہر ڈھل گئی۔ شام پڑ گئی۔ عصر کی اذان ہو گی۔ نہ حمام تیار کیے۔ نہ گلاب پاش بھرے۔ نہ پھول چنگیروں میں رکھے گئے۔ نہ حجرے سیر کے لیے سجے۔ نہ دین کی خبر نہ دنیا کی۔ دن بھر بیٹھی کھیل رہی ہیں۔ اے تم غارت ہو کم بختو جیسا تم نے مجھ بڑھیا کو ستایا ہے۔''

کنیزیں، خواجہ سرا کی پھٹکار پر منہ جھکائے اور مسکراتی ہوئی بھاگ نکلیں۔

دلارام نے چلتے چلتے عنبر کو خبردار کیا۔

''خیال رکھنا عنبر۔ آج کی بات کی خبر کسی کو نہ ہونا چاہیے۔''

''اطمینان رکھو۔ میں ایسی بچی نہیں'' عنبر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھی۔

خواجہ سرا کافور نے انہیں کانا پھوسی کرتے دیکھا تو وہیں سے چلایا۔

''یہ تم دونوں کیا مسکوٹ کر رہی ہو۔ سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے؟''

''سن لیا بابا سن لیا۔'' دلارام جھلا اٹھی۔

کافور کو کب برداشت ہوتی۔ وہ کڑک کے بولا۔

تم میں کیا سرخاب کے پر لگے ہیں جو سلیقے سے جواب بھی نہیں دیتیں۔ کیا اس بات پر پھولی ہو کہ ظل الٰہی کے حضور میں تمہیں...... کبھی...... باریابی حاصل تھی۔ اس دھوکے میں نہیں رہنا۔ ختم ہوگئی تمہاری ڈھائی پہر کی بادشاہت۔ اب تو ایک ہی لاٹھی سے ہانکی جاؤ گی۔''

خواجہ سرا کافور اور ان کنیزوں کی تو تو میں میں کا یہ روز کا دھندہ تھا۔ کنیزیں عام طور پر شاہی بیگمات کی منہ چڑھی تھیں۔ ادھر خواجہ کافور کو اپنے داروغہ ہونے کا زعم تھا۔ پس روز یہی چخ چخ اور تو تو میں میں کا بازار گرم ہوتا اور پھر آپ ہی آپ ٹھنڈا پڑ جاتا۔

یہ میدان ذرا ٹھنڈا پڑا تھا کہ انارکلی کی ماں آ گئی۔ سیدھی سادی، اللہ میاں کی گائے۔ محل کی شوخ و شنگ کنیزیں اس بھولی بھالی عورت کو اس وجہ سے نہ بناتیں کہ وہ اپنے طور طریقوں اور رکھ رکھاؤ سے کوئی خاندانی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کی سب سے پہلے نظر داروغہ کافور پر پڑی جو اپنے آپ میں اینٹھا جا رہا تھا۔

''کیا ہوا بی کافور'' انارکلی کی ماں نے اسے چھیڑا۔ ''یہ اپنے آپ میں کیوں اینٹھے جا رہے ہو؟'' بی کافور بھری بیٹھی تھیں۔ تڑخ کے بولیں۔

''سنیں تم نے اس قتالہ دلارام کی دھمکیاں۔ میں نے ذرا کام کو کہا تو کہنے لگی میں ظل

سجانی سے تیری شکایت کروں گی۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے کہا جا کہہ دے ایک بار نہیں ہزار بار شکایت کر۔ میں تیری بھبکیوں میں نہیں آتی۔ اے اللہ رکھے تیری انارکلی کا دم سلامت رہے۔ میں کیا اس کی دھونس میں آ جاؤں گی۔ ارے ہاں بیٹی کہاں ہے۔ صبح سے دکھائی نہیں دی۔ بیگمات بھی کئی بار پوچھ چکی ہیں۔''

''اے کیا کہوں بہن۔'' انارکلی کی ماں ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔ ''اس لڑکی نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ بار بار کہا جا بیٹی بیگموں کو سلام کر' ہنس بول۔ مگر وہ ہے کہ گم سم بیٹھی ہے۔ تم ہی کہو۔ کہیں محل سراؤں میں اس طرح گزر ہو سکتی ہے؟''

''اے بہن فکر کیوں کرتی ہو۔'' بی کافور انگلی نچا کر بولا۔ ''ابھی عمر ہی کیا ہے۔ دھیرے دھیرے سب سیکھ جائے گی۔ اگر بیگموں سے کتراتی ہے تو فکر کی ضرورت نہیں۔ ظل الٰہی کی خوشنودی حاصل ہو جائے تو سب کچھ ہے۔''

''مگر ان لگائی بجھائی کرنے والوں کو کون روکے۔ وہ تو تاک میں لگے رہتے ہیں۔'' انارکلی کی ماں نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

''بیٹی کو سمجھاؤ بہن'' کافور نے فوراً مشورہ دیا۔ ''کسی کو حضور عالی میں باریاب ہونے کا موقعہ ہی نہ دے۔ اللہ رکھے چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے میری انارکلی۔'' کافور کی زبان سے انارکلی کا لفظ نکلا تھا کہ سامنے سے انارکلی آتی دکھائی دی۔

''آ گئی میری چندا'' کافور نے لہک کے کہا۔

''کیا میرا ذکر ہو رہا تھا'' انارکلی نے ماں سے پوچھا۔

''میرا اور کون ہے جس کا ذکر کروں گی۔'' ماں نے بھرپور پیار سے جواب دیا۔ کتنی دیر سے میں اور بی کافور تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

انارکلی نے بی کافور کو مسکرا کر دیکھا۔ ''خیر تو ہے بی کافور۔ یہ میرا کیوں انتظار ہو رہا

تھا؟'' کافور چہک کے بولیں۔

''اے بیٹی تم نے سنیں اس حرافہ دلارام کی باتیں؟ تمہیں انارکلی کا خطاب کیا ملا۔ بس جلی جارہی ہے مری جارہی ہے۔ ابھی ابھی مجھ سے الجھ پڑی تھی کہنے لگی۔ تم کس انارکلی پر پھولی پھر رہی ہو۔ میں اب بھی جو چاہوں ظل الٰہی سے کرا سکتی ہوں۔ میں نے کہا لد گئے وہ دن اب تو ہماری انارکلی کا راج ہے۔''

انارکلی نے کوئی جواب نہ دیا بس انگوٹھے سے انگلیوں کے ناخن ملتی رہی۔

انارکلی کی ماں گھبرا گئی۔ پوچھا ''ایسی گم سم کیوں ہو؟ کس سوچ میں ہو بیٹی؟''

کافور کو بولنے کا موقع مل گیا۔ فوراً بولیں۔

''اے یونہی رات کی تکان ہوگی۔ جشن بھی تو بڑی دیر تک رہا رات۔ اچھا لو میں چلی۔ بڑا کام پڑا ہے۔ نہ جانے وہ اللہ ماریاں کیا کر رہی ہوں گی۔ ظل سبحانی نے بھی کیا خطاب سوچا انارکلی۔ واہ واہ واہ''

کافور ہنستے ہوئے چلا گیا تو ماں نے پوچھا۔

''دنیا کی تو انارکلی انارکلی کہتے زباں خشک ہوئی جارہی ہے اور تجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ جھوٹے منہ دو بول شکریے ہی کے کہہ دے۔ یہ آخر تجھے ہوا کیا ہے؟''

''کچھ بھی تو نہیں ماں۔'' انارکلی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''تمہیں تو بس وہم ہو گیا ہے۔ کبھی انسان کا ہنسنے بولنے کو جی نہیں ہوتا۔''

اس پر ماں کو بھی غصہ آ گیا۔ بولیں۔

''میں تو تمہیں یوں منہ پھلائے ساتھ لے کر بیگموں کے پاس جاتی نہیں۔ کتنی بار کہا کہ بیٹی جی نہیں ہوتا تو بھی دل پر جبر کر کے ذرا ہنس بول لے۔ دکھاوے کو بندہ کیا کچھ نہیں کرتا۔ اب سمجھ میں نہ آوے تو تو جان اور تیرا کام۔''

اور انارکلی کی ماں منہ پھلائے بڑبڑاتی چلی گئی۔ اسی وقت اس کی چھوٹی بہن ثریا کودتی اچھلتی اس کے پاس آ گئی اور آتے ہی بولی۔

''تم یہاں ہو نادرہ آپا۔ میں تو تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئی۔''

''خیریت تو ہے۔ مجھے کیوں ڈھونڈ رہی تھی؟''

''آج صاحب عالم ملے تھے۔'' ثریا نے انکشاف کیا۔

''تجھ سے ملے تھے؟''

''ہاں'' ثریا نے تصدیق کی۔ ''وہ دوپہر کو حرم میں آئے تھے۔ میں انہیں راستے میں مل گئی تو کہنے لگے تمہاری انارکلی نظر نہیں آئی کہاں ہے وہ آج۔ میں جواب دینے والی تھی کہ خود ہی کہنے لگے۔ ثریا وہ اتنی چپ چپ اور سب سے الگ کیوں رہتی ہے۔ پھر وہ میرے دونوں ہاتھ جوش سے پکڑے کہنے لگے ثریا کیا ان دنوں ان کی بھی میری طرح کی حالت ہو گئی ہے۔ میں نے بس ''ہاں'' کہہ دیا۔ یہ سننا تھا کہ ان کا چہرہ گلابی گلابی ہو گیا اور خوشی کے جوش میں انہوں نے میرا ماتھا چوم لیا۔''

''ہائے اللہ'' بے ساختہ انارکلی کے منہ سے نکل گیا۔ ''چوم لی تیری پیشانی''

اس کے ساتھ ہی انارکلی کو کیا سوجھی کہ اس نے ثریا کا منہ اونچا کر کے ٹھیک اس جگہ جہاں شہزادے نے ثریا کا ماتھا چوما تھا' اسی جگہ انارکلی نے منہ رکھ کے ایک چٹخارے دار بوسہ لیا اور پھر ثریا کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

جب ثریا اس کی بانہوں سے آزاد ہوئی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپا! تم میرا ماتھا چوم کے شرما کیوں گئیں؟''

مگر آپا انارکلی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۲)

شہزادہ سلیم اپنے محل کے برج مثمن میں بیٹھا راوی میں غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا ہے۔ اندر کی طرف زعفران اور ستارہ دف بجا بجا کر ناچ رہی ہیں مگر انہیں علم ہے کہ شہزادہ ان کی طرف متوجہ نہیں۔ آخر وہ ناچنا بند کر دیتی ہیں اور دونوں میں کانا پھوسی شروع ہو جاتی ہے۔

''پوچھ لے ہم لوگ چلے جائیں۔'' ستارہ سرگوشی کرتی ہے۔

''میں کہتی ہوں چپ چاپ نکل چلو۔ انہیں دریا کی سیر سے فرصت کہاں۔'' زعفران سرگوشی ہی میں جواب دیتی ہے۔

''اور مہارانی نے پوچھ لیا تو کیا جواب دیں گے؟''

''کہہ دیں گے کہ شہزادے بہادر کو لہروں کا ناچ دیکھنے سے فرصت نہیں۔ ہم کیا دیواروں کے آگے ناچتے''

''پوچھنے میں کیا ہرج ہے'' اور ستارہ شہزادے کی طرف بڑھی۔

ستارہ بہت بہت کر کے چلی تھی مگر اس کی بدنصیبی کہ ٹھوکر کھا گئی اور گر پڑی۔ سلیم نے پلٹ کے دیکھا اور پوچھا۔

''یہ کیا ہوا زعفران؟''

''حضور سے رخصت کی اجازت لینے آ رہی تھی کہ چبوترے سے ٹھوکر کھا گئی۔''

سلیم اسے اٹھانے آگے بڑھا لیکن وہ خود اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ دونوں رخصت ہو گئیں۔

شہزادہ سست قدموں سے برج میں چلا جاتا ہے اور جھروکے سے ٹیک لگا کر ملاح کے گیت سننے لگتا ہے۔ ملاح گا رہا ہے۔

''جب وقت کی ندی بہتے بہتے سست پڑ جاتی ہے اور امید ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟''

''جا' شفق زار لہروں پر گاتا چلا جا اور خوش ہو کہ تو شہزادہ نہیں ورنہ سنگ مرمر کی چھتوں کے نیچے اور بھاری بھاری پردوں کے اندر تیرے گیت بھی دبی ہوئی آہیں ہوتے۔''

اس وقت چبوترے کے دروازے سے دو خواجہ سرا داخل ہوتے ہیں۔ ایک نے روشن مشعلیں اور دوسرے نے ایک چوکی اٹھا رکھی ہے۔ اندر آ کر وہ تعظیم بجا لاتے ہیں پھر ایک فانوس کے نیچے چوکی رکھ دیتا ہے دوسرا چڑھ کر مشعل سے فانوس روشن کرتا ہے پھر وہ دونوں چپ چاپ بائیں دروازے سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

اس وقت بختیار چبوترے کے بائیں دروازے سے داخل ہوتا ہے۔ سلیم کے ساتھ کھیلا ہوا وہ اس قدر بے تکلف دوست ہے کہ اسے داخل ہونے کے لیے اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بختیار خوش طبع نوجوان ہے جس کی آنکھوں میں خلوص چمکتا نظر آتا ہے۔ پھر بختیار جیب سے رومال نکال کر اور اسے مسند پر رکھ کے بڑے اہتمام سے سوچتا ہے رومال میں انار کے پھول اور کلیاں ہیں۔ وہ ایک کلی اٹھا کر بڑے تکلف سے سلیم کو دیتا ہے۔

شہزادہ سلیم دوست کے ہاتھ سے کلی لے کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

''کتنا حسن اور رعنائی ہے اس کلی میں۔ رنگ' بو اور نزاکت۔ لیکن بختیار انارکلی۔ اس سے ان کا کیا تعلق۔ وہ تو فردوس کا ایک خواب ہے۔ شباب کی آنکھوں میں قوس قزح اور سچ مچ کبھی کبھی تنہائی میں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف میرا تصور ہے۔ اسے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسے ایک خواب کو میں نے دل کے سنگھاسن پر بٹھا لیا ہے اور اسے پوج رہا ہوں۔''

اسی وقت دلا رام چبوترے کے دائیں دروازے سے داخل ہو کر شہزادے کو اطلاع

دیتی ہے کہ ظل الٰہی حرم سرا سے باہر تشریف لا رہے ہیں اور انہوں نے اطلاع بھیجی ہے کہ وہ ولی عہد بہادر کی طرف بھی تشریف لائیں گے- سلیم اور بختیار کے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں- شہنشاہ اکبر' حکیم ہمام اور چند خواجہ سرا داخل ہوتے ہیں- خواجہ سرا دروازے کے قریب آ کر رک جاتے ہیں- اکبر' شہزادہ سلیم اور حکیم ہمام آگے بڑھ آتے ہیں- بختیار' شہنشاہ کو مجرا پیش کرتا ہے-

تاجدار ہند' شہنشاہ اکبر ایک گھٹے ہوئے جسم کا خوش شکل اور میانہ قد شخص ہے- پیشانی اور رخساروں کی شکنیں گو دیکھنے والوں کے دل میں خوش اخلاقی کا اعتماد پیدا کرتی ہیں لیکن دنیا کے خیال میں رہنے کے باعث خواب ناک آنکھوں میں کچھ ایسی قوت ہے جو اس امر سے قطع نظر کہ وہ شہنشاہ ہند ہے' ہر شخص کو محتاط رہنے اور نظریں جھکا لینے پر مجبور کر دیتی ہے- گردن کی باوقار حرکت سے ظاہر ہے کہ عالی ہمت شخص ہے- مضبوط دہانہ کہہ رہا ہے کہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹوں کو خاطر میں نہیں لا سکتا- حرکات میں مستعدی ہے- رفتار میں ایسا انداز گویا زمین کی تحقیر کر رہا ہے- اس وقت وہ سلیم سے ناخوش نظر آتا ہے لیکن سلیم سے اس کی غیر معمولی محبت اس قدر مسلم ہے کہ محرمانِ حرم بخوبی جانتے ہیں کہ یہ کبیدگی پدرانہ فہمائش کو موثر بنانے کے لیے سوچ سمجھ کر اختیار کی گئی ہے اور اس غیظ و غضب سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں جو کبھی کبھار اکبر کو بے پناہ غصیلا بنا دیا کرتا ہے-

شہنشاہ اکبر' شہزادے کو مضمحل دیکھ کر پوچھتا ہے کہ آیا کہ وہ علیل ہے مگر شہزادہ نہایت ادب سے بادشاہ کو یقین دلاتا ہے کہ وہ بالکل صحت مند اور تندرست ہے- اس وقت تاجدار ہند شکوہ کرتا ہے-

''اگر تم علیل نہیں تو پھر یہ کیا ہے شیخو! ہر ایک تمہاری بے توجہی کا شاکی ہے- نہ تمہیں اپنی تعلیم کا خیال ہے' نہ ضروری مشاغل کا- سواری کو تم نہیں نکلتے- شکار کو تم نہیں جاتے- تم

دستر خوان تک پر نظر نہیں آتے۔ آخر کیوں کیا تم اپنے باپ کے سامنے حاضر ہونے میں اپنی توہین سمجھتے ہو یا دیکھنا چاہتے ہو کہ اگر تم اس کے پاس نہ جاؤ تو وہ کب تک بے خبر نہیں ہوتا۔ تم نے دیکھ لیا۔ تم خوش ہو اب؟"

شہزادہ سلیم معذرت پیش کرتا ہے۔ معافی چاہتا ہے یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں شرمندگی کے آنسو چھلک آتے ہیں مگر بادشاہ پر ذرا اثر نہیں ہوتا اور وہ بڑے اطمینان اور تحمل سے سلیم کو سمجھاتا ہے کہ بادشاہ تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔ وہ مغل شہزادوں کو ہوس ملک گیری میں گرفتار تو دیکھ سکتا ہے مگر یہ آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ تو چاہے تو ان آنسوؤں کی قیمت اپنی ماں سے وصول کر سکتا ہے۔

شہزادہ پژمردہ قدموں سے حرم کی طرف چلتا ہے۔ بختیار سلیم کو سمجھاتا ہے کہ شہنشاہ ہند اس کے باپ ہیں اور وہ اس کے لیے متحدہ ہندوستان کی سلطنت تیار کر رہے ہیں اس لیے وہ تمہیں ایک خاص رنگ میں دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے اسے ان کی بات کا برا نہ ماننا چاہیے۔

مگر شہزادہ اپنی دھن میں مست ہے۔ وہ بختیار کو بتاتا ہے کہ انارکلی چاندنی راتوں میں باغ میں جاتی ہے اور وہ آج رات اس سے ملنا چاہتا ہے۔ بختیار اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر سلیم اپنی ضد پر اڑا رہتا ہے۔

ان دونوں کی یہ گفتگو دلارام سن لیتی ہے جو وہاں ایک کھمبے کے پیچھے دیر سے کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ پھر اس رات شہزادہ انارکلی سے ملتا ہے۔ سلیم اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہتا ہے کہ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کے سینے سے چمٹے ہوئے ہوں تو پھر کوئی خوف نہیں۔ آسمان ہمیں کھینچ لے اور ہم نئی روشنیوں میں اٹھتے چلے جائیں۔ زمین ہمارے پیروں کے نیچے سے سرک جائے اور ہم نامعلوم اندھیروں میں گرتے چلے جائیں۔ تمہارے بازو ڈھیلے نہ پڑیں یہ تو سب کچھ کتنا خوب اور خوب تر ہوگا۔

اور یوں سلیم کی آغوش تنگ ہوتی جارہی ہے- اس وقت کہیں کھٹکا ہوتا ہے- انارکلی سلیم سے بھاگ جانے کو کہتی ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے- پھر انارکلی کی بہت منت اور خوشامد کے بعد شہزادہ وہاں سے ہٹ کر جھاڑیوں کی طرف چلا جاتا ہے- اسی وقت آڑ میں چھپی ہوئی دلارام انارکلی کے سامنے نمودار ہوتی ہے- اسے دیکھ کر انارکلی کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں- چھپا ہوا سلیم انارکلی کی بے بسی دیکھ کر فوراً سامنے آجاتا ہے اور دلارام کو دھونس دیتا ہے کہ اگر اس نے کسی سے اس بات کا چرچا کیا تو اس کے لیے اچھا نہ ہوگا- یہاں دلارام گھبرا کر شہزادے سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ اس راز کو ہمیشہ راز رکھے گی-

(۳)

تاجدار ہند اکبر اعظم قلعہ لاہور میں ایک مسند پر آنکھیں بند کیے اور پیشانی پر الٹا ہاتھ رکھے چپ چاپ لیٹا ہے- مہارانی پاس بیٹھی ہے- سامنے کنیزیں رقص کر رہی ہیں- اکبر ایک دو بار آنکھیں کھول کر کنیزوں کی طرف دیکھتا ہے گویا ان کا رقص اسے تکلیف پہنچا رہا ہے- آخر وہ ہاتھ اٹھاتا ہے اور کنیزیں جہاں ہیں وہیں ساکت ہو کر رہ جاتی ہیں-

مہارانی گھبرا کر اکبر کو سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے-

''آپ اس قدر محنت کیوں کرتے ہیں؟ مہابلی!''

''میں شہنشاہ ہوں مہارانی'' اکبر جواب دیتا ہے-''میں بہت تھک گیا ہوں اور اکیلا ہوں''

''نہیں مہاراج! آپ اکیلے نہیں-'' مہارانی انکار میں سر ہلاتی ہے- میرا شیخو آپ کا موزوں ترین جانشیں ہوگا-''

اکبر کو غصہ آجاتا ہے اور وہ تند لہجے میں کہتا ہے-

''اگر اس کا یقین ہو جاتا تو میں اپنے دماغ کا آخری ذرہ تک خواب میں تبدیل کر دیتا لیکن وہ میری تمام امیدوں سے اس قدر بے اعتنا ہے' اتنا بے نیاز ہے کہ میں...... لیکن میرا

سب کچھ وہی ہے- میں نہیں کہہ سکتا مجھے کتنا عزیز ہے- کاش وہ میرے خوابوں کو سمجھے- ان پر ایمان لے آئے- اسے معلوم ہو جائے کہ اس کے فکرمند باپ نے اس کی ذات سے کیا کیا ارمان وابستہ کر رکھے ہیں اور میں اپنی موت کے بعد اس میں زندہ رہنے کا کتنا مشتاق ہوں...... لیکن...... لیکن ابھی کیا معلوم"

"ابھی وہ بچہ ہی تو ہے-" مہارانی لقمہ دیتی ہے-

اکبر بگڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میری محبت دیوانی نہیں کہ اس کے سن و سال بھول جائے- ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی اسے یقین دلاؤ کہ فی الحال وہ ایک بے پرواہ نوجوان کے سوا اور کچھ نہیں- اسے بتاؤ کہ اکبر اس عمر میں سلطنت دہلی کا بوجھ اپنے کم سن کاندھوں پر اٹھا چکا تھا جس نے دنیا کی بے باک نظروں کو جھکنا سکھا دیا تھا اور جو اس عمر میں مفتوحہ ہند کو متحد کرنے کے دشوار مسائل میں منہمک تھا-"

پھر اکبر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور جانا چاہتا ہے- مہارانی اسے خوشامد کر کے روک لیتی ہے- اس وقت اکبر فرمائش کرتا ہے کہ انارکلی کو بلایا جائے جو اس کے دماغ کو ٹھنڈک پہنچا سکے- مہارانی اکبر کو بتاتی ہے کہ انارکلی آج کل بیمار ہے- اکبر پریشان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ انارکلی بیمار ہے تو "جشن نوروز" کا انتظام کون کرے گا-

مہارانی اکبر کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتی ہے کہ شیش محل میں جشن نوروز کا پورا انتظام دلارام کے سپرد ہوگا اور انارکلی صرف رقص کا انتظام کرے گی- دلارام کا نام سن کر اکبر فوراً مہارانی سے کہتا ہے کہ دلارام کو فوراً حاضر کیا جائے کہ وہ اپنے گیت سے ہمارے دماغ کو تازگی بخشے-

اکبر کا حکم ہوتے ہی خواجہ سرا بھاگ کے دلارام کے پاس جاتا ہے اور اسے ساتھ لے کر اکبر کے سامنے پیش کرتا ہے- مہارانی دلارام سے کہتی ہے کہ جشن نوروز کا انتظام اس کے سپرد کیا گیا ہے- کیا وہ اس ذمہ داری کو پوری طرح نباہ سکے گی؟ دلارام بتاتی ہے کہ اس نے

پہلے بھی کئی جشنوں کا انتظام کیا ہے اور وہ اس ذمہ داری کو پوری طرح نبا ہے گی اور حاضرین کو کسی قسم کی شکایت نہیں ہوگی- پھر اکبر دلارام سے فرمائش کرتا ہے کہ پہلے وہ اسے ایک گیت سنائے- سیدھا سادا اور میٹھا گیت مگر آواز دھیمی اور نرم- گرم اور زخمی دماغ کے لیے ٹھنڈا مرہم چاہیے- رقص ہلکا پھلکا- گھنگھروں کا شور نہ ہو- بہت چکر نہ ہوں' پاؤں آہستہ آہستہ زمین پر پڑیں جیسے پھول زمین پر برس رہے ہوں یا برف کے گالے زمین پر اتر رہے ہوں لیکن خمار نہ ہو- نیند نہ آئے کیونکہ اسے پھر مصروف ہونا ہے-

دلارام رقص شروع کرتی ہے لیکن رقص کے دوران اس کے دماغ میں جشن نوروز گھومتا رہتا ہے اس کی وجہ سے اس کے رقص میں نقص پیدا ہو جاتا ہے-

اکبر منہ بناتا ہوا کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے- '' کچھ نہیں- کسی کو کچھ نہیں آتا...... اور کوئی نہیں جانتا...... اور...... اور انارکلی بیمار ہے-''

اکبر چلتا ہے- پیچھے پیچھے مہارانی ہے-

دلارام جیسے سوچ میں گم کھڑی ہے- اسے خیال آتا ہے جشن مین انارکلی ہوگی- سلیم ہوگا اور اکبر بھی...... کاش اگر اکبر دیکھ سکتا...... کاش اگر میں اکبر کو اس کی آنکھوں سے دکھا سکتی- آہ! پر یہ ضرور ہوگا اور جشن ہی کے روز ہوگا...... وہی دو تارے...... گر ایک دہکتا اور جگمگاتا...... اور دوسرا ٹوٹ کر بجھا ہوا...... اور کون جانے-

دلارام آہستہ سے زمین پر بیٹھ جاتی ہے اور سر جھکا کر ایک گہری سوچ میں کھو جاتی ہے

(۴)

شیش محل' قلعہ لاہور میں جشن نوروز کی محفل کا آغاز ہو گیا ہے-

جشن نوروز کی تقریب نہایت شان و شوکت سے برپا ہوئی ہے- اس دن یوں تو تمام شہر اور قلعہ جاہ و جلال مغلیہ کا آئینہ دار بنا ہوا ہے جس طرف نظر اٹھتی ہے بہار کے خود فراموش

عیش کی آغوش میں متوالے نظر آتے ہیں لیکن حرم شاہی میں تحمل اور شوکت کے ساتھ رونق اور چہل پہل کا ایسا دلفریب ہنگامہ ہے جس کی تابانی اور درخشانی آنکھیں خیرہ کیے دیتی ہے۔

درودیوار میں زربفت اور کم خواب نے آگ سی لگا رکھی ہے۔ ایران اور ترکستان کے رنگارنگ قالینوں نے زمین کو گلزار بنا دیا ہے۔ دروازوں پر چین اور لاچین کے خوش رنگ پردے کسی طلسم کی رازداری کرتے نظر آتے ہیں۔ جھاڑ وفانوس قمقموں اور قندیلوں سے وسیع ایوانوں کی چھتیں ابنائے شعر کا آسمان نظر آ رہی ہیں۔

حرم سرا کے وسیع صحن میں دن کا وہ ہنگامہ تو نہیں رہا جو قلادان اور ریتوں رسموں کے وقت برپا تھا تاہم گہما گہمی کا اب بھی عجب عالم ہے نادرہ کار آتش بازوں کی ہنرمندی کے نئے نئے نمونے جمع ہیں۔ شتابہ دکھائے ہیں صرف ظل الٰہی کے باہر آنے کا انتظار ہے۔ مقربین باری باری ظل الٰہی کے برآمد ہونے کی خبریں لا رہے ہیں۔ جو کوئی اندر سے آتا ہے اس کے گرد ایک ہجوم جمع ہو جاتا ہے۔ زہرہ جمال بیگمیں اور شہزادیاں ہلکے ہلکے رنگوں کی خوش وضع شلواروں پر جھلمل جھلمل پشوازیں پہنے بیش قیمت جواہرات سجائے کوئی شبنم کا دوپٹہ اوڑھے، کوئی سر پر قلغی دار بانکی پگڑی رکھے باغ ارم کی تتلیاں معلوم ہو رہی ہیں۔ بہت سی انتظار میں بے قرار کھڑی ہیں۔ جو تھک چکی ہیں وہ بیٹھ گئی ہیں۔ کوئی ٹولی آپس میں ہاتھ پکڑے ٹھک ٹھک چلی آ رہی ہے۔ کوئی شوخ وچنچل کسی ہجوم میں بیٹھے قہقہے لگا رہی ہے۔ کہیں پہیلیاں مکرانیاں کہی جا رہی ہیں کوئی بیٹھی اڑتی اڑتی خبریں اور لطیفے سنا رہی ہے۔ کہیں سوانگ بھرا جا رہا ہے اور دیکھنے والیوں کا ٹھٹھہ لگ گیا ہے۔ کسی جگہ ناچ رنگ کی محفل برپا ہے۔ ڈھولک، طبلہ، ستار، طنبورہ اور طبلہ کھڑک رہا ہے۔ کہیں شام کی ریتیں اور رسمیں ادا ہو رہی ہیں، نیاز دی جا رہی ہے۔ حصے تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ آؤ لے جاؤ کا غل مچ رہا ہے۔ جشنیں، ترکنیاں، اور قلمانیاں اپنے شوخ رنگ لباسوں کی وجہ سے تمیز کی جا سکتی ہیں۔ کنیزیں جلدی

جلدی بھاگ دوڑ میں لگی ہیں- خواجہ سرا ادھر سے ادھر بھاگے دوڑے پھر رہے ہیں- کوئی اسے بلا رہا ہے- کوئی اسے پکار رہا ہے- کوئی خوان اٹھائے لیے جا رہا ہے- کوئی پان الائچی بانٹ رہا ہے- کوئی مہمان بیگمات کو شربت پلا رہا ہے- اندر بچوں اور بچے والیوں نے غل مچا رکھا ہے- باہر شادیانوں نے تمام قلعہ سر پر اٹھا رکھا ہے-

لیکن اس تمام ہنگامے، شور وغل اور چیخ وپکار کی آوازیں اندر شیش محل کے ایوان خاص تک نہیں پہنچتیں- وہاں اگر کوئی آواز ہے تو سرنگیوں اور شہنائیوں کی جو اتنے محتاط فاصلے پر بجائی جا رہی ہیں کہ ان کے نشاط بخش نغمے خوش آئند لوری کی طرح ایوانوں میں پہنچ رہے ہیں جگہ جگہ نئی وضع کے یک شاخوں، دوشاخوں اور فانوسوں میں لمبی لمبی، کوئی سیدھی، کوئی بل کھاتی ہوئی سفید اور رنگین کافوری شمعیں روشن ہیں- زریں اور سیمیں عودانوں میں عنبر اور روح افزا کے نکہت بیز بادل اٹھ رہے ہیں اور آئینوں میں روشنیاں منعکس ہونے سے جو چکا چوند پیدا ہو رہی ہے اس میں مل جل کر تمام ایوان پر عالم خواب کی کیفیت طاری کر رہے ہیں-

تاجدار ہند جلال الدین اکبر ایوان کے پرلے کونے پر ایک مرصع تخت پر جو تین سیڑھیاں اونچا ہے، زریں تکیوں کے سہارے نیم دراز ہے- ماتھے پر تلک ہے- لباس سادہ مگر انمول جواہرات سے آراستہ، دوسری سمت سلیم پر تکلف لباس پہنے پوری سج دھج کے ساتھ اور ایک نوشگفتہ پھول کے مانند ایک نسبتاً نیچے تخت پر دوزانو بیٹھا ہے- اس کے بائیں ہاتھ پر ایک لمبے سے تخت پر مالائیں، دوپٹے، دوشالے اور دوسرے بیش قیمت تحفے سلیقے سے چنے ہوئے ہیں- مہارانی، اکبر کے دائیں ہاتھ ایک اور تخت پر براجمان ہے- ادھر ادھر بیگمات اور شہزادیاں چوکیوں اور فرش پر مودب بیٹھی ہیں- ان کے پیچھے ترکنیاں اور قلمانیاں سونے اور چاندی کے عصا ہاتھ میں لے کر بت بنی کھڑی ہیں-

شہنشاہ اکبر، ولی عہد شہزادہ سلیم سے شطرنج کھیلنے میں مصروف ہے- ایوان کے فرش پر

بساط بچھی ہے جس پر نوجوان اور حسین کنیزیں مہرے بن کر کھڑی ہوئی ہیں اور اپنے سر کے لباس سے شناخت کی جا سکتی ہیں۔ جو کنیز جس کا مہرہ بنی ہے اس پر نظر جمائے اس کے اشارے کی منتظر ہے۔

جو پٹ چکی ہیں وہ بساط کے کنارے خاموش بیٹھی ہیں۔ اکبر کے پیچھے دلا رام مہتمم کی حیثیت سے کھڑی ہے لیکن اس کی نظریں کہہ رہی ہیں کہ اس کا دماغ اس کھیل سے زیادہ کسی اور اہم کھیل کی چالیں سوچنے میں مشغول ہے۔

اس وقت دلا رام کی ساتھی مروارید اس کے بالکل قریب آ کر سرگوشی کرتی ہے۔

''کیا آپ نے مجھے طلب کیا تھا؟''

دلا رام ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہتی ہے۔

''دیکھو میرے کمرے میں جاؤ۔ طاق میں ایک شیشی رکھی ہے وہ لے آؤ۔''

مروارید سر ہلا کر چلتی ہے اور دلا رام مزید تاکید کرتی ہے۔

''خیال رکھنا۔ کوئی تمہیں یا شیشی کو دیکھنے نہ پائے۔''

مروارید پھر چلنے لگتی ہے تو اس وقت دلا رام اسے دوبارہ روک کر تاکید کرتی ہے۔

''کان کھول کر سن جب انارکلی رقص میں تھک کر پانی مانگے تو اس شیشی کو اس کے گلاس میں الٹ دینا۔'' مروارید نے پھر سر ہلایا اور آگے بڑھ گئی۔

خیال رہے کہ شہزادہ سلیم اور دلا رام میں میں ضرورتاً یا مصلحتاً سمجھوتہ ہو گیا ہے اور چالاک اور شاطر دلا رام آج انارکلی سے انتقام لینے پر پوری طرح تیار ہو کر آئی ہے۔

دوسری طرف شاہی جوڑا یعنی اکبر اور ہندو مہارانی (جہانگیر کی ماں) آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ دلا رام ان کی پشت پر کھڑی ہے۔

اکبر ادھر ادھر دیکھ کر رانی سے پوچھتا ہے۔

''شیخو کہاں ہے؟''

رانی کے جواب دینے سے پہلے ہی سلیم اپنے تخت پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

''میں یہاں ہوں ظل الٰہی۔''

''اتنی دور کیوں؟'' اکبر سوال کرتا ہے۔

سلیم کے جواب سے پہلے ہی دلارام بول پڑتی ہے۔

''صاحب عالم علیل ہیں اس لیے کنیز نے علیحدہ جگہ رکھی تا کہ جب چاہیں باہر آ جا سکیں۔'' اکبر مسکراتا ہے۔

سلیم اشارہ سے دلارام کو بلا کر آہستہ سے پوچھتا ہے۔

''انارکلی کہاں ہے؟''

دلارام اشارے سے بتاتی ہے۔''

انارکلی مورنی کا رقص پیش کرتی ہے جو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ اکبر تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''یہ سحر تو نے کہاں سے سیکھا۔ اس میں حقیقت کا انکشاف اور فن کا کمال۔''

اس وقت انارکلی جھک کے اکبر کے دامن کو بوسہ دیتی ہے اور اکبر بیش قیمت موتیوں کی مالا اپنے گلے سے اتار کر انارکلی کے گلے میں ڈال دیتا ہے۔ انارکلی ہار پہن کر سیدھے ہوتے ہوئے پانی طلب کرتی ہے۔ مروارید فوراً پانی کا گلاس انارکلی کو پیش کرتی ہے۔ گلاس میں دلارام کا دیا ہوا عرق پہلے ہی ڈال دیا گیا ہے۔ پس انارکلی بے دھڑک پانی پی لیتی ہے۔

دلارام آہستہ سے عنبر سے کہتی ہے۔

''عنبر وقت آ گیا ہے۔ صاحب عالم اوٹ کے خیال سے بے فکر ہیں مگر ان کا عکس آئینے میں صاف صاف پڑ سکے۔''

اس وقت انارکلی احتجاج کرتی ہے۔

''مروارید! پانی میں شراب کی بوتھی۔ یہ عرق کیسا تھا؟''

''مفرح'' اور مروارید مسکراتی ہے۔

''ہم غزل سننا پسند کریں گے۔'' اکبر فرمائش کرتا ہے۔

انارکلی غزل شروع کرتی ہے۔

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ

در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ

انارکلی فیضی کی یہ غزل شروع کرتی ہے مگر اس وقت تک وہ نشہ میں چور ہو چکی تھی۔ یہ سب عیاری اور مکاری دلارام کی تھی۔ دلارام نے ایک وقت کہا تھا کہ جب ناگن کی دم پر پاؤں رکھ دیا جائے تو وہ بے قابو ہو کر پیر رکھنے والے پر شدید حملہ کرتی ہے۔ چنانچہ جب انارکلی نے صاحب عالم (شہزادہ سلیم) کو دلارام سے چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا تو دلارام' انارکلی کے حق میں ناگن بن کر سامنے آئی اور اس نے آخر کار ایک زبردست چال چلی۔

دلارام کی چال یہ تھی کہ چونکہ اسے بادشاہ کے جشن نوروز کا مہتمم بنا دیا گیا تھا اس لیے اس کی مسکان نے سلیم کو یہ فریب دیا کہ اس نے رقص کی محفل میں اس کا تخت ایسی جگہ بچھوایا یا لگوایا ہے جہاں سے وہ ناچتی گاتی انارکلی کو دیکھ بھی سکے گا اور اسے اشارے بھی کر سکے گا یعنی اگر شہزادہ' انارکلی سے اشاروں کنایوں میں گفتگو کرے گا تو اس کی نشست ایسی جگہ تھی جہاں سے وہ بادشاہ (اکبر) کو نظر نہ آتا تھا۔

بظاہر تو دلارام نے شہزادے کو یہی بتایا تھا اور اسے کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اشاروں کنایوں میں انارکلی سے گفتگو کر سکتا ہے مگر اس نے نہایت عیاری سے رقص گاہ میں جلی آئینوں کو اس انداز سے لگوایا اور رکھوایا تھا جس میں انارکلی کی پوری پوری حرکات

اور سکنات نظر آتی تھیں مگر بظاہر وہ اکبر سے پوشیدہ رہتی تھیں۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ دلا رام نے ہر آئینے کے سامنے ایک اور آئینہ اس زاویے سے لگوایا تھا جس میں انارکلی کی حرکات و سکنات پہلے آئینہ میں آنے کے بعد اس دوسرے آئینے میں منتقل ہو جاتی تھیں پھر اس دوسرے آئینے کے ساتھ اس نے ایک تیسرا آئینہ لگوایا تھا جس میں دوسرے آئینے کی تصویر اس تیسرے آئینے میں منتقل ہو جاتی تھی۔ اس طرح شاطر اور چالاک دلا رام نے آگے پیچھے ترتیب اور اس حکمت سے آئینے رکھوائے یا لگوائے تھے کہ آخر پہلے آئینے کی تصویر، دوسرے آئینوں سے گزر کر اس آئینے میں پہنچ جائے جو تاجدار ہند اکبر اعظم کے سامنے ایک طرف رکھا گیا تھا۔

اسی طرح شہزادہ سلیم کا تخت بھی ایسی جگہ دلا رام نے رکھوایا تھا جو بظاہر بادشاہ کو نظر نہ آتا تھا مگر اس کا عکس دوسرے آئینوں میں ہوتا ہوا اکبر تک پہنچ جاتا تھا۔ اس طرح انارکلی کا ہر انداز رقص اور شہزادہ سلیم کے انارکلی کو تمام اشارے اور کنایے آئینوں کی معرفت بادشاہ تک سیدھے پہنچ رہے تھے۔ یہ دلا رام کے دماغ کی اختراع تھی اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئی تھی۔

یہ انتظام کرنے اور رقص شروع ہونے سے پہلے ہی اکبر کے دائیں ہاتھ جا کھڑی ہوئی تھی اور جب انارکلی نے غزل کا مطلع پڑھا۔

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ

تو اکبر نے سامنے کی طرف انارکلی کو دیکھا مگر شہزادہ اسے نظر نہ آ رہا تھا۔ پس انارکلی نے مصرعہ پڑھنے کے ساتھ ہی اپنی طرف اور پھر شہزادے کی طرف صاف طور پر اشارہ کیا مگر جب اکبر کے ایک پہلو میں کھڑی ہوئی دلا رام نے اس کی توجہ اس آئینے کی طرف دلائی جس میں انارکلی اور شہزادہ سلیم دونوں نظر آ رہے تھے تو بادشاہ نے صاف طور پر یہ دیکھا کہ انارکلی ہر

مصرعہ پر پہلے اپنی طرف پھر شہزادے کی طرف صاف طور پر اشارے کرتی دکھائی دی اور یہ دیکھتے ہی اکبر کا دماغ گھومنا شروع ہو گیا۔

اس طرف انارکلی شراب کے نشے میں چور شہزادے کو صاف اشارے کر رہی تھی اور شہزادہ یہ سوچ کر کہ وہ بادشاہ کو نظر نہیں آ رہا ہے، خود بھی انارکلی کو صاف صاف اشارے کر رہا تھا اور ان دونوں کے اشارے مختلف آئینوں سے منعکس ہو کر پوری طرح اکبر کی نظروں تک پہنچ رہے تھے۔

ایک بار تو انارکلی نے غزل کے مطلع کے پہلے مصرعہ یعنی

''اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستۂ''

پر شہزادے سلیم کو ایک ایسا اشارہ کیا کہ پوری محفل مسکرا دی۔ اس کے ساتھ ہی دلا رام نے شہنشاہ اکبر کے سامنے نہایت ادب سے سر جھکا کے عرض کیا۔

''خداوند نعمت! بائیں جانب کے آئینے میں ملاحظہ فرمایئے کہ انارکلی کس بے ہودگی سے شہزادے سلیم کو دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔''

اکبر نے دلا رام کے بتانے پر بائیں جانب کا آئینہ دیکھا تو غصے سے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ اس وقت دلا رام نے اس کی لگی میں اور آگ لگائی۔ اس نے بڑی مکاری سے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''عالی جاہ! میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ انارکلی اس شاہی محفل رقص و سرود میں اس قدر عریاں اور فحش اشاروں سے شہزادہ کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی جرات کر سکتی ہے۔''

اس کے فوراً بعد دلا رام نے کہا۔

''جہاں پناہ! اب دائیں جانب کے آئینے پر نظریں دوڑائیں وہاں ہمارے شہزادے بہادر کو کیا سوجھی ہے کہ وہ ''رعب شاہی'' کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی بے ہودہ اور

بازاری اشاروں سے انارکلی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آ رہے ہیں''

اکبر پر پہلے ہی غصہ سوار ہو گیا تھا دلا رام کے بتائے ہوئے منظر کو دیکھ کر تو اس کے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی- وہ غصے میں اس قدر بھنایا کہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا- اکبر کے کھڑے ہوتے ہی اس کے ساتھ پوری محفل کھڑی ہو گئی-

اکبر نے پورے جاہ وجلال کے ساتھ نہایت کرخت آواز میں پکارا-

''کافور!!!''

اور کنیزوں کا داروغہ ''ملک کافور'' ظل سبحانی کہتا ہوں بھاگ کر اکبر کے سامنے پہنچا اور جھک کر تعظیم بجالایا-

اکبر انارکلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوری آواز سے گرجا-

''اس بے باک عورت کو پکڑ کر لے جاؤ اور زنداں میں ڈال دو-''

خواجہ سرا ملک کافور نے فوراً آگے بڑھ کر انارکلی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کی طرف کھینچا-

انارکلی گھبرا کر چیختی ہے-

''مہابلی!......مہابلی!!''

یہ کہتے ہوئے انارکلی اکبر کی طرف دوڑتی ہے مگر تخت سے ٹکرا کر گرتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے- انارکلی کی بہن ''ثریا'' دوڑ کے بہن سے چمٹ جاتی ہے-

پھر انارکلی کی ماں سینہ پکڑے آگے آتی ہے اور کہتی ہے-

''ظل الٰہی! خدا کا واسطہ''

اکبر ''خاموش بڑھیا'' کہتے ہوئے اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے-

شہزادہ سلیم اس منظر سے اس قدر گھبراتا ہے کہ دوڑ کے تخت کے پاس پہنچتا ہے اور

رونے کی آواز میں کہتا ہے۔

"ظلِ الٰہی......ابا جان......رحم"

"ننگ خاندان!" کہہ کر اکبر بیٹے کو ایک طرف دھکہ دے دیتا ہے۔

رانی بڑھ کے آتی ہے اور سلیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے۔

"مہاراج!"

"خبردار......" اکبر مہارانی کو ڈانٹ دیتا ہے۔

دلارام تخت کی پشت پر کھڑی ہے۔ وہ مکارہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو جاتی ہے اور دل ہی دل میں بے حد مسرور ہے۔

یہ تھا انتقام اس ناگن کا جس کی دم پر انارکلی اور سلیم نے پیر رکھا تھا۔

(۵)

زنداں کے دروازوں کے دونوں طرف حبشی خواجہ سرا ننگی تلواریں لیے اور بت بنے کھڑے ہیں۔ داروغۂ زنداں دو حبشی غلاموں کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور زنداں کا دروازہ کھولتا ہے۔

دروازہ کھلتے ہی انارکلی کی چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"سلیم! شہزادے سلیم!"

داروغہ اور دونوں غلام انارکلی کو زنداں سے نکال کر باہر لاتے ہیں۔ انارکلی کی آنکھیں پھٹی پھٹی ہیں، رنگت زرد ہے۔

اس وقت دونوں غلام زنجیر میں بندھی انارکلی کو کھینچتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ انارکلی خاموشی سے زنداں سے باہر آتی ہے۔ دونوں شمشیر بردار غلام انارکلی کے دائیں بائیں چلنے لگتے ہیں۔

(۶)

شہزادہ سلیم کا برج والا ایوان

سلام تخت پر بے ہوش پڑا ہے۔

دلارام پنجوں کے بل آتی ہے اور سلیم کے سرہانے کھڑی ہو جاتی ہے۔

دلارام خود کلامی کرتی ہے۔

تو غافل سو رہا ہے۔

تیری انارکلی کے گرد اینٹیں اور پتھر چنے گئے اور اس کا حسن خاک میں مل گیا۔

لیکن اس میں میرا کیا قصور۔

یہ تو ستاروں کے کھیل ہیں۔

کون ان کی پراسرار چالوں کو سمجھ سکتا ہے۔

سلیم کروٹ بدلتا ہے۔ دلارام بھاگ کر دروازے پر پہنچ جاتی ہے پھر پلٹ کر دیکھتی ہے۔ سلیم پھر غافل ہو جاتا ہے۔

دلارام کہتی ہے۔

''ابھی نہیں۔ تم جاگ کے کیا کرو گے۔ اس خبر کو سن کر آنسو بہاؤ گے۔''

سلیم کروٹ بدلتا ہے۔ دلارام ایک طرف ہو جاتی ہے۔

سلیم کا دوست بختیار آتا ہے۔ سلیم اٹھ کے بیٹھ جاتا ہے۔

سلیم بے چینی سے بختیار سے سوال کرتا ہے۔

''بختیار کچھ کہو' کوئی خبر سناؤ۔ خواہ خبر کتنی ہی بدترین کیوں نہ ہو۔''

بختیار آہ بھر کر جواب دیتا ہے اور درمیان میں آنسو پونچھتا جاتا ہے۔

''سب کچھ ہو گیا میرے شہزادے۔ سب کچھ ہو گیا۔ بتانے کو کچھ بھی نہیں رہ گیا۔

''کچھ باقی نہ رہا- کیا کہہ رہے ہو تم؟'' سلیم بے چین ہو کر پہلو بدلتا ہے-''انار کلی- بختیار! انار کلی کہاں ہے؟''

''وہ تمہیں دیکھ رہی ہے سلیم''

''کہاں؟'' سلیم گھبرا کے ادھر ادھر دیکھتا ہے-

''تم اسے نہیں دیکھ سکتے سلیم'' بختیار آنسو بہاتا ہے-''تم اسے نہیں دیکھ سکتے اور دیکھنے کی کوشش بھی نہ کرو- تم تو اسے مر کر بھی نہیں دیکھ سکتے - خدا کے لیے اسے آرام کرنے دو مرنے کے بعد تو اسے آرام کرنے دو سلیم-''

اس وقت ثریا دروازے سے داخل ہوتی ہے-

''ننھی ثریا تو رو نہیں رہی ہے-'' سلیم روتے ہوئے کہتا ہے-''کیا وہ زندہ ہے؟''

سلیم ثریا کی طرف بڑھتا ہے- ثریا پیچھے ہٹتے ہوئے کہتی ہے-

''میرے قریب نہ آؤ''

''کیوں؟'' سلیم بے چین ہو جاتا ہے-

ثریا چیخ پڑتی ہے-

''او تیمور کی نامراد اولاد! ہندوستان کے بزدل ولی عہد- میری بہن کی جان لے کر تو اب تک زندہ ہے- پھول کو کھا جانے والے کیڑے- تو نے اس کی جان کو اپنی جان کہا تھا- او جھوٹے! تو نے اسے بچا لینے کا وعدہ کیا تھا- او بے حیا! انار کلی اور انار کلی کی بڑھیا ماں کے ناپاک قاتل- تجھ پر اس بے کس کا صبر پڑے گا- تجھے مظلوم کی آہیں پھونک ڈالیں گی- بے بس کے آنسو تجھے غرق کر دیں گے-''

''لڑکی خاموش ہو جا-'' بختیار ثریا کو ڈانٹتا ہے-

سلیم کا سر جھکا ہوا ہے اور وہ مضمحل لہجے میں کہتا ہے-

''ثریا! دنیا کی کوئی لعنت اور بد دعا نہ چھوڑ اور جب تیرا دل بھر جائے تو صرف اتنا کر کہ خدا کے لیے مجھے انارکلی کے راستے پر لگا دے۔ میرا راستہ سیدھا تھا مگر میں ہٹ گیا۔ مجھے بے بس کر دیا گیا۔''

ثریا اپنی بہن کے غم میں شعلہ جوالہ بن گئی تھی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ شہزادے کا منہ نوچ لے اور اسے بتائے کہ وہ ایک ظالم باپ کا ایک دروغ گو بیٹا ہے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی بہن کے گرد پتھر کی دیوار چن دی گئی۔ وہ ناشاد زندہ گاڑ دی گئی۔ اس کی آخری چیخیں آسمان سے شگاف کرتی رہیں۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں اینٹوں میں چھپ جانے سے پہلے صرف اور صرف تیری صورت کو ڈھونڈتی رہیں اور تو یہاں پردوں میں اپنی جان چرائے بیٹھا ہے''

اور پھر سلیم جیسے پھٹ پڑا۔

''ثریا تو ٹھیک کہتی ہے۔ میں ظالم باپ کا ظالم بیٹا ہوں۔ ہائے وہ زندہ دیوار میں۔ پناہ تیری پناہ۔ میرے گرد کس جہنم کا منہ کھل گیا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے تو نے کس ہیبت کا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ خدا...... میرے خدا......''

شہزادہ سلیم اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے مگر بختیار اس کے جسم سے چمٹ جاتا ہے اور پھر وہ دونوں لپٹے چمٹے زمین پر گر جاتے ہیں۔

''ہوش میں آؤ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔'' بختیار اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس وقت ایک طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور اکبر گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے۔ وہ سلیم کو دیکھتا ہے اور محبت اور نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔

''تم کون ہو؟'' سلیم دہاڑتا ہے۔

''اپنے باپ کو پہچانو سلیم۔''

سلیم منہ موڑ کر کہتا ہے۔

''میرا کوئی باپ نہیں- وہ مر چکا ہے- تم ہندوستان کے شہنشاہ ہو- جہاں بانی اور دولت کے باپ ہو- تم قاتل ہو- انارکلی کے قاتل- سلیم کے قاتل- تمہاری پیشانی پر صرف اقتدار کی لکیریں ہیں- تمہاری آنکھیں جہنم کے شعلے برساتی ہیں- تمہاری سانسوں سے انسانی خون کی بو آتی ہے-''

''شیخو! میرے بچے ہوش میں آؤ- بادشاہ قانون کا غلام ہوتا ہے اور غلاموں سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں-''

اس وقت مہارانی داخل ہو کر سلیم سے لپٹ جاتی ہے- پھر آنسو پونچھتے ہوئے کہتی ہے

''دیکھا...... دیکھ لیا مہابلی- تمہارے سینے میں ٹھنڈک پڑ گئی؟ مت رو میرے لال- انارکلی زندہ رہے گی- یہ لاہور...... تیرا لاہور...... میرا لاہور تیری انارکلی کو زندہ رکھے گا- دنیا اس داستان کو یاد رکھے گی اور......اور......تو بھی......میں بھی اور دور دراز کی نسلیں بھی انارکلی کی جوان موت پر آنسو بہائیں گی- سن رہا ہے میرے چاند- میرے شہزادے اور مستقبل کے بادشاہ......تاجدار اور شہنشاہ......''

اکبر نے بیٹے سے مجرمانہ سازش کے شبہ میں انارکلی کو سیدھا کھڑا کر کے اس کے گرد دیوار چن دینے کا حکم دیا- سلیم کو اس کی موت کا بے حد صدمہ ہوا- تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے انارکلی کی قبر پر ایک شاندار عمارت بنوادی- اس کا تعویذ خالص سنگ مرمر کی ایک ہی سل سے بنا ہوا ہے جو اپنے حسن کے اعتبار سے غیر معمولی اور نقش کے اعتبار سے نادرِ روزگار ہے اور یہ تعویذ دنیا میں سنگ تراش کے بہترین نمونوں میں سے ہے- اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کے ۹۹ صفات کندہ ہیں- پہلوؤں پر یہ شعر کھدا ہوا ہے جو انارکلی کے عاشق جہانگیر نے خود کہا تھا

تا قیامت شکر گویم کردگارِ خویش را

آہ گر من باز بینم روئے یارِ خویش را

ایک دوسرے فریم میں اس عمارت کی تاریخ لکھی ہے کہ کس زمانہ میں اس عمارت سے کیا کام لیا گیا۔ انارکلی کے زندہ گاڑے جانے کی تاریخ ۱۵۹۹ء اور مقبرے کی تکمیل کی تاریخ ۱۶۱۵ء درج ہے۔ اس جگہ ''انارکلی'' کی داستان تو ختم ہو جاتی ہے مگر اس سلسلے میں بعض وضاحتیں بہت ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ بات کہ یہ داستان نہ معلوم کب اور کیونکر ایجاد ہوئی اور لاہور کی جن تواریخ میں اس کا تذکرہ ہے ان میں ''کہاں'' سے لی گئی۔ خود اس داستان میں اندرونی شہادتوں کی بنا پر کئی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ درست نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا تعلق چونکہ تاریخ سے ہے اس لیے اس پر کوئی مؤرخ ہی بحث کر سکتا ہے۔

ظاہری طور پر اس ڈرامہ یا داستان کا تعلق محض روایات سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اب تک جن لوگوں نے اس فرضی داستان کو پڑھا ہے یا سنا ہے ان کا اس بات پر اختلاف ہے کہ یہ ٹریجڈی سلیم اور انارکلی کی ہے یا انارکلی اور اکبر اعظم کی۔ اس کے علاوہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ انارکلی اور دلارام کی اصلیت کیا ہے۔ ڈرامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں شاہی محل کی معروف کنیزیں ہیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ شاہی محل تک کس طرح پہنچیں۔ آیا کہ انہیں بردہ فروشوں سے خریدا گیا یا پھر امراء اور وزراء نے ان حسین و جمیل کنیزوں کو محض شاہ وقت کی خوشنودی کے لیے ان کے حضور پیش کیا اور داد پائی یا کوئی مالی فائدہ حاصل کیا۔

بہر حال یہ داستان اس قدر معروف اور مقبول ہے کہ ہم بچپن سے سنتے اور پڑھتے چلے آ رہے ہیں اور جب تک یہ قصہ یا کہانی اردو ادب میں موجود ہے اس وقت تک یہ پڑھنے والوں سے داد و تحسین حاصل کرتی رہے گی اور ایک ناول اور ڈرامہ کی کامیابی کے لیے یہی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔

حورمحل

بنگال میں پروان چڑھنے والی مغل امیرزادی کی لرزہ خیز اور دلگداز کہانی

حورمحل کا حسن بے مثال تھا- امیرزادہ محویت کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا حورمحل حیا سے دہری ہوئی جا رہی تھی- امیرزادے کی محویت سے تنگ آ کر حورمحل نے بھاری بھاری پلکیں اٹھائیں اور شرماتے ہوئے بولی......

''آپ مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

''حورمحل......'' امیرزادے نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا- ''تم واقعی حور ہو- میں تمہاری تصویر اپنے دل میں اتار رہا ہوں- صرف ایک سال میں کتنی تبدیلیاں آ گئی ہیں تم میں امی حضور نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بنگالہ کی فضائیں سحرانگیز ہیں- یہاں کی دل فریبیاں جوان دلوں کو جکڑ لیتی ہیں یہ جادونگری ہے نا؟''

''جادونگری......'' حورمحل کھل کھلا کر ہنس پڑی- ''آپ پچھلی دفعہ جب یہاں آئے تھے تو میں بچی تھی اور اب میں......'' حورمحل کہتے کہتے گھبرا گئی- رخساروں پر پسینے کے موتی چمک اٹھے-

''ہاں اب تم بچی نہیں رہیں-'' امیرزادے نے اس کا جملہ پورا کیا اور حورمحل کی زلفوں میں گوندھے ہوئے گھنگروؤں کو چھیڑا جو ایک ساتھ بج اٹھے اور شام کے دھندلکوں میں ڈوبتا ہوا سناٹا جاگ پڑا-

''آپ قلعے میں رہتے ہیں-'' حورمحل بے بسی سے بولی- ''میں آپ جیسی پیاری

پیاری باتیں تونہیں کرسکتی۔"

امیرزادہ' اس کی بھولی بھالی باتوں پر مسکرا دیا اور بولا۔" تم چاہو تو ڈھاکہ چھوڑ کر میرے ساتھ آگرے کے قلعے میں چل سکتی ہو۔ میں امی حضور سے آج ہی بات کروں گا۔"

"ہائے اللہ! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" حورمحل کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔"اب واپس چلئے۔ آج عید کی شام ہے۔سہیلیاں میراانتظار کررہی ہوں گی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ تم میری منگیتر ہو؟" امیرزادے نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہوں......" حورمحل نے آہستہ سے کہااور نظریں جھکالیں۔

امیرزادہ عنایت اللہ خان' بنگال کے گورنر قاسم خان کا نوعمر بیٹا تھا۔ مغل دستورحکومت کے مطابق جب کسی امیر یا سردارکو کسی دور دراز علاقے کی امارت سونپی جاتی تو اس کے بڑے بیٹے کو دارالسلطنت میں روک لیا جاتا تاکہ خودسرامیراپنے شاہ سے بغاوت کی جرأت نہ کرسکے۔ ایسے امیرزادوں کی ایک پوری فوج شاہی نگہداشت میں پروان چڑھتی۔ انہیں شہزادوں کے ساتھ رزم اور بزم کے تمام فنون وآداب سے آراستہ کیا جاتا۔ ان بچوں پر ملکہ اورشاہ وقت اس قدر مہربان ہوتے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کو بھول کر ملکہ اور شاہ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگتے تھے۔

بنگال کی گورنری' شہنشاہ جہانگیر کے دورحکومت میں مہابت خان کے پاس تھی پھر جب جہانگیر کا آخری وقت آیااور ولی عہدی کی ریشہ دوانیاں شروع ہوئیں تو ملکہ عالم نورجہاں نے اپنی مدد کے لیے مہابت خان کو بنگال سے طلب کرلیا تاکہ اپنے داماد شہریار کو جہانگیر کے بعد شہنشاہ ہند بنا سکے لیکن ہند کی شہنشاہی تو شاہ جہاں کی قسمت میں لکھی تھی۔

شاہ جہاں نے تخت وتاج سنبھالتے ہی اپنے اعتماد کے امیروں کو اہم علاقوں کی گورنری

عطا کی اور جلوس کے دوسرے سال ۱۶۲۸ء میں بنگال کی گورنری' قاسم خان کے حصے میں آئی - بنگال ایک اہم صوبہ تھا - شہنشاہ نے بہت سی ہدایات کے ساتھ قاسم خان کو بنگال روانہ کیا - مغل شہنشاہ' علاقائی گورنروں کے تقرر کے وقت انہیں دو طرح کی تاکید کرتے تھے - اول یہ کہ دشمن کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کی جائے - دوم یہ کہ رعیت کا دل موہ لینے کے لیے کسی کوشش سے دریغ نہ کیا جائے -

قاسم خان' شہنشاہ کا بڑا اعتماد والا سردار تھا پھر بھی ملکہ اور شہنشاہ نے اس کے لڑکے عنایت خان کو اپنی طفولیت میں لے لیا - امیر زادہ عنایت خان صرف ایک بار والدین سے ملنے آگرہ سے ڈھاکہ گیا تھا - اس وقت بھی اسے عید کے موقعے پر اجازت ملی تھی - امیر زادے عنایت کی امی حضور نے یہ موقع غنیمت جانا تھا اور اسی وقت عنایت خان اور اپنی بہن کی بیٹی حور محل کی منگنی کر دی تھی -

حور محل اس وقت کم عمر تھی وہ منگنی کے وقت بھی محلے کی بچیوں کے ساتھ کھیلتی رہی تھی لیکن اب جو امیر زادہ دوبارہ اپنے والدین سے ملنے ڈھاکہ آیا تو وہ شعور کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی - اس کی ماں نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ امیر زادہ عنایت اس کا منگیتر ہے اور مغل شہنشاہ کی اجازت ملتے ہی اس کی شادی کر دی جائے گی -

حور محل کا باپ رسالدار تھا اور قاسم خان کے ساتھ ہی ڈھاکہ آ گیا تھا - ڈھاکہ کا قدیم نام موہانہ تھا - جہانگیر کے دور حکومت میں بنگال کا صدر مقام سونارگاؤں سے موہانہ منتقل ہوا تھا...... اس کا نام جہانگیر نگر رکھا گیا تھا پھر جہانگیر نگر سے اس کا نام ڈھاکہ ہو گیا -

قاسم خان نے اپنے ہم زلف کو ڈھاکہ سے نصف منزل کے فاصلے پر ایک سرحدی چوکی پر لگا دیا تھا لیکن حور محل کے باپ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکا - اس وقت حور محل بچی تھی اور اس کی ماں جوان لیکن اس کی ماں کو اپنے شوہر سے اس قدر محبت تھی کہ اس نے دوسری شادی

نہیں کی- اس کی سسرال والے بہت نیک تھے- انہوں نے بہو کو شوہر کے انتقال کا غم نہ ہونے دیا اور ماں بیٹی دونوں کو سر آنکھوں پر بٹھائے رکھا-

حور محل کی ماں اب بچی کے فرض سے بھی ادا ہونا چاہتی تھی اس نے اپنی بہن کے پاس کئی بار پیغام بھیجا تھا کہ حور محل کو رخصت کرا کے لے جائے- اس دفعہ عنایت خان عید کرنے ڈھاکہ آیا تو میاں بیوی کے درمیان اس سلسلے میں بڑی سنجیدگی سے گفتگو ہوئی...... اور قاسم خان نے بیوی سے وعدہ کیا کہ جب بھی اسے آگرہ جانے کا موقع ملا' وہ شہنشاہ سے اپنے بیٹے کی شادی کی اجازت مانگے گا-

قاسم خان کی بیوی نے عید کی نماز کے فوراً بعد عنایت خان کو اپنی بہن کے گھر بھیج دیا- اس نے بہن کی محبت میں بیٹے کی منگنی حور محل سے کر تو دی تھی لیکن اسے یہ خوف تھا کہ قلعے کا پروردہ امیر زادہ کہیں ایک ان پڑھ لڑکی کو قبول کرنے سے انکار نہ کر دے- حور محل نے صرف گھر میں تعلیم پائی تھی اور خط لکھنے کی حد تک اس کی تعلیم تھی- بیٹے کو بہن کے گھر بھیجنے کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ اپنی منگیتر کو دیکھ لے اور اگر اسے حور محل پسند آ جائے تو منگنی کو عقد میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے-

حور محل ہنستی بولتی' امیر زادے کو ساتھ لے کر ناریل باغ سے اپنے گھر واپس آ گئی- ناریل باغ اور اس کے گھر کے درمیان ایک وسیع سبزہ زار تھا جسے چاندنی راتوں میں محلے کی لڑکیاں کھیل کود کے میدان کے طور پر استعمال کرتی تھیں- حور محل کی ماں کو بھی احساس ہو گیا کہ عین عید کے روز' بھانجے کا اس کے گھر آنا ضرور کوئی معنی رکھتا ہے- اس لیے اس نے حور محل کو بھی موقع دیا کہ وہ اپنے منگیتر سے پوری طرح واقف ہو جائے اسی لیے اس نے حور محل کو ناریل باغ کی سیر کرانے کے بہانے امیر زادے کے ساتھ تنہا بھیج دیا تھا-

حور محل کی ماں نے عنایت خان اور حور محل کو خوش خوش آتے دیکھا تو اسے بڑا اطمینان

ہوا پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ حورمحل سے مل کر اس کی اور عنایت خان کی گفتگو کی تفصیل معلوم کرے تاکہ وہ خود بھی عنایت خان سے کچھ بات کر سکے لیکن حورمحل اسے اتنا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ وہ تو اپنے منگیتر کے گرد بھنورے کی طرح منڈلا رہی تھی۔

ایک بار جب وہ کھانے کی کوئی پلیٹ لیے جا رہی تھی تو اس کی ماں نے اسے آ پکڑا۔ حورمحل اپنے خیالوں میں گم، اس کمرے کی طرف جا رہی تھی جہاں امیرزادے کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس کی ماں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ بری طرح چونک پڑی اور پلیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ پلیٹ گرنے کی آواز اتنی بلند ہوئی کہ عنایت خان بوکھلا کر کمرے سے نکل آیا لیکن جب اس نے ماں بیٹی کو باتیں کرتے دیکھا تو مسکرا کر واپس چلا گیا۔

''توبہ ہے، امی جان! حورمحل پریشان ہوتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ آواز دے کر روک لیا ہوتا۔''

ماں نے دزدیدہ نظروں سے پہلے اس کمرے کی جانب دیکھا جہاں عنایت خان کو کھانے کے لیے بٹھایا گیا تھا...... پھر حورمحل کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ ''او دیوانی لڑکی! میں تجھ سے بات کرنے کا موقع تلاش کر رہی ہوں اور تو ہے کہ ہاتھ ہی نہیں آتی۔''

''مجھ سے، امی جان؟'' حورمحل نے حیرت سے پوچھا۔ ''پہلے مجھے امیرزادے کو کھانا کھلا لینے دیجیے پھر بات کیجیے گا۔''

اس کی ماں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''نہیں حورمحل! پہلے میری ایک بات کا جواب دے پھر آگے بڑھیو۔''

''فرمایئے، امی جان! آپ کو کس بات کا جواب چاہیے۔'' حورمحل جھنجھلا کر بولی۔ ''مگر

اس بات کا خیال رکھیے کہ کھانے کے کمرے میں امیر زادہ اور میری سہیلیاں میرا انتظار کر رہی ہیں۔"

"پہلے یہ بتا کہ تجھ سے امیر زادے نے کیا باتیں کیں؟" اس کی ماں نے یوں پوچھا جیسے حور محل کو کوئی کام نہ ہو...... اور وہ فارغ لمحات میں ماں کے پاس بیٹھی ہو۔

"میں ان سے کیا باتیں کروں گی...... وہ ٹھہرے قلعے والے...... اور میں......"

"کچھ تو کہا ہوگا امیر زادے نے؟" ماں نے زور دے کر پوچھا۔

"انہوں نے تو بہت سی باتیں کیں" حور محل سرشاری سے بولی۔

"شہنشاہ اور ملکہ عالم کے بارے میں بتاتے رہے وہ کہہ رہے تھے کہ وہ شہزادوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔"

"تیرے بارے میں بھی کچھ کہا تھا؟" ماں نے الجھتے ہوئے سوال کیا۔

"میرے بارے میں...... ہاں کچھ کہا تو تھا" وہ سوچنے لگی۔

"کیا کہا تھا؟ یاد کر کے بتا۔"

"ہاں' یاد آیا......" وہ شرماتے ہوئے بولی۔ "انہوں نے پوچھا تھا میرے ساتھ قلعہ آگرہ چلو گی؟"

"ہائے' یہ پوچھا تھا تجھ سے؟" ماں اس کے اور قریب ہو گئی۔

"ہاں امی جان! لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"لے' میں نہ پوچھوں گی تو اور کون پوچھنے آئے گا۔" ماں نے خوشی سے لہکتے ہوئے کہا۔ "پھر تو نے کیا جواب دیا؟"

"میں...... میں کیا کہتی...... میں نے کہہ دیا کہ میں آپ جیسی پیاری پیاری باتیں نہیں کر سکتی۔"

''اور بھی کچھ کہا؟'' ماں کی بے چینی بڑھ گئی۔

''بس میں نے کہا کہ اب گھر چلیے۔ میری سہیلیاں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''بدھو...... بے وقوف کہیں کی'' ماں نے اسے محبت سے ڈانٹا ''یہی تو وقت تھا جواب دینے کا۔''

''میں کیا جواب دیتی؟'' حور محل نے معصومیت سے پوچھا۔ ''کیا کہہ دیتی کہ ہاں ساتھ چلوں گی؟''

''اگر کہہ بھی دیتی تو اس میں حرج ہی کیا تھا'' ماں کی زبان سے نکل گیا پھر سنبھل کر بولی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اس نے تجھے پسند کر لیا ہے۔''

''مجھے کون پسند نہیں کرے گا' امی جان!'' حور محل فخر سے بولی۔ ''میری تمام سہیلیاں مجھ پر جان دیتی ہیں۔''

''بس' بس...... رہنے دے۔ اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنا کرتے......''

ماں نے کہا۔ ''اچھا اب جا...... اور سن' امیر زادے کا خاص خیال رکھنا۔ کوئی بات کہے تو ادب سے جواب دینا۔ آگرہ چلی گئی تو تیری قسمت کھل جائے گی۔''

حور محل کھانے کے کمرے میں پہنچی تو عنایت خان خوب چہک رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''لیجئے میزبان صاحبہ تشریف لے آئیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے قہقہہ لگایا اور حور محل کی تمام سہیلیاں اس قہقہے میں شامل ہو گئیں۔

حور محل نے سہیلیوں کو تیز نظروں سے دیکھا اور عنایت خان کو جواب دیا۔ ''میں اس لیے چلی گئی تھی کہ آپ اطمینان سے کھانا کھا سکیں ورنہ شرم کے مارے آپ کے حلق سے نوالہ نہ اترتا۔''

حور محل نے اپنے طور پر امیر زادے کے مذاق کا جواب دیا تھا لیکن اس جواب میں

بڑے شوخ قسم کا طنز تھا۔ امیر زادہ اس سے بہت محظوظ ہوا۔ اس نے فوراً داد دی۔ ''حور محل! تم نے قلعہ آگرہ کا ماحول نہیں دیکھا لیکن تمہارا جواب اس قدر خوبصورت ہے کہ میں تمہاری تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس دور دراز علاقے میں بھی مغل تمدن پوری طرح اجاگر ہے۔''

حور محل اور اس کی سہیلیاں، پتہ نہیں امیر زادے کی بات سمجھ بھی پائیں یا نہیں لیکن حور محل نے فوراً جھک کر امیر زادے کو اس طرح کورنش پیش کی کہ اسے شاہی دربار یاد آ گیا۔

''ماشاءاللہ، حور محل! تم محلوں ہی کے قابل ہو'' اسی وقت حور محل کی ماں بھی کمرے میں آ گئی۔ اسے دیکھ کر سب خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

☆☆☆

کھانا، مسکراہٹوں اور دلچسپ باتوں کے درمیان ختم ہوا۔ حور محل کی ماں، تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ کھانے کے بعد حور محل کی سہیلیوں نے خوب اودھم مچایا۔ وہ کبھی حور محل کو چھیڑتیں، کبھی امیر زادے کے پیچھے پڑ جاتیں۔ حور محل تو دبی دبی سی رہی لیکن امیر زادہ محلوں کا تربیت یافتہ تھا، اس نے حور محل کی سہیلیوں کو خوب خوب جواب دیئے۔

حور محل کی ماں کو بھانجے کی فکر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ امیر زادہ جس طرح خوشی خوشی آیا ہے، اسی طرح خیریت سے ڈھاکہ پہنچ جائے۔ جب اس نے دیکھا کہ حور محل کی سہیلیاں کسی طرح امیر زادے کا پیچھا نہیں چھوڑتیں تو وہ ایک بار پھر واپس آئی۔ اس کے آنے سے قہقہوں کا سیلاب ایک دم رک گیا۔ اس نے آتے ہی نرمی سے کہا۔ ''اے لڑکیو! اب تم اپنے اپنے گھروں کو جاؤ۔ عید کی رات ہے، گھر والے تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''خالہ جان! ہماری فکر نہ کریں۔ ہم تو گھر کہہ کر آئے ہیں کہ دلہا بھائی کو رخصت کرنے جا رہے ہیں۔ عید کی رات تو ہر سال آتی ہے مگر امیر زادے کا کیا پتہ کب آئیں گے۔ ابھی تو

ہم نے......'' ایک شوخ سہیلی نے معنی خیز نظروں سے حور محل کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔

دوسری سہیلی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا......'' اور کیا' خالہ جان! شہزادے تو آخر شہزادے ہی ہوتے ہیں۔ قلعے پہنچ کر یہ ہم سب کو بھول جائیں گے۔''

'' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' امیر زادے نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔'' میرا سب کچھ تو یہیں ہے۔ میں بنگال کو کیسے بھول سکتا ہوں......'' پھر وہ حور محل کی ماں سے مخاطب ہوا۔'' خالہ حضور! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ ابا حضور اور امی حضور ڈھاکہ میں اور آپ لوگ بھی یہاں ہیں۔''

'' اور حور محل بھی تو یہیں ہے۔'' کسی سہیلی نے لقمہ دیا۔ اس پر ایک زوردار قہقہہ گونج اٹھا۔ امیر زادہ بڑا تیز وطرار اور مجلسی نوجوان تھا لیکن حور محل کے نام پر وہ گھبرا گیا۔

امیر زادے نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے صفائی پیش کی۔'' حور محل تو خیر میری رشتے دار ہیں لیکن قسم لے لیجئے کہ میں آپ سب کو بھی اپنی عزیزوں سے کم نہیں سمجھتا۔''

'' جگ جگ جیؤ بیٹے!'' حور محل کی ماں مسرت سے بولی......'' شریف اور خاندانی بچوں کے ایسے ہی خیالات ہوتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو اب کی بار جب تم یہاں آؤ گے تو یہاں کی خوشیاں اور مسرتیں ہم تمہارے ساتھ کر دیں گے۔''

حور محل کی ماں کے دل کی بات آخر اس کے ہونٹوں سے پھسل ہی پڑی۔ حور محل نے شرم سے سر جھکا لیا اور امیر زادے کی زبان گنگ ہو گئی۔

'' اچھا بیٹے! اب تم واپسی کو تیاری کرو۔ میں امام ضامن لے کر آتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے حور محل کی ماں دوسرے کمرے میں چلی گئی......اور سہیلیوں نے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

ایک منہ پھٹ سہیلی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ ''حورمحل...... تیاری کرلو۔ اب کے پھیرے میں تم ہمیں چھوڑ کر پیا دیس چلی جاؤ گی۔''

حورمحل شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ امیرزادہ بڑی دلچسپی سے یہ باتیں سن سن کر مسکرا رہا تھا...... پھر حورمحل کی ماں امام ضامن لے کر آ گئی اور امام ضامن' امیرزادے کے بازو پر باندھ دیا۔

امیرزادہ گھر سے نکلا تو پوری بستی اسے رخصت کرنے کے لیے اُمڈ آئی۔ امیرزادے کے ساتھ پانچ محافظ ڈھاکہ سے آئے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ آج رات ہی واپس جانا ہے۔ وہ بھی کھا پی کر تیار ہو گئے تھے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر ناریل باغ کے دروازے پر آ گئے تھے۔

امیرزادے نے باہر آ کر رخصت کرنے والوں پر مسرت اور حسرت بھری نظر ڈالی پھر خالہ سے رخصت ہونے کے لیے ان کے قریب پہنچ گیا۔ انہوں نے امیرزادے کی بلائیں لیں اور دعائیں دیتے ہوئے بولیں ''جاؤ' بیٹے! تمہیں اللہ کے سپرد کیا۔ جس طرح پیٹھ دکھا رہے ہو' اسی طرح منہ دکھانا۔''

امیرزادے نے بستی کے مردوں اور عورتوں کو ادب سے سلام کیا پھر اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت حورمحل نے گھبرائے ہوئے لہجے میں ماں سے کہا۔ ''امی جان! ذرا ٹھہریئے۔ میں ابھی آئی'' یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے اندر چلی گئی اور چند لمحوں بعد کچے ناریل لیے ہوئے واپس آئی اور ماں سے کہا۔ ''امی جان! یہ ناریل انہیں دے دیجئے۔''

ماں نے مسکرا کر کہا۔ ''بیٹی! شگون تو کر رہی ہے۔ تو ہی اپنے ہاتھ سے سفر کا تحفہ دے۔''

بنگال میں رواج تھا کہ سفر پر جانے والوں کے ساتھ کچے ناریل کر دیتے تھے۔ اسے وہ ایک نیک شگون سمجھتے تھے۔ ماں کے حکم پر حورمحل شرماتی' لجاتی آگے بڑھی اور دونوں ناریل

امیر زادے کے حوالے کر دیئے- امیر زادے نے دونوں ناریل لے کر اپنی خرتاک میں ڈالے اور آہستہ سے کہا- "یہ تحفہ مجھے تمہاری یاد دلاتا رہے گا-"

امیر زادہ' راسیں سنبھال کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اس نے آخری بار حور محل کو دیکھا اور پھر گھوڑے کو ایڑ لگا کر اپنے محافظوں کے قریب پہنچ گیا وہ پہلے ہی تیار تھے انہوں نے لگامیں اٹھائیں اور دیکھتے ہی دیکھتے چھ سوار رات کی تاریکی میں گم ہو گئے-

☆☆☆

اس چھوٹی سی بستی کی طرح ڈھاکہ شہر میں بھی عید کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں- شام ہوتے ہی بنگال کے گورنر قاسم خان کی حویلی پر لوگ آنا شروع ہو گئے- قاسم خان کی رہائش ایک بڑے قلعے کے اندر تھی- قلعے کے علاوہ ڈھاکہ شہر کے گرد بھی ایک مضبوط فصیل تھی- ڈھاکہ کے شمال میں مگھ کی ہندو ریاست تھی اور مشرق کی جانب بنگال کی سرحد اراکان سے ملتی تھی جہاں برہما کے ہندو راجہ حکومت کرتے تھے...... یہ دونوں غیر مسلم ریاستیں آئے دن چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں- قاسم خان نے شمالی اور مشرقی سرحدوں پر مضبوط چوکیاں قائم کی تھیں- جنوب میں چٹا گانگ کے ساحلی علاقوں میں پرتگالیوں کی چیرہ دستیاں جاری تھیں- اس علاقے کی رعایا بہت پریشان تھی اور آئے دن ڈھاکہ میں شکایتیں موصول ہوتی رہتی تھیں-

اس رات قاسم خان نے اپنے عمائدین' امرا' معززین شہر اور باہر سے ملاقات کے لیے آنے والوں کی شاندار ضیافت کی تھی دعوت کے بعد جب گفتگو شروع ہوئی تو دو موضوع زیر بحث آئے- پہلا موضوع تو امیر زادے عنایت اللہ خان کی قلعہ آگرہ سے آمد اور دوسرا موضوع پرتگالیوں کا ظلم وستم تھا-

کچھ لوگ تو صرف امیر زادے سے ملاقات کرنے کے لیے لمبا سفر کر کے آئے تھے مگر

جب انہیں معلوم ہوا کہ امیر زادہ عید کی نماز۔ کے بعد اپنی خالہ کے گھر چلا گیا ہے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی لیکن قاسم خان نے ان لوگوں کو یہ کہہ کر روک لیا تھا کہ امیر زادہ رات کو کسی وقت واپس آ جائے گا۔

جنوب سے آنے والے ایک شخص نے ہگلی میں پرتگالیوں کی قلعہ بندیوں اور رعایا کے ساتھ ان کی زیادتیوں کا بڑا رقت آمیز انداز میں تذکرہ کیا جس سے ہر ایک متاثر ہوا اور بزم نشاط کی اس محفل میں اداسی سی پیدا ہوگئی۔ قاسم خان کا ایک مغل سردار تو نہایت جذباتی ہو گیا اور بڑے جوش سے بولا۔ ''خان محترم! مسلم اور غیر مسلم رعایا پر پرتگالیوں کے ظلم وستم اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ ہم پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس مسئلے پر آپ فوراً توجہ دیں اور جہاد کا اعلان کریں۔''

قاسم خان اس مسئلے پر پہلے ہی پریشان تھا۔ اس کے جاسوسوں نے پرتگالیوں کے تمام حالات سے باخبر کر رکھا تھا۔ ان تفصیلات سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ پرتگالی اس قدر طاقت ور ہو چکے ہیں کہ شاہی کمک کے بغیر ان پر قابو پانا ممکن نہیں۔ اس نے ایک دوبار شہنشاہ شاہ جہاں کو بھی پرتگالیوں کے سلسلے میں تحریری اور زبانی درخواستیں بھیجی تھیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا تھا۔ امیر زادے نے قاسم خان کو بتایا تھا کہ پرتگالیوں کا مسئلہ شہنشاہ کے علم میں آ چکا ہے اور وہ کسی بہتر وقت میں اس پر ضرور توجہ دیں گے۔

قاسم خان کو دربار میں اپنا وقار برقرار رکھنا تھا اور اپنے لوگوں کو مطمئن بھی کرنا تھا۔ اس نے مغل سردار کی حمایت کرتے ہوئے کہا ''پرتگالیوں کے خلاف جہاد کا اعلان ہمارے خیال میں بھی ضروری ہو گیا ہے۔ بندرگاہ ہگلی کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ پرتگالیوں نے لوٹ مار، قتل وغارت اور اغوا کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اور اپنی طاقت کے زعم میں اب وہ دور دور تک دھاوے بولنے لگے ہیں میں پہلے ہی قلعے میں اس کی اطلاع بھجوا چکا ہوں اور اب پھر

بیٹے عنایت خان کے ذریعے قلعے کو اس تفصیل سے آگاہ کر کے شاہی کمک کی
واست کروں گا تاکہ پرتگالیوں پر ایک بھرپور حملہ کر کے اس فتنے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا
ئے۔"

"خان عالی مقام!" ایک دوسرے سردار نے کہا۔ "میں نے تو یہ سنا ہے کہ قلعہ اپنے
بوں کی اس وقت مدد کرتا ہے جب صوبہ کسی ریاست پر حملہ کرنا چاہے یا صوبے کو کسی
ف سے بڑے حملے کا خطرہ ہو...... میرا خیال ہے کہ اگر گورنر مناسب سمجھیں تو ہم حملے کی
ریاں شروع کر دیں اور قلعے سے توقع رکھنے کی بجائے اپنے طور پر پرتگالیوں کے خاتمے کا
سوبہ بنائیں۔"

"میرا مقصد بھی یہی ہے۔" قاسم خان نے فوراً کہا۔ "ہم یوں کر سکتے ہیں کہ نہایت
یہ طریقے سے تیاریاں کریں اور انتظامات مکمل ہونے کے بعد کسی بہانے سے جنوب کی
ف یلغار کریں۔ اس طرح دشمن ہماری طرف سے غافل رہے گا اور ہم بغیر کسی پریشانی
ے اس کے سر پر پہنچ جائیں گے۔ اگر ہم ہگلی کا محاصرہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر قلعے
، مدد کا بھی انتظار کر سکتے ہیں یا پھر صورت حال کے مطابق جو بہتر صورت ہو گی اس پر عمل
یا جائے گا۔"

مغل سردار نے دبے لفظوں میں اس پر اعتراض کیا۔ "میرا خیال تھا کہ اگر جہاد کا
لان کر دیا جائے تو مسلمانوں میں جوش و جذبہ پیدا ہو جائے گا اور وہ جوق در جوق ہمارے
نکر میں شریک ہوں گے۔"

"جہاد تو ہم پر فرض ہے سردار!" قاسم خان نے جوش سے کہا "لیکن اس مقدس فرض
کے اعلان سے پرتگالی ہوشیار ہو جائیں گے۔ وقت کی مصلحت یہی ہے کہ ہم اپنی تیاریوں کو
شیدہ رکھیں اور دشمن کو غافل رکھ کر اس پر حملہ کریں۔"

مغل سردار نے کہا۔ ''محترم سردار! پرتگالیوں کی چیرہ دستیاں بڑھتی ہی جا رہی ہیر
کہیں ہماری خاموشی سے انہیں شہ نہ ملے اور وہ ایک دن ڈھاکہ تک پہنچ جائیں۔''

قاسم خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''میں مغل سردار کی بات
تائید کرتے ہوئے' جہاد کے لیے علماء کرام سے فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا ۔
فتویٰ حاصل ہونے کے بعد' اس کی تشہیر نہیں کی جائے گی بلکہ ہر شخص اپنے احباب میں اس
اعلان کرے گا۔ اس طرح' تمام لوگوں کو بغیر کسی تشہیر کے جہاد کی خبر ہو جائے گی اور وہ ا
فرض کی ادائیگی کی سعادت حاصل کر سکیں گے۔''

قاسم خان کی اس رائے کو سب نے پسند کیا...... اور ایک بار پھر عید کی خوشیوں اور ام
زادے کی آمد کا ذکر چھڑ گیا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی لیکن سرداروں کو امیر زاد
سے ملاقات کا اتنا شوق تھا کہ وہ دربار سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

حویلی کے اندر' امیر زادے کی ماں بھی اب تک جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے بہن ک
محبت کی خاطر' امیر زادے کو بھیج دیا تھا لیکن اب گھبرا رہی تھیں پرتگالیوں کی لوٹ مار کی خبر
انہوں نے بھی سنی تھیں۔ اب انہیں یہ فکر ستا رہی تھی کہ کہیں راستے میں امیر زادے او
پرتگالیوں کا سامنا نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں امیر زادے کی بخیریت واپس
آنے کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔ اسی وقت ایک کنیز بھاگتی ہوئی آئی اور اس نے اطلاع دی
کہ امیر زادہ واپس آ گیا۔ ماں کی ممتا خوشی سے جھوم اٹھی اور ان کے اترے ہوئے چہرے پ
مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

امیر زادے کو مردوں نے ہی میں روک لیا گیا۔ دور دور سے لوگ امیر زادے سے
ملنے آئے تھے۔ امیر زادہ پندرہ سولہ برس کا ایک مہذب اور تربیت یافتہ نوجوان تھا۔ وہ لوگوں
سے بڑی محبت اور خندہ پیشانی سے ملا لوگ اس سے طرح طرح کے سوال کرتے اور امیر زاد

مختصر مگر جامع جواب دیتا رہا- قاسم خان ہونہار بیٹے کے سلیقے اور طرز کلام سے خوش ہو
ہے تھے-

امیرزادے نے قلعہ آگرہ کی تفصیل اس انداز سے بیان کی کہ سننے والوں کی نظروں
اس کا نقشہ گھوم گیا- سب نے امیرزادے کی ذہانت اور یادداشت کی داد دی اور اس
باپ قاسم خان سے کہا کہ امیرزادہ صحیح معنوں میں اس کا دست و بازو بنے گا-

☆☆☆

یہ حقیقت تھی کہ اس دور میں ہگلی کے اردگرد کا علاقہ عملی طور پر پرتگالیوں کے زیر تسلط
-یورپ کی یہ گندم نما جو فروش قوم پچھلے ایک سو سال سے تاجروں کے بھیس میں بنگال کے
بی ساحل پر اپنی ایک نو آبادی قائم کر چکی تھی- پرتگالیوں نے نمک بنانے کی اجازت
صل کر کے ہگلی میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا نمک پر اجارہ داری کے علاوہ' پرتگالی دوسرے
الک سے بھی تجارت کرتے اور اپنی طاقت بڑھاتے رہے- یہ لوگ اچھے سپاہی اور بڑے
بارتاجر تھے- ان کے پاس دولت کی فراوانی تھی- سونار گاؤں اور سات گاؤں دو مشہور
تیاں تھیں- پرتگالیوں نے سات گاؤں کی زمین خرید کر' اس پر ہگلی کی بندرگاہ تعمیر کی تھی اور
بندرگاہ کو اس قدر ترقی دی کہ سونار گاؤں کی بستی بھی اجڑ کر رہ گئی...... پھر جب وہاں کے
ل حاکم نے ڈھاکہ کو اپنا مرکز بنا لیا تو پرتگالیوں کو اور کھل کھیلنے کا موقع مل گیا انہوں نے
ہستہ آہستہ ہگلی کے اردگرد کے تمام علاقوں پر طاقت کے زور سے قبضہ کیا- اسی طرح یہ تاجر
بارت کرتے کرتے ایک بڑے علاقے کے حاکم کی طرح ابھر کے سامنے آئے-

مغل حکومت کی گرفت اس علاقے پر کمزور ہوتی گئی...... پھر وہ وقت آیا کہ مغلوں نے
نی خانہ جنگوں کو روکنے کے لیے پرتگالیوں کی مدد حاصل کر کے انہیں لاشعوری طور پر ہگلی کا
اکم تسلیم کر لیا- ہگلی میں باقاعدہ کوئی حکومت نہیں تھی بلکہ تاجروں کا ایک گروہ خود کو یہاں کا

حاکم سمجھتا تھا...... پھر رفتہ رفتہ یہاں کی آبادی بڑھی تو ایک نیا گروہ پیدا ہو گیا اور انہوں
طاقت کے زور پر مغل حکومت کے اس علاقے کو آپس میں تقسیم کرلیا۔ ۱۲۲۹ء میں راجر
افانسو نام کے دو تاجر اس علاقے کے مطلق العنان حاکم سمجھے جاتے تھے مگر افانسو کا
گردش میں آ گیا اور پورے علاقے پر راجر کا قبضہ ہو گیا۔

راجر بڑا جابر اور ظالم شخص تھا۔ اس نے بنگالیوں کو زبردستی عیسائی بنانا شروع کر دیا۔
لوگ مخالفت کرتے ان کے گھر بار لوٹ لیے جاتے اور انہیں غلام بنا کر ہگلی بھیج دیا جاتا۔
زمانے میں دس ہزار سے زیادہ مرد عورتیں اور بچے ہگلی میں غلاموں کی طرح زندگی گزار ر
تھے انہیں جانوروں کی طرح صبح سے رات گئے تک کام کرنا پڑتا' کھانے کے لیے پیٹ بھر
غذا نہ دی جاتی۔

راجر نے ایک ہزار سواروں کا ایک رسالہ بنا رکھا تھا جس کا کام لوٹ مار کرنا تھا۔ ا
رسالے نے ایسی دہشت پھیلا رکھی تھی...... کہ سونار گاؤں اور دوسری کئی آبادیاں اجڑ
تھیں۔ بنگالیوں نے ڈھاکہ حکومت سے کئی بار فریاد کی تھی لیکن مغل گورنر میں اتنی ہمت نہیں
کہ وہ پرتگالیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ اس لیے ہر فریاد کا جواب خاموشی سے دیا گیا۔ ادھر
مایوس ہو کر بعض بستیوں نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک مدافعتی نظام قائم کر لیا تھا۔ یہ لوگ
پرتگالیوں سے کھلے میدان میں جنگ تو نہیں کر سکتے تھے مگر ان کے جاسوس سوار دور دور تک
خبر رکھتے تھے۔ جب انہیں اطلاع ملتی کہ راجر کا رسالہ کسی آبادی کو تباہ کرنے کے لیے آ
والا ہے تو وہ لوگ فوراً اپنے گھر بار چھوڑ کر محفوظ مقامات پر چلے جاتے۔ اس سے ان کی عز
اور جانیں تو محفوظ ہو جاتیں لیکن راجر کے آدمی بغیر کسی مزاحمت کے تمام مال و اسباب لو
کر لے جاتے۔

امیر زادے کو خالہ کے گھر سے گئے ہوئے دس روز ہو چکے تھے وہ حور محل کو ایک ا

سہارا دے گیا تھا کہ وہ معصوم لڑکی ہر وقت اسی کے خیال میں گم رہتی- ہر وقت امیر زادے کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا رہتا اور اس کا دل کسی کام میں نہ لگتا- حورمحل کی ماں کو اس کی کیفیت معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہوئی- اس نے حورمحل کی دو سہیلیوں کو بلا کر سمجھایا کہ حورمحل آج کل کچھ سست اور بیمار ہے- اس کا دل بہلایا کریں اور اسے تنہا نہ چھوڑا کریں- سہیلیوں کو تو بہانہ چاہیے تھا وہ دونوں حورمحل کے ساتھ سائے کی طرح رہنے لگیں- دن بھر ہنسی مذاق سے حورمحل کا دل بہلاتیں اور رات کو اپنے گھر چلی جاتیں-

وہ شام بڑی اداس تھی- سورج کی پیلی کرنیں' بستی سے سمٹ کر درختوں کی چوٹیوں تک پہنچ چکی تھیں- حورمحل اپنی سہیلیوں کے ساتھ ناریل باغ آئی ہوئی تھی- سہیلیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں...... لیکن حورمحل کی نظریں اس راستے پر جمی ہوئی تھیں جدھر سے امیر زادہ واپس گیا تھا- اس راستے کو دیکھ کر اسے بڑا سکون ملتا تھا مگر آج اس کی طبیعت بہت بے چین تھی- حورمحل نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور بولی ''خدا خیر کرے- آج کچھ ہونے والا ہے-''

''حور! اگر تم اسی طرح کچھ دن اور گم صم رہیں تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو جائے گا-'' حورمحل کی ایک سہیلی نے ہنس کر کہا اور پھر تائید کے لیے دوسری سہیلی کی طرف دیکھا-

''خدا نہ کرے-'' دوسری سہیلی نے تائید کے بجائے سختی سے تردید کی- ''حورمحل بالکل ٹھیک ہے- اس کی طبیعت آہستہ آہستہ ٹھیک ہو رہی ہے-''

''مجھے کچھ نہیں ہوا- میں بالکل ٹھیک ہوں-'' حورمحل نے ایک طویل سانس لے کر کہا- ''آج موسم کا مزاج کچھ بگڑا ہوا نظر آتا ہے- مجھے ہوا کی سرگوشیوں میں چیخ و پکار سی محسوس ہو رہی ہے-''

''تو پھر واپس چلو-'' دوسری سہیلی نے رائے دی- ''ہو سکتا ہے کوئی بڑا طوفان آنے

والا ہو- ایسے وقت ہمیں اپنے گھروں میں ہونا چاہئے......"

"تو تم نے بھی حور محل کی بات کا یقین کر لیا-" پہلی سہیلی ناگواری سے بولی- "اس کا مطلب ہے کہ ہم حور محل کو نجومی سمجھ لیں-"

دونوں سہیلیوں میں نوک جھونک شروع ہوگئی- یہاں تک کہ سورج نے مغرب میں اپنا چہرہ چھپالیا اور تاریکی پھیل گئی- حور محل جوان کی بحث سے تنگ آ گئی تھی' اس نے انہیں زور سے ڈانٹ دیا- "بس خاموش ہو جاؤ- چلو' واپس چلیں کب تک لڑتی رہو گی' تم لوگ؟"

حور محل کی سہیلیاں ناراض ہونے کی بجائے ہنسنے لگیں- ایک نے شوخی سے کہا- "تمہارے خیال میں ہم لڑ رہی تھیں؟"

"اور لڑائی پھر کس طرح ہوتی ہے؟" حور محل کو غصہ آ گیا- "میرا دل کہہ رہا ہے کہ آج بستی پر کوئی آفت نازل ہونے والی ہے-"

سہیلیوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے ناریل باغ سے باہر آ گئیں- ابھی انہوں نے سبزہ زار میں قدم رکھا تھا کہ حور محل رک کر چلائی- "ادھر دیکھو وہ لوگ کون ہیں؟"

سہیلیاں بھی رک گئیں اور اس طرف دیکھنے لگیں جدھر حور محل نے اشارہ کیا تھا دور جنوب میں سینکڑوں مشعلیں جلتی دکھائی دے رہی تھیں- مشعلیں مسلسل بھڑک رہی تھیں جیسے کوئی انہیں گردش دے رہا ہو-

"کوئی برات معلوم ہوتی ہے" ایک سہیلی نے کہا مگر اس کا بدن کسی نامعلوم خوف سے کانپ اٹھا-

"اللہ خیر کرے-" دوسری ڈرتے ڈرتے بولی-

"یہ برات نہیں ہے-" حور محل مستقل مزاجی سے بولی- "بستی میں برات آنا ہوتی تو ہمیں ضرور معلوم ہوتا جلدی گھر چلو-"

اسی وقت ایک سوار گھوڑا بھاگتا ہوا ان کے قریب سے گزرا سبزہ زار میں تین لڑکیوں کو دیکھ کر اس نے گھوڑا روکا اور چیخ کر بولا۔ "بھاگ جاؤ" لڑکیو! چھپ جاؤ پرتگالی حملہ کرنے آ گئے ہیں۔"

پرتگالیوں کا نام سننا تھا کہ لڑکیوں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہ چیختی ہوئی بے تحاشا بستی کی طرف بھاگنے لگیں۔ بستی میں پہنچ کر ان کا رخ اپنے اپنے گھروں کی طرف ہو گیا۔ حور محل گھر پہنچی تو اس کی ماں اسے دیکھتے ہی وحشت زدہ انداز میں چیخیں۔ "چل بھاگ چل حور! ظالم پرتگالی یہاں تک آ پہنچے۔"

حور محل نے ماں کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "امی جان! ہوش سے کام لیجئے پھوپی اور پھوپھا کہاں ہیں؟"

"تو اپنی فکر کر۔ تیرے پھوپھا مردوں کے ساتھ پرتگالیوں کو روکنے گئے ہیں۔"

"پھوپی کہاں ہیں؟ انہیں تو ساتھ لے لیجئے۔"

"تو میرے ساتھ چل" حور محل کی ماں حور محل کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے بولیں۔ "پھوپی اپنی بچی کو ساتھ لے کر آ رہی ہیں۔"

حور محل نے جھٹکا دے کر ماں سے ہاتھ چھڑایا اور بھاگ کر گھر میں گھس گئی۔ اس کی پھوپھی اور پھوپھا آج دوپہر ہی ان سے ملنے ڈھاکہ سے آئے تھے۔ پھوپھی کی گود میں ڈیڑھ سال کی بچی تھی۔ حور محل نے اندر داخل ہوتے ہی پھوپھی کی گود سے بچی کو جھپٹ لیا اور چلا کر بولی۔ "خدا کے لیے جلدی سے باہر نکلیے پھوپھی جان! ظالموں نے حملہ کر دیا ہے اپنی جان بچایئے بچی کو میں سنبھال لوں گی۔"

حور محل کی پھوپھی مغل خاتون تھی۔ اس نے کمرے میں ٹنگی ہوئی ایک تلوار اتاری اور دروازے کی طرف بڑھی۔ بستی میں ہر طرف سوار ہی سوار دکھائی دے رہے تھے۔ حور محل

آگے بڑھنے کے بجائے قریب کی ایک گلی میں گھس گئی- وہاں سے دوسری اور پھر تیسری گلی میں داخل ہوئی-بستی پر قیامت ٹوٹی پڑ رہی تھی-عورتیں اور بچے چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے-بستی کے کچے مکان اور جھونپڑیاں شعلوں کی لپیٹ میں تھیں-

حور محل ننھی بچی کو سینے سے لگائے گرتی پڑتی بستی سے نکلی قریب ہی ناریل کے درخت اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں حور محل کا بچپن اس علاقے میں گزرا تھا وہ ہر جگہ سے واقف تھی وہ بھاگتی ہوئی پہاڑیوں میں داخل ہوگئی اور ایک جھکی ہوئی چٹان کے نیچے پہنچ کر دم لیا- اسے حیرانی تھی کہ بچی اب تک خاموش ہے- اس تمام وقت میں اس نے آواز تک نہ نکالی تھی- حور محل نے پلٹ کر بستی کی طرف دیکھا- اسے بستی کی جگہ دھواں اور لپکتے ہوئے شعلے دکھائی دیئے- اس کے سینے سے ایک آہ نکلی اور پھر آنسو بہہ بہہ کر دامن میں جذب ہونے لگے-

حور محل تو بچی کو لے کر نکل آئی' اسے اتنی مہلت نہ ملی کہ پلٹ کر پھوپھی کو دیکھتی- اس کی پھوپھی' تلوار ہاتھ میں لیے گھر سے نکلی تو آٹھ دس سوار' دروازے پر پہنچ چکے تھے- پرتگالی سواروں نے ایک جوان اور خوبصورت عورت کو دیکھ کر وحشیانہ انداز میں قہقہے بلند کیے اور فوراً اپنے گھوڑے دائیں بائیں گھما کر' مغل خاتون کو گھیرنے کی کوشش کی- مغل خاتون نے پلٹ کر گھر میں جانے کی کوشش کی مگر دو تین سوار دروازے پر پہنچ چکے تھے اور واپسی کا راستہ بند ہو چکا تھا- خاتون نے بڑی بے بسی سے چاروں طرف دیکھا- پرتگالی سواروں کی آنکھوں سے درندگی ٹپک رہی تھی-

اسی وقت نہ جانے کہاں سے پرتگالیوں کا سردار جرارو وہاں پہنچ گیا- اس نے ایک مغل خاتون کو اپنے سواروں کے درمیان گھرا دیکھا......تو چیخ کر حکم دیا- ''چھوڑ دو' اسے-''

پرتگالی سواروں نے فوراً اپنے گھوڑے پیچھے کر لیے- مغل خاتون نے تشکر آمیز نظروں سے راجر کی طرف دیکھا- راجر گھوڑے سے اتر کر اس کے قریب پہنچ گیا اور بولا- ''تم اندر

چلی جاؤ۔''

مغل خاتون اسے اپنا نجات دہندہ اور محسن سمجھ رہی تھی اس نے راجر کے حکم کی تعمیل کی اور لرزتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔ راجر اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مغل خاتون دروازے پر پہنچ کر رکی اور ایسی نظروں سے راجر کی طرف دیکھا جن میں ہزاروں احسان مندیاں بھری تھیں۔

''تم اطمینان سے اندر چلی جاؤ۔ تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا......'' راجر نے مسکرا کر ملائمت سے کہا۔

مغل خاتون کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی اور چاہا کہ دروازہ بند کر لے لیکن اس نے ابھی دروازے کے پٹ آدھے بند کیے تھے کہ راجر نے پوری قوت سے دروازے پر لات ماری۔ دروازے کے دونوں پٹ کھل کر مغل خاتون سے ٹکرائے۔ ایک پٹ اس کی پیشانی پر لگا اور اس کا سر چکرانے لگا۔ راجر جست لگا کر اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا...... باہر کھڑے ہوئے سوار وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے لگے۔

ایک گھنٹے کی قیامت خیز درندگی میں بستی کا کوئی گھر خاکستر ہونے سے نہ بچا۔ پرتگالیوں نے تمام قیمتی سامان اپنے گھوڑوں اور چھکڑوں پر لاد لیا اور پھر وہ جس تیزی سے آئے تھے' اسی تیزی سے بستی کو دھویں اور شعلوں میں گھرا چھوڑ کر نکل گئے۔ پوری بستی پر موت جیسا سناٹا چھا گیا۔

بستی کے بچے' عورتیں اور بوڑھے جو جان بچا کر پہاڑیوں میں جا چھپے تھے بہت دیر تک اپنی پناہ گاہوں میں پوشیدہ رہے...... پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ حملہ آور واپس جا چکے ہیں اور ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے تو وہ ایک ایک کر کے بستی میں واپس آنے لگے۔ اپنے لٹے اور جلے ہوئے مکانوں کو دیکھ کر وہ بلک اٹھے۔ بستی میں جا بجا ان نوجوانوں

کی لاشیں پڑی تھیں جو حملہ آوروں کو روکنے نکلے تھے۔ کئی جگہ وہ عورتیں اور بچے بھی پڑے سسک رہے تھے جو بھاگنے میں ناکام رہے تھے اور پرتگالیوں کے گھوڑوں کے سموں تلے آکر کچلے گئے تھے۔

دوسری طرف پرتگالی لٹیرے بستی سے کچھ دور جا کر ٹھہر گئے۔ تمام مال واسباب تو ان کے ہاتھ آ گیا تھا لیکن غلام بنانے کے لیے عورتیں اور بچے نہیں مل سکے تھے۔ پرتگالیوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ بنگال کے لوگ ہوشیار ہو گئے ہیں اور ان کے حملے کی خبر دم کے دم میں آبادیوں تک پہنچ جاتی ہے اور وہ لوگ حملے سے پہلے ہی آبادی سے نکل جاتے ہیں۔ اس لیے اس دفعہ راجر نے دہرے حملے کا منصوبہ بنایا تھا۔ پہلے تو اس نے یہ چالاکی کی تھی کہ ہگلی سے روانہ ہوتے وقت مشرق کا رخ کیا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ کئی میل نکل گیا تھا پھر وہ وہاں سے سیدھا شمال کی طرف چلا۔ اس دوران میں اس نے کسی بستی پر حملہ نہیں کیا اور لوگوں کو اطمینان ہو گیا کہ پرتگالی سوار کسی نامعلوم مقصد کے تحت ادھر ادھر چکر لگا رہے ہیں۔ راجر نے طے کر لیا تھا کہ وہ ڈھاکہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لے گا اور مغلوں کو وہاں سے نکال کر، بنگال میں ایک زبردست حکومت قائم کرے گا۔ اس سلسلے میں اس نے مگھ اور اراکان کی ریاستوں سے بھی رابطہ قائم کیا تھا لیکن راستے میں اس کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ بنگال کا گورنر قاسم خان بڑی زبردست فوجی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس لیے اس نے ڈھاکہ پر حملے کا ارادہ تبدیل کر دیا اور ڈھاکہ کے مضافات میں اس بستی پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔

حور محل بھی پناہ گاہ سے نکل کر بچی کو سینے سے لگائے بستی میں واپس آ گئی............اس کی ماں اس سے پہلے ہی گھر پہنچ کر اپنی نند کی لاش پر بین کر رہی تھیں۔ حور محل کا پھوپھا بھی بستی کے دوسرے جوانوں کے ساتھ، پرتگالیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ حور محل بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ پوری بستی میں کہرام مچا ہوا تھا اور ہر شخص اپنے کسی نہ کسی عزیز کو

رو رہا تھا۔

......اور پھر اسی عالم میں پرتگالیوں نے دوسرا حملہ کر دیا۔ دو سو سوار ایک دم بستی میں چاروں طرف سے داخل ہو گئے اور انہوں نے عورتوں اور نوعمر لڑکوں کو پکڑنا شروع کر دیا۔ بستی کے تمام جوان پہلے ہی مارے جا چکے تھے یا شدید زخمی حالت میں آخری سانسیں لے رہے تھے۔ پرتگالیوں کے مقابلے پر کوئی بھی نہ نکل سکا۔ عورتیں اور بچے چیختے چلاتے گرفتار ہوتے رہے کوئی بھاگنے کی کوشش کرتا تو رسی کا پھندا پھینک کر اسے گرفتار کر لیا جاتا۔

حور محل نے دیکھا کہ پرتگالی صرف جوان لڑکیوں' عورتوں......اور لڑکوں کو پکڑ رہے ہیں۔ اس نے بچی کو ماں کے حوالے کیا اور بھاگ کر ایک جلتے مکان میں گھس گئی۔ پرتگالیوں نے اسے بھاگتے دیکھ لیا اور چار سوار گھوڑے بھگاتے حور محل کے ساتھ ہی جلتے مکان میں داخل ہو گئے۔ حور محل وہاں سے نکل کر گلیوں میں بھاگنے لگی مگر وہ زیادہ دور نہ جا سکی......ایک پرتگالی سوار کی رسی کا پھندا جو حور محل کی گردن سے گزر کر اس کی کمر میں حلقہ بن گیا اور حور محل گر پڑی۔ سوار نے رسی کھینچ کر حور محل کے بال پکڑ لیے اور اسے گٹھڑی کی طرح اٹھا کر اپنے گھوڑے پر لاد لیا۔

اس دوسرے حملے میں بستی کی تمام لڑکیاں جوان عورتیں اور لڑکے پرتگالیوں کے ہاتھ آ گئے۔ پرتگالیوں کے اس حملے کا مقصد یہی تھا وہ تمام مال غنیمت اور اسیروں کو لے کر تیزی سے ہگلی کی طرف واپس ہو گئے۔

☆امیر زادہ عنایت اللہ خان کی عمر بندرہ سال ہو چکی تھی۔ اب وہ بڑے لڑکوں کے ساتھ تربیت گاہ کے دوسرے حصے میں رہتا تھا۔ جب وہ بنگال سے واپس آیا تو اسی وقت اس نے شاہجہاں اور ملکہ عالم کی قدم بوسی کی اجازت طلب کی کیونکہ بڑے لڑکوں کی تربیت گاہ میں ملکہ ہفتے میں ایک بار جاتی اور ایک ہی بار انہیں اپنے حضور طلب کرتی۔ بنگال کے

حالات سے شہنشاہ اور ملکہ دونوں کو خصوصیت سے دلچسپی تھی۔ امیر زادے نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ وہ بنگال میں پرتگالیوں کے ظلم وستم کے بارے میں اپنے باپ قاسم خان کا ایک پیغام، شہنشاہ اور ملکہ عالم کے گوش گزار کرنا چاہتا ہے۔

امیر زادے کی درخواست ایسی نہ تھی کہ اس پر غور نہ کیا جاتا مگر ۱۶۲۹ء کا سال سلطنت مغلیہ کے لیے بہت بھاری ثابت ہوا۔ بندیل کھنڈ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے شاہجہاں کو جنوری کے مہینے میں بہ نفس نفیس فوجوں کی کمان کرنی پڑی۔ اس وقت شاہجہاں کی آخری بیٹی پیدا ہونے والی تھی اور ملکہ عالم ممتاز محل کی طبیعت خراب رہتی تھی مگر حالات کی سنگینی کے پیش نظر، اسے ملکہ کو چھوڑ کر جانا پڑا۔ ملکہ کے لیے شہنشاہ کی یہ غیر حاضری بہت مضر ثابت ہوئی۔ شہنشاہ صرف بغاوت فرو کر کے چند ہفتوں بعد ہی واپس آ گیا لیکن اس دوران میں ملکہ کی حالت کافی بگڑ چکی تھی۔ شاہجہاں نے ملکہ کی تمام مصروفیات اور ملاقاتوں پر پابندی لگا دی اور حکم دیا کہ ملکہ کو بھیجی جانے والی تمام درخواستیں اسے پیش کی جایا کریں امیر زادے کی درخواست بھی شاہجہاں کو پیش کی گئی جس پر شاہجہاں نے حکم لکھا کہ اسے ملکہ عالم کی صحت یابی کے بعد دوبارہ پیش کیا جائے۔

ملکہ کی بیماری کی وجہ سے شاہجہاں نے بھی درباری...... اور انتظامی کاموں میں عدم توجہی شروع کر دی تھی وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ملکہ ممتاز محل کے قریب گزار رہا تھا۔ زچگی کے دن قریب تھے، ملکہ کے کمرے میں ہر وقت دو چار دائیاں موجود رہتی تھیں۔ شاہی طبیب کو بھی قلعے ہی میں قیام کا حکم تھا۔ ممتاز محل کی یہ آٹھویں اولاد تھی۔ اس سے پہلے اس کے چار بیٹے دارا، شجاع، مراد اور اورنگ زیب اور تین بیٹیاں انجمن آرا، گیتی آرا اور جہاں آرا تھیں..... لیکن اتنی نقاہت اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس پر ہر وقت غشی سی طاری رہتی۔ ایک شام اس کی طبیعت کچھ ٹھیک تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اطراف میں نظریں دوڑائیں۔

کنیزیں اور دائیاں سمٹ کر اس کے قریب آ گئیں۔ ''شہنشاہ......!'' اس نے کمزور آواز میں کہا۔

کنیزوں نے دوڑ کر اطلاع دی اور شہنشاہ چند لمحوں میں اپنی ملکہ کے بستر کے قریب پہنچ گیا۔

''ممتاز! آنکھیں کھولو۔ ہم تمہارے قریب ہیں'' شاہجہاں نے ملکہ کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

ملکہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی نحیف آواز میں بولی۔ ''شہنشاہ عالم! آپ میری نظروں کے سامنے رہا کیجئے۔ کیا خبر کس وقت یہ آنکھیں بند ہو جائیں۔''

''جان شاہجہاں!'' شہنشاہ نے بڑے پیار سے کہا۔ ''ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ خدا جلد صحت دے گا۔''

''شہنشاہ! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کسی کنیز کو بلوایئے میں سہارے سے بیٹھ کر آج آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ میری آخری گفتگو ہو۔''

شاہجہاں پریشان ہو گیا۔ اس نے جھک کر ملکہ کے چہرے کو دیکھا اور بولا۔ ''ممتاز محل! تم ملکہ عالم ہو تم میں دوسری عورتوں سے زیادہ حوصلہ ہونا چاہئے۔'' یہ کہتے ہوئے شاہجہاں نے خود ہی ملکہ کو سہارا دے کر تکیوں سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور نرمی سے بولا۔ ''خدائے ذوالجلال نے تمہیں سات آفتاب و ماہتاب جیسے بچے بچیاں عطا کی ہیں۔ وہی تمہاری یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔''

''شہنشاہ نے خود میری خواہش کا اظہار کر دیا ہے۔'' ملکہ سنبھل کر بولی۔ ''میں اپنے بچوں کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

شہنشاہ کی پریشانی بڑھ گئی- اس نے آہستہ سے تالی بجائی- کنیزیں باہر راہداری میں گوش برآواز تھیں- تالی کی آواز پر ملکہ کی خاص کنیز فوراً اندر داخل ہوئی اور جھک کر آداب بجا لائی-

"شہزادوں اور شہزادیوں کو اطلاع دی جائے کہ وہ فوراً ملکہ عالم کے سلام کو حاضر ہوں"

شہنشاہ کے حکم کی فوراً تعمیل ہوئی- شہزادیاں تو پہلے ہی سے محل میں موجود تھیں' شہزادے بھی ملکہ عالم کی بیماری کی خبر پا کر پہنچ گئے- ملکہ کے بستر کے ایک طرف شہزادی انجمن آرا' گیتی آرا' جہاں آرا اور دوسری طرف دارا شکوہ' شاہ شجاع' مراد بخش اور اورنگ زیب' ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑے ہو گئے- تمام اولاد کو سامنے دیکھ کر ملکہ کے چہرے پر کچھ بحالی اور بشاشت آ گئی- اسے خوش دیکھ کر شہنشاہ کو بڑا اطمینان ہوا-

ملکہ نے بڑے بیٹے شہزادہ دارالشکوہ کو مخاطب کیا- "شکوہ! تم بھائیوں میں سب سے بڑے ہو- میں چاہتی ہوں کہ میرے بعد میری ممتا کے تم امین بنو اور اپنے بھائی بہنوں کو میری کمی محسوس نہ ہونے دو-"

یہ سن کر تمام شہزادیاں اور شہزادے جو ماں کی بیماری سے پہلے ہی پریشان تھے' اپنا غم ضبط نہ کر سکے......اور سسکیاں بھرنے لگے......دارالشکوہ اور اورنگ زیب کے تو آنسو چھلک پڑے اورنگ زیب نے آنسو پوچھتے ہوئے کہا-

"امی حضور! آپ کی باتوں سے میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے- خدا کے لیے ایسا نہ کہیے مجھے معلوم ہے کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے لیکن اس کا ایک وقت مقرر ہے- میری خدا سے التجا ہے کہ وہ منحوس وقت میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں-"

ملکہ نے ہاتھ اٹھا کر شہزادے کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر آہستہ سے بولی- "شہنشاہوں کے بیٹے اس طرح نہیں سوچا کرتے......اورنگ زیب! تمہارے باپ نے جن

مشکلات اور جان لیوا پریشانیوں کا سامنا کر کے یہ تخت و تاج حاصل کیا ہے اس میں تم سب کو چار چاند لگانے ہیں۔"

"امی حضور......" دارالشکوہ نے دخل دیا۔ "آپ اپنی طبیعت سنبھالیں اور مستقبل کی فکر نہ کریں۔ ابا حضور کی سلطنت انشا اللہ...... دن دونی رات چوگنی بڑھتی اور وسیع ہوتی رہے گی اور اگر میرے بھائیوں نے میرا ساتھ دیا تو آپ اپنی زندگی ہی میں دیکھیں گی...... کہ سلطنت مغلیہ کی سرحدیں کہاں سے کہاں تک پہنچتی ہیں۔"

"برادر بزرگ شہزادہ دارالشکوہ نے درست فرمایا ہے امی حضور!" اورنگ زیب نے بڑے سکون سے کہا۔ "شہنشاہ حضور نے ہم بھائیوں کو تربیت جس انداز سے دلائی ہے اور ان کے زیر سایہ ہم نے جہانداری اور جہانبانی کے جو گر سیکھے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شہزادہ اپنی اہلیت اور فراست سے حسب توفیق شاہی مراعات...... اور الطاف حاصل کرے گا۔"

شاہجہاں نے چونک کر اورنگ زیب کو دیکھا دارالشکوہ بڑا بیٹا تھا اور شاہجہاں کا جھکاؤ بھی اسی کی طرف تھا مگر اورنگ زیب نے اہلیت اور فراست کا سہارا لے کر جو بات کہی تھی، اس سے شہنشاہ اور دارالشکوہ، دونوں کے خیالات کی تردید ہوتی تھی۔ دارالشکوہ کو بھی بھائی کی بات ناگوار گزری لیکن وہ شہنشاہ کی موجودگی کی وجہ سے خاموش رہا۔

شاہجہاں نے تیز نظروں سے اورنگ زیب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "محی الدین! تم لوگ اپنی امی حضور کی قدم بوسی اور مزاج پرسی کو آئے ہو یا اپنی قابلیت کا سکہ جمانے اور فراست کا ڈنکا پیٹنے آئے ہو...... واضح رہے، ہم اس قسم کی گفتگو پسند نہیں کرتے۔"

شاہجہاں کے لہجے کی تلخی اور ترشی سے دارالشکوہ بہت خوش ہوا مگر ملکہ نے مسکرا کر بات سنبھالی۔ "میرے سرتاج! ہمیں شکر کرنا چاہیئے کہ ہمارے چاروں بیٹے ایک ہی ماں کی اولاد

ہیں اور ہمیں امید کرنی چاہیے کہ سب شہزادے ہمارے بعد ایک دوسرے کے حفظ مراتب کا خیال رکھیں گے۔''

شاہجہاں کی طبیعت محی الدین اورنگ زیب کی باتوں سے مکدر ہوگئی تھی۔ اسے علم تھا کہ دارالشکوہ بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر بھی ہے لیکن اورنگ زیب کی دور اندیشی اور فراست سے وہ غیر مطمئن بلکہ قدرے خائف بھی تھا۔ اس نے شہزادوں کو جلدی ہی رخصت کر دیا۔ پھر شہزادیوں سے مخاطب ہوا۔'' ہمارا خیال ہے کہ ملکہ مادر تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہیں۔ اب تم بھی واپس جاؤ اور امی حضور کی صحت یابی کی دعا کرو۔''

شہزادیاں رعب شاہی کی وجہ سے زبان نہ کھول سکیں۔ حالانکہ ماں کی حالت دیکھ کر انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ اب وہ چراغ سحری ہے جو کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے وہ چپ چاپ آنسو پونچھتی، کمرے سے نکل گئیں۔

''ممتاز! اب کیا حال ہے تمہارا؟'' شاہجہاں نے ملکہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''میں پہلے سے بہتر محسوس کر رہی ہوں سرتاج!'' ملکہ نے آہستہ سے کہا۔'' اگر شہنشاہ میرے دوسرے بچوں کو بھی مجھ سے ملوا دیں تو اور زیادہ بہتر محسوس کروں گی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو، ممتاز؟'' شاہجہاں نے حیرت سے کہا۔'' کیا تم چاہتی ہو کہ امیرزادوں کی پوری فوج کو تمہارے سامنے پیش کیا جائے؟ اس مجمع سے تمہاری صحت پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ شاہی طبیب اور دائیاں تمہیں آرام کا مشورہ دے رہی ہیں۔''

ملکہ نے کوئی جواب نہ دیا...... اور آنکھیں بند کر لیں۔

شاہجہاں سمجھ گیا کہ ملکہ کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ اس نے فوراً نرم لہجے میں جواب دیا۔'' ممتاز تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے بنگال کے گورنر کے بیٹے کو ڈھاکہ جانے کی اجازت دی تھی۔''

ملکہ نے آنکھیں کھول دیں اور دلچسپی سے پوچھا- ''شہنشاہ کا اشارہ امیر زادہ عنایت ںمدخان کی طرف تو نہیں؟''

''ہاں...... وہ اپنے باپ سے مل کر واپس آ گیا ہے- تم جانتی ہو کہ ہم نے طبیب کی ایت کے تحت' لوگوں کو تمہاری قدم بوسی سے روک دیا ہے- امیر زادے نے ہمیں رخواست دی تھی کہ وہ اپنے باپ کا ایک خاص پیغام ہمیں اور تمہیں پہنچانا چاہتا ہے- ہم نے ں کی درخواست کو تمہاری صحت یابی تک روک لیا ہے-''

''بنگال سے تو ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں-'' ملکہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا-

''ہاں' ممتاز! وہ سخت دن ہم کیسے بھول سکتے ہیں-'' شاہجہاں نے بڑے دکھ سے کہا- 'کس قدر بے سروسامانی کا عالم تھا- ہم جس کو اپنا دوست سمجھتے تھے وہی دشمنی پر آمادہ ہو جاتا ما- بنگال کے پرتگالیوں نے ہمیں کھلا دھوکا دیا تھا-''

''شہنشاہ! میں آپ کے ملکی معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتی لیکن پرتگالیوں کے رے میں ایک بار میں نے آپ سے درخواست کی تھی مگر......'' ملکہ کہتے کہتے رک گئی جیسے سے شاہجہاں کو الزام دیتے ہوئے دکھ محسوس ہو رہا ہو-

''ہمیں افسوس ہے ممتاز!'' شاہجہاں نے شرمندگی سے کہا- ''ہم تمہارے مجرم ہیں- نہاری درخواست پر اب تک توجہ نہیں دے سکے- ہمیں معلوم ہے کہ پرتگالیوں نے ہمیں مدد کا فریب دیا تھا اور......''

''جی ہاں' میرے سرتاج!'' ممتاز محل بیچ میں بول پڑی- ''وہ ظالم' ہماری تمام کشتیاں لے کر بھاگ گئے تھے- ان کشتیوں میں ہماری دو محبوب کنیزیں بھی تھیں خدا معلوم اِن ریبوں پر کیا بیتی؟''

''فکر نہ کرو' ممتاز! ہم انہیں پوری سزا دیں گے-'' شاہجہاں نے فیصلہ کن لہجے میں

کہا۔ ''وہ مفسد اور فتنہ پرواز ہیں۔ ہماری تاج پوشی کے وقت بھی نہ ان کی طرف سے نذر پیش ہوئی اور نہ مبارک باد کا پیغام آیا۔ امیر زادے نے درخواست میں یہ بھی لکھا ہے کہ پرتگالیوں نے ان دنوں بنگال کے ساحلی علاقوں میں ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ رعایا کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔''

''شہنشاہ مناسب سمجھیں تو امیر زادے کو طلب فرمائیں'' ملکہ نے درخواست کی۔ ''میں اس کی زبانی وہاں کے حالات سننا چاہتی ہوں۔''

شاہجہاں چند لمحوں تک سوچتا رہا پھر اس نے کنیز کو بلا کر امیر زادے کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ امیر زادہ' ملکہ کی قدم بوسی کی طرف سے ناامید ہو چکا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ملکہ کی طبیعت ناساز ہے اور ان سے کسی کو بھی ملنے کی اجازت نہیں۔ اسے اس اچانک طلبی سے بہت خوشی ہوئی۔ وہ خواجہ سرا کے ساتھ شہنشاہ اور ملکہ کے حضور میں پہنچا...... اور جھک کر آداب بجا لایا۔

اس دوران میں ملکہ کو پھر لٹا دیا گیا تھا۔ ملکہ نے اشارے سے امیر زادے کا سلام قبول کیا پھر ہونٹوں پر تبسم لاتے ہوئے کہا ''عنایت امید ہے تم نے والدین کے ساتھ اچھا وقت گزارا ہوگا اور اپنی منگیتر سے بھی ملے ہو گے۔''

امیر زادے نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ شہنشاہ نے مسکرا کر ملکہ کو دیکھا ''کیا اس کی کہیں منگنی ہوئی ہے؟''

''اے تاجدار......'' ملکہ نے محبت سے کہا۔ ''یہ ماں بیٹے کا ذاتی معاملہ ہے۔ شاہی حکم کے مطابق شادی سے قبل میں شہنشاہ کی رضامندی ضرور حاصل کروں گی۔''

''ٹھیک ہے' ممتاز! ہم نے اعتراض نہیں کیا ہے'' شاہجہاں نے جواب دیا پھر امیر زادے سے پوچھا۔ ''ہمارے گورنر نے پرتگالیوں کے سلسلے میں کیا پیغام بھیجا ہے؟''

''شہنشاہ حضور......'' امیرزادے نے سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ ''پرتگالیوں نے نئی قلعہ
ریاں کر لی ہیں۔ انہوں نے اپنے طور پر جہازوں پر ٹیکس عائد کیا ہے جس کی تمام رقم وہ خود
ضم کر جاتے ہیں نمک کی تجارت پر ان کی اجارہ داری ہے۔ بحری قزاقوں......اور ڈاکوؤں
ں وہ سرپرستی کرتے ہیں یہ لوگ پرتگالی سواروں کے ساتھ دور دور تک لوٹ مار کرتے ہیں۔
وں عورتوں اور جوانوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں' انہیں غلام بناتے ہیں یا فروخت کر دیتے
ں......وہ لوگوں کے مذہب بھی زبردستی تبدیل کر رہے ہیں۔''

شاہجہاں کا چہرہ جلال سے سرخ ہو گیا اور وہ مارے غصے کے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ امیر
ادے کا خون خشک ہوا جا رہا تھا اور ملکہ کی نظریں شاہجہاں کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھیں۔

شہنشاہ نے رک کر ملکہ کو دیکھا اور بولا۔ ''ممتاز! اگر تمہاری صحت ٹھیک ہوتی تو ہم اسی
قت بنگال کا قصد کرتے...... بہرحال پرتگالیوں کا خاتمہ اب ضروری ہو گیا ہے۔'' پھر اس
نے پلٹ کر امیرزادے سے کہا۔ ''تم آج ہی بنگال روانہ ہو جاؤ۔ قاسم خان سے کہو...... کہ
م ہگلی میں ایک پرتگالی کو بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ قاسم خان حملے کی تیاری کرے۔ ہم سوار
ج اور جنگی کشتیاں بھیج رہے ہیں۔''

''ممتاز اپنے شہنشاہ اور سرتاج کی شکر گزار ہے۔'' ملکہ نے مسکرانے کی کوشش کی پھر
ں نے امیرزادے سے کہا۔ ''عنایت خان! تم نے شہنشاہ کے زیرسایہ جو تربیت حاصل کی
ہے' اس کے اظہار کا وقت آ گیا ہے۔ تم باپ کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہو کر داد شجاعت
ینا۔ پرتگالیوں کے خاتمے کے بعد' ہم شہنشاہ سے سفارش کریں گے کہ تمہیں اپنی منگیتر سے
ادی کرنے کی اجازت دے دی جائے۔''

''ممتاز! تمہاری خاطر ہمیں ہر شرط منظور ہے۔'' ملکہ کی باتوں نے شہنشاہ کا غصہ کم کر دیا
ھا۔ ''ہم امیرزادے کو نہ صرف شادی کی اجازت دیتے ہیں بلکہ قاسم خان کے ساتھ رہنے

کی اجازت بھی دی جاتی ہے تاکہ دونوں باپ بیٹا پرتگالیوں کے فتنے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔"

امیرزادے کا دل خوشی سے اچھلنے لگا اور حورمحل کا پیکر ایک کوندے کی طرح اس کی آنکھوں میں لپک کر رہ گیا۔ اس نے ملکہ اور شہنشاہ کو رخصتی سلام کیا اور الٹے پیروں کمرے سے نکل گیا۔ امیرزادے کے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی تھی کہ شہنشاہ نے اسے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا تھا۔ اسے شادی کرنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ اس کے پیر زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ اس نے واپس آتے ہی سفر کی تیاریاں شروع کر دیں...... اور رات ہوتے ہوتے امیرزادہ ایک بار پھر بنگال کی طرف جا رہا تھا۔ پچاس محافظ اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

امیرزادہ ابھی بنگال کے راستے ہی میں تھا کہ قلعہ آگرہ پر غم واندوہ کے بادل چھانے لگے۔ امیرزادے کو گئے تیسری شب تھی۔ ملکہ کی حالت بظاہر اچھی نظر آ رہی تھی۔ شاہجہاں نے اس کی طرف سے مطمئن ہو کر دربار لگانا شروع کر دیا تھا۔ اپنے اعلان کے مطابق اس نے قاسم خان کو کمک بھیجنے کے انتظامات کا حکم دیا تھا۔ سواروں اور جنگی کشتیوں کی تعداد اور تفصیل مرتب ہو رہی تھی۔ شاہجہاں کا دن کا زیادہ وقت ملکہ کے قریب گزرتا تھا اور وہ رات کے وقت دربار لگاتا تھا۔

شام کے وقت جب شاہجہاں ملکہ کے پاس سے اٹھ کر گیا تھا تو ملکہ بہت مسرور نظر آ رہی تھی...... مگر شہنشاہ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد اس کی طبیعت ایک دم بگڑنا شروع ہو گئی وہ وحشت زدہ سی تھی۔ شاہی دائیاں اس کے گرد جمع تھیں۔ یکایک ملکہ اپنے بستر پر اچھل پڑی۔ "تم نے...... تم نے کچھ سنا؟" ملکہ وحشیانہ انداز میں چیخی۔

"ملکہ عالم! خدا کے لیے دل کو سنبھالیے" دائیاں ہاتھ جوڑ کر خوشامد کرنے لگیں۔

''سنو..... سنو، یہ آواز سنو جو میں سن رہی ہوں۔'' ملکہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بچے کے رونے کی آواز نہیں سن رہی ہو؟''

دائیاؤں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا اور وہ ایک دوسرے کے منہ دیکھ کر رہ گئیں۔

''تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟'' ملکہ چیخی۔ تم سب گونگی اور بہری کیوں ہو گئیں؟ میرا بچہ میرے شکم میں رو رہا ہے۔ تمہیں کوئی آواز سنائی نہیں دیتی؟''

''حوصلہ کیجئے، ملکہ عالم!'' دائی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

''حوصلہ.....'' ملکہ دیوانوں کی طرح بولی۔ ''بچہ ماں کے پیٹ میں روئے تو اس کا کیا انجام ہوتا ہے، تم سب اچھی طرح جانتی ہو۔ تم بھی رونے کی آواز سن رہی ہو لیکن مجھ سے چھپا رہی ہو..... مجھے معلوم ہے اب میں زندہ نہیں بچوں گی۔ جاؤ شہنشاہ کو بلاؤ میرے سرتاج کو اطلاع دو کہ ان کی چہیتی بیوی انہیں چھوڑ کر جا رہی ہے جاؤ، جلدی جاؤ۔''

☆☆☆

اسلام میں شگون یا تو ہم پرستی کی کوئی گنجائش نہیں لیکن برصغیر میں آنے کے بعد مسلمانوں نے ہندو مذہب کی بہت سی رسوم اختیار کر لیں اور وسوسوں اور وہم پرستی میں گرفتار ہو گئے۔ ہندوؤں میں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کسی خاتون کے شکم میں بچہ سسکنے یا رونے لگے تو وہ زچہ زندہ نہیں بچتی۔ ہم جانتے ہیں کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ بچے کی پیدائش کے وقت اکثر خواتین انتقال کر جاتی ہیں لیکن ہندوؤں نے اسے شکم مادر میں بچے کے رونے کی نحوست سے تعبیر کر دیا اور یہ وہم مسلمان گھرانوں میں بھی پھیل گیا۔ ممتاز محل کے خیالات بھی محض وہم کا نتیجہ تھے۔

مغل شہنشاہ اپنا دربار خاص لگائے وزیروں اور سرداروں سے دکن اور بنگال کے سلسلے میں اہم صلاح و مشورے کر رہا تھا کہ ملکہ کی کنیز ہانپتی، کانپتی دربار میں داخل ہوئی۔ اسے

اس عالم میں دیکھ کر درباریوں اور شہنشاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ سمجھے کہ خدانخواستہ ملکہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ شاہجہاں کا چہرہ سفید ہو گیا...... وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا...... اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''کنیز! اپنے شہنشاہ کو دکھ نہ دینا۔ صرف یہ بتا کہ ملکہ اس وقت زندہ ہیں۔''

''زندہ ہیں عالیجاہ! ملکہ عالم زندہ ہیں لیکن......'' کنیز نے ابھی جملہ مکمل نہ کیا تھا کہ شاہجہاں اچھل کر تخت سے اترا اور بھاگتا ہوا دربار سے نکل گیا۔

شاہجہاں بدحواسی کے عالم میں ممتاز محل کے پاس پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ملکہ دونوں ہاتھ بستر پر پٹخ رہی ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے رہی ہے۔ شاہجہاں نے تخلیے کا اشارہ کیا۔ کنیزیں اور دائیاں فوراً باہر چلی گئیں۔ شاہجہاں نے محبت سے ملکہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ملکہ نے مایوسی سے شہنشاہ کو دیکھا پھر سسکی لے کر ایک رباعی پڑھی جس کا مطلب تھا۔

''آج ہماری جدائی کی گھڑی آ پہنچی ہے
کیونکہ مصیبت اور جدائی کا باہم اتفاق ہو گیا ہے
اے میرے محبوب کی آنکھ' تو خون کے آنسو بہا
کیونکہ اب ہمارے بچھڑنے کا وقت آ گیا ہے''

اس رباعی کے مصرعے' شاہجہاں کے دل میں خنجر کی نوک کی طرح اترتے چلے گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح ملکہ کی دلداری کرے...... ملکہ کو شاید اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''اے بادشاہ! جب شکم مادر میں بچہ رونے لگے تو وہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ ماں کی کوکھ ممتا کے سوتوں سے خالی ہو رہی ہے۔ اب اس سے دودھ کی دھاریں نہیں پھوٹیں گی اور نہ محبت کے شگوفے کھلیں گے۔ اے بادشاہ! ہمارا کہا سنا معاف کیجئے اور ہم سے جو غلطی

ہوگئی ہو اسے بخش دیجئے کیونکہ ہم عنقریب سفرآخرت پر روانہ ہونے والے ہیں۔"

ملکہ کی باتوں سے شاہجہاں کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہورہا تھا آخر اس نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔"اے جان شاہ سے زیادہ عزیز ملکہ! انسان کو وسوسے اور توہمات گھیر لیتے ہیں تو شیطان عقل وخرد پر قبضہ کرلیتا ہے۔تم فضل خداوندی سے صاحب فراست ہو۔کسی وہم کو دل میں جگہ مت دو اور اپنے ہمارے حال پر رحم کرو۔"

ملکہ کو شاہ کی تسلیوں اور تشفیوں سے ذرا بھی اطمینان نہ ہوا۔اس نے کہا۔"اے بادشاہ! میں نے قید والم اور برے دنوں میں آپ کا ساتھ دیا اور اب جبکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہی اور جہاں کی فرماں روائی عطا کی ہے تو ہم حسرت ویاس کے ساتھ انتقال کررہے ہیں ہم آپ کو صرف دو وصیتیں کرتے ہیں، صرف دو وصیتیں اور امید کرتے ہیں کہ آپ ان دونوں وصیتوں کو منظور فرمائیں گے۔"

شاہجہاں نے ملکہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا......"ملکہ! تمہارا حکم سر آنکھوں پر تم ہزار وصیتیں کرو۔شاہجہاں......ان پر عمل کرنے کا عہد کرتا ہے۔"

ملکہ نے کہا۔"اے شاہ! اللہ نے آپ کو چاند جیسی اولاد عطا کی ہے یہ اولاد ہمارا نام زندہ رکھے گی۔ہم چاہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کوئی دوسری نسل کسی اور سے پیدا ہو اور وہ دونوں آپس میں نبرد آزما ہیں جس سے شاہ کی زندگی اجیرن اور میری روح بے چین ہو۔"

شاہجہاں نے فوراً کہا۔"جان شاہ! مطمئن رہو۔شاہجہاں تمہارا حکم پیش نظر رکھے گا"

ملکہ نے سکون کی سانس لی اور بولی۔"ہماری دوسری وصیت یہ ہے کہ ہمارے لیے ایک ایسا مکان تعمیر کیا جائے جو بے مثال صناعی اور کاری گری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہو۔"

شہنشاہ نے آہ بھرتے ہوئے اس وصیت کی تکمیل کا بھی عہد کیا۔شاہجہاں اور ملکہ کے درمیان یہ گفتگو جو تاریخ کا حصہ بنی آخری گفتگو تھی اسی شب ملکہ نے اپنی آخری بیٹی دہر آرا

بیگم کو جنم دیا اور اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے منہ موڑ لیا۔

شاہجہاں پر اپنی محبوب ملکہ کی وفات کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے دربار جانا بند کر دیا۔ ممتا
محل کی وفات نے شاہجہاں کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی اسے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ بال بڑ
گئے، کپڑے گندے ہو گئے بیٹے، بیٹیاں، امرا، وزرا جاتے اور گھنٹوں ہاتھ باندھے کھڑ
رہتے لیکن شاہجہاں ان سے کلام نہ کرتا، ہر وقت کھویا کھویا رہتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے
میں گھورتا رہتا۔ ملکی معاملات میں ابتری پیدا ہو گئی، دشمنوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ بڑ
مشکل سے شاہجہاں کو حالات سے آگاہ کر کے کاروبار سلطنت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اس
صورت بھی ممتاز محل کی وصیت سے نکالی گئی۔

ملکہ نے اپنے لیے ایک بے مثال مکان کی وصیت کی تھی۔ وزرا نے اس وصیت سے
فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے شہنشاہ کو ملکہ کی وصیت یاد دلائی۔ شاہجہاں پر اس کا خاطر خواہ ا
ہوا۔ اس نے مہندسوں نقشہ نویسوں اور انجینیر وں کو طلب کر لیا اور ان سے ملکہ کی فرمائش
پوری کرنے کے لیے اپنے ذہن میں ابھرتی ہوئی ایک عمارت کا تصور پیش کیا۔ اس بہا
شاہجہاں ایک بار پھر اس دنیا میں واپس آ گیا اور روزمرہ کے معمولات میں دلچسپی لینے لگا۔

ادھر بنگال میں ڈھاکہ کے مضافات میں پرتگالیوں نے جو خونیں ڈرامہ کھیلا تھا اس
نے ڈھاکہ میں طوفان برپا کر دیا۔ لوگوں نے کھلم کھلا مظاہرے شروع کر دیے تھے۔ اس
حادثے میں بنگال کے گورنر قاسم خان کی بہو اغوا ہوئی تھی اور بہن بہنوئی مارے گئے تھے۔
قاسم خان نے اس اندوہناک واقعے کی تفصیل، قلعہ آگرہ کو لکھ بھیجی تھی لیکن آگرہ میں ملکہ
ممتاز محل کی وفات بھی ایک اہم حادثہ تھی جس نے شاہجہاں کے دماغ کو مختل اور امرا و وزرا کو
ایک مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ان حالات میں بنگال کے گورنر کو کمک کون بھیجتا۔ امیر زاد
عنایت، باپ کے پاس پہنچ چکا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے ملکہ کی وفات کی خبر بھی پہنچ گئی تھی۔

بنگال کے لوگ، پرتگالیوں سے انتقام کا مطالبہ کررہے تھے- ملکہ کی وفات کی خبر سے ان کے دلوں میں غصے کے ساتھ غم بھی بھر گیا-

ہگلی کے پرتگالی اس حملے کی فتح کا جشن منارہے تھے- پرتگالی سردار راجر کو مبارکیں دی جارہی تھیں- راجر کا یہ پہلا حملہ تھا جو اس نے ڈھاکہ کے مضافات پر کیا تھا- اس حملے میں دولت کے علاوہ سینکڑوں کی تعداد میں لونڈیاں اور غلام بچے ان کے ہاتھ آئے تھے- جنہیں ہگلی کے بازار میں فروخت کر دیا گیا-

ان عورتوں میں قاسم خان کی ہونے والی بہو حور محل بھی تھی- حور محل زیادہ تعلیم یافتہ تو نہ تھی لیکن خدا نے اسے بڑا ذہن اور عقل مند بنایا تھا- جب عورتوں کی نیلامی شروع ہوئی تو اس نے اپنے چہرے کو کچھ اس طرح بگاڑ لیا کہ اس کا حسن بظاہر معدوم ہو گیا اور وہ پھٹے حال ایک معمولی لڑکی نظر آنے لگی- وہ دیکھ رہی تھی کہ خوبصورت لڑکیوں کو امیر خرید رہے تھے اور بدصورت لڑکیاں معمولی قیمت پر کم درجہ لوگوں کے ہاتھ فروخت ہو رہی ہیں- وہ چاہتی تھی کہ کسی غریب کے ہاتھ فروخت ہو تا کہ کسی صورت اس کے پنجے سے آزاد ہو سکے-

غلاموں اور لونڈیوں کے اس بازار میں پرتگالی سردار راجر کا مخالف افانسو بھی موجود تھا- اسے راجر کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی اور وہ کسی مناسب وقت کے انتظار میں گوشہ نشینی اختیار کیے ہوئے تھا- راجر کے ساتھیوں نے اسے بازار میں دیکھا تو اس کا خوب مضحکہ اڑایا- افانسو سینے پر پتھر رکھے ان کے طعنے طشنے برداشت کرتا رہا اور ان کے ساتھ مل کر ہنستا رہا لیکن دراصل اس کی نظریں حور محل پر لگی ہوئی تھیں- اگرچہ حور محل نے اپنا حلیہ بگاڑ لیا تھا اور سکڑی سمٹی کھڑی تھی لیکن افانسو نے فوراً پہچان لیا تھا کہ وہ کوئی مغل لڑکی ہے جو خود کو پرتگالیوں کی نظروں سے بچا رہی ہے- افانسو ٹہلتا ہوا، حور محل کے پاس گیا اور سرگوشی میں بولا-

"مغل لڑکی! گھبرانا نہیں- میں تمہارا دوست ہوں اور تمہیں اس مصیبت سے نجات

دلاؤں گا۔"

حورمحل نے ادھیڑ عمر کے پرتگالی کو حیرت اور خوف سے دیکھا...... پھر نظریں جھکالیں۔
جب حورمحل کی بولی کا نمبر آیا تو افانسو تیز تیز قدموں سے نیلام کرنے والے کے پاس پہنچا اور بڑی لجاجت سے بولا۔ "یہ لڑکی' میں اپنی خدمت کے لیے خریدنا چاہتا ہوں۔تم جو قیمت مقرر کرو گے' وہ میں ادا کردوں گا۔"

نیلام کرنے والا افانسو کو جانتا تھا۔ اس نے ایک نظر حورمحل پر ڈالی پھر پلٹ کر بڑے تمسخر سے بولا۔ "بوڑھے افانسو! ہمارے سردار نے اب تک اس فتح کا صدقہ ادا نہیں کیا۔ میں اپنے بہادر سردار راجر کی طرف سے تمہیں یہ لڑکی صدقے میں دیتا ہوں۔" پھر اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور اس قہقہے میں تمام خریدار شامل ہو گئے۔ افانسو نے بھی انہیں خوش کرنے کے لیے دانت نکال دیے اور جھک کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

حورمحل کو بغیر کسی قیمت کے افانسو کے حوالے کر دیا گیا۔ افانسو نے بڑھ کر حورمحل کو زنجیروں سے آزاد کیا...... اور اسے گھسیٹتا ہوا بازار سے نکال لے گیا۔

افانسو نے گھر پہنچ کر حورمحل کو کھانا کھلایا اور اسے پہننے کے لیے دوسرے کپڑے دیے۔ حورمحل گم صم تھی۔ اس نے افانسو کی باتیں سن لی تھیں لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ افانسو اس پر مہربانی کیوں کرنا چاہتا ہے۔ افانسو اس کی کش مکش کو بھانپ گیا اور بولا۔ "مجھ سے بالکل خوف نہ کھاؤ۔ تم میری بیٹی ہو۔"

حورمحل نے اسے حیرانی سے دیکھا اور بولی۔ "میں آپ کو نہیں جانتی لیکن بہرحال اب آپ میرے آقا ہیں میں آپ کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گی۔"

"میری خدمت......" افانسو نے ایک طویل سانس لی۔ "بیٹی! تم' میرے درد سے واقف نہیں ہو۔ میرا بھی ایک ہنستا بستا گھر تھا' نوکر چاکر تھے' خدمت گزار بیوی تھی۔ چار بیٹے

اور ایک تمہاری عمر کی پیاری سی بیٹی تھی مگر......'' افانسو پر رقت طاری ہوگئی اور وہ خاموش ہوگیا۔

افانسو کی باتوں پر حور محل کا دل بھر آیا اور ڈر خوف جاتا رہا۔ وہ اس کے پیروں کے قریب فرش پر بیٹھتے ہوئے نرم آواز میں بولی۔ ''میرے آقا! مجھے بتایئے کہ آپ کے گھر پر کیا گزری؟ کس ظالم نے آپ کا گھر اجاڑ ڈالا ہے۔''

''اسی ظالم نے جس نے تمہاری بستی کو تباہ و برباد کیا اور اب عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کر رہا ہے۔ ہم تم ایک ہی تیر کے شکار ہیں۔ میں نے راجر کو مقامی لوگوں پر ظلم و ستم کرنے سے روکنے کی کوشش کی تھی میرے بہت سے ہمدرد بھی پیدا ہوگئے تھے لیکن اس ظالم نے اس وقت میرے گھر پر یلغار کی جب میں اپنے ہمدردوں کے ساتھ بیٹھا گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے آدمیوں نے میرے ہمدردوں کو قتل کر دیا انہوں نے میری بیوی اور بچوں کو بھی نہ بخشا اور وہ سب موت کے گھاٹ اتر گئے۔ صرف میں بچ گیا۔ اس وقت سے میں اپنے دل میں نفرت اور انتقام کا طوفان دبائے پاگلوں کی طرح گھومتا پھر رہا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ شاید میں تمہاری مدد سے اس ظالم سے اپنا انتقام لے سکوں۔''

میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں' میرے آقا؟'' حور محل نے بے بسی سے کہا۔ ''آپ نے جس طرح مجھے درندوں سے نجات دلائی اور جس شفقت سے باتیں کر رہے ہیں' اس کے صلے میں کاش میں آپ کے کسی کام آ سکتی۔''

''تمہارا کیا نام ہے بیٹی؟'' افانسو نے محبت سے پوچھا۔

''میرے آقا! کنیزوں اور غلاموں کے نام کہاں ہوتے ہیں۔ ہاں جب میں اپنی بستی میں تھی تو لوگ مجھے حور محل کے نام سے پکارتے تھے۔''

''حور محل......'' بوڑھا افانسو خوشی سے بولا۔ ''کہیں تم مغل شہنشاہ کی رشتے دار تو نہیں

ہو؟''

حورمحل گھبرا گئی- اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنا صحیح نام بتا کر غلطی کی ہے- وہ خوف کی وجہ سے افانسو کو کوئی جواب نہ دے سکی-

افانسو نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا- ''بیٹی! تم بتاؤ یا نہ بتاؤ لیکن تم مغل لڑکی ہو اور تمہارا تعلق شاہی خاندان سے ضرور ہے مگر تم مجھ سے بالکل مت ڈرو- اگر تم مغل لڑکی ہو تو میری مدد ضرور کر سکتی ہو- میں تمہاری مدد کا صلہ بھی دوں گا- میں تمہیں اس قید سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دوں گا- تم یہاں سے نکل کر اپنے علاقے میں چلی جانا اور ایک آزاد اور باعزت زندگی گزارنا-''

حورمحل کی سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا کہ وہ اپنے آقا اور محسن کی کس طرح مدد کر سکتی ہے- اسے اپنی شخصیت ظاہر کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں انعام کے لالچ میں دوبارہ راجر کے حوالے نہ کر دیا جائے- بہت سوچ بچار کے بعد حورمحل نے ادب سے کہا- ''فرمایئے میرے آقا! ایک مغل لڑکی کس طرح آپ کی مدد کر سکتی ہے؟''

''شاباش' حورمحل! تم نے مغل جرأت کا مظاہرہ کیا ہے-'' افانسو نے خوش ہو کر کہا- ''تم اس طرح میری مددگار ثابت ہو سکتی ہو...... کہ تمہارے حوالے سے میں ڈھاکہ پہنچ سکوں گا کیونکہ بغیر ڈھاکہ جائے نہ تم آزاد ہو سکتی ہو اور نہ میرا انتقام پورا ہو سکتا ہے-''

''آپ ڈھاکہ کیوں جانا چاہتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ وہاں کوئی آپ کی بات نہیں سنے گا- ڈھاکہ کے لوگ پرتگالیوں سے نفرت کرتے ہیں-''

''انہیں ہم سے نفرت کرنا ہی چاہیے میری بیٹی!'' افانسو نے تاسف آمیز لہجے میں کہا- ''پرتگالیوں نے مقامی لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا ہے- ان کے ہاتھوں آبادیوں کی آبادیاں تباہ و برباد ہو گئی ہیں- پرتگالی حکومت کے باغی ہیں- اب تو انہوں نے ڈھاکہ تک پہنچنا شروع کر

یا ہے۔ان کی روک تھام ضروری ہے۔''

''آپ نے مجھے بیٹی کہا ہے۔'' حورمحل بولی۔''اس لیے میں آپ کوڈھا کہ جانے کا شورہ نہیں دوں گی کیونکہ......''

''مجھے معلوم ہے حورمحل!'' افانسو نے اس کی بات کاٹ دی۔''اگر میں ڈھا کہ کی رف جاؤں گا تو راستے ہی میں قتل کر دیا جاؤں گا۔لیکن مجھے اپنے انتقام کے منصوبے کو پورا لرنے کے لیے ڈھا کہ جانا ہی پڑے گا۔''

''میرے آقا! اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں آپ کوڈھا کہ تک بحفاظت پہنچا سکوں لی تو قطعی غلط ہے۔'' حورمحل نے اس کے منصوبے کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔''یہ ٹھیک ہے کہ میں بنگال کے گورنر سے آپ کی سفارش کرسکتی ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ م دونوں بحفاظت وہاں تک پہنچ سکیں اور میں اپنی آزادی کے لیے آپ کو ہلاکت میں نہیں ال سکتی آپ کوعلم نہیں کہ پرتگالیوں نے ہماری بستی پر کیسے کیسے ظلم ڈھائے ہیں۔''

''بیٹی! مجھے ہر بات کا پتہ ہے۔'' افانسو غم زدہ لہجے میں بولا''تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ں تمہیں اپنے ساتھ ڈھا کہ لے جاؤں گا تمہیں ساتھ لے جانے کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم نوں گرفتار ہوکر قتل کر دیئے جائیں۔تمہیں علم نہیں کہ ہگلی کے اردگرد کس قدر زبردست پہرہ ہے۔ڈھا کہ پہنچنے کا انتظام میں اپنے طور پر کروں گا۔دراصل مجھے ڈھا کہ پہنچ کر ایسی ہستی کی رورت ہوگی جو اس بات کی تصدیق کر سکے کہ میں راجر کا دشمن ہوں اور مغلوں کی خلوص دل سے مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

حورمحل نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ اس الجھن میں گرفتار ہوگئی تھی کہ اگر افانسو ڈھا کہ چلا یا تو پھر اس کا کیا بنے گا اور اسے کس طرح آزادی حاصل ہوگی۔

''میں ڈھا کہ روانہ ہونے سے پہلے تمہیں ساحل سمندر تک پہنچا دوں گا۔'' افانسو نے

حورمحل کی دلی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''وہاں تمہارے لیے ایک کشتی کا انتظام ہوگا۔ جو ساحل کے ساتھ ساتھ تمہیں پرتگالی علاقے سے نکال لے جائے گی پھر تمہیں اختیار ہوگا کہ تم کسی محفوظ جگہ کشتی چھوڑ کر خشکی کے راستے کسی طرف نکل جاؤ۔ میں اس سے زیادہ تمہارے لیے اور کچھ نہیں کر سکوں گا۔''

حورمحل، افانسو کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میرے بزرگ! میرا مستقبل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ میرے لیے جو مناسب سمجھیں وہ صورت اختیار کریں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ آزادی کی خوشیوں سے ہم کنار رہو۔ میں تمہیں یہاں سے نکالنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔''

''میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔'' حورمحل سعادت مندی سے بولی۔ ''میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر آپ بنگال کے گورنر کے پاس پہنچ گئے تو وہ آپ پر ضرور اعتماد کریں گے۔ میں ان کے نام ایک خط لکھ کر آپ کو دے دوں گی۔ اس خط کو دیکھ کر وہ آپ سے ہر طرح کا تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔''

افانسو نے امید و بیم کے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ گورنر پرتگالی قوم کے ایک فرد پر اعتماد کر لیں گے؟''

''آپ مطمئن رہیے۔'' حورمحل وثوق سے بولی۔ ''بنگال کے گورنر قاسم خان میرے سگے خالو ہیں اور میں ان کے بیٹے کی منگیتر ہوں جب انہیں معلوم ہوگا کہ آپ نے ان کی مظلوم بھانجی کو آزاد کر کے ہگلی سے دور بھجوا دیا ہے تو آپ کے ساتھ وہ نہایت عزت و احترام سے پیش آئیں گے۔''

اس گفتگو کے بعد افانسو تمام رات گھر سے غائب رہا۔ صبح دم وہ واپس آیا تو بہت خوش

تھا- آتے ہی اس نے بتایا- ''میں اپنے چند دوستوں سے مشورہ کرنے گیا تھا- میرے ایک دوست کے پاس ایک ایسا مسلمان غلام ہے جو آگرہ جانے والے تمام راستوں سے واقف ہے وہ تمہارے ساتھ کشتی میں جائے گا اور اگر قسمت نے یاوری کی تو تم قلعہ آگرہ تک بحفاظت پہنچ جاؤ گی-''

دوسری شب افانسو نے اپنے منصوبے کے مطابق حور محل کو کشتی کے ذریعے ہگلی سے روانہ کر دیا- حور محل نے افانسو کو اپنے ہاتھ سے ایک خط لکھ کر دیا تھا جس میں بستی پر راجر کے حملے سے لے کر ہگلی سے فرار ہونے تک کی پوری تفصیل درج تھی-

☆☆☆

افانسو' دن کو ویرانوں میں چھپتا اور رات کو سفر کرتا ہوا' ڈھاکہ کے مضافات میں پہنچ گیا- اس نے اب تک خود کو مقامی لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھا تھا لیکن ڈھاکہ کی سرحدی چوکی سے وہ اپنے آپ کو ظاہر کیے بغیر نہ گزر سکتا تھا- ڈھاکہ جانے والی یہ واحد سڑک تھی- بارش کا زمانہ تھا اور ندی نالے بھرے ہوئے تھے- سڑک کے پل پر پہرہ تھا اور محافظ سوار بڑی ہوشیاری سے پہرہ دے رہے تھے-

افانسو نے اپنے اوپر پڑا ہوا کمبل' جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا- پھر سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا پل کی طرف بڑھنے لگا- رات کا وقت تھا ہر طرف ہو کا عالم تھا بجلی چمکتی تو دور دور تک ہر چیز روشن ہو جاتی -ایسے میں ایک آدمی کا پل کی طرف آنا محافظوں کی نگاہوں سے کیسے چھپا رہ سکتا تھا- انہوں نے کسی کو پل کی طرف آتے دیکھا تو تلواریں کھینچ کر گھوڑے بڑھائے اور افانسو کو گھیر لیا-

''کون ہو' تم؟'' ایک محافظ نے رعب دار آواز میں پوچھا-

''میں پرتگالی ہوں لیکن سلطنت مغلیہ کا دوست ہوں-'' افانسو نے حوصلے سے کہا-

''ہگلی سے ایک مغل خاتون کا خط بنگال کے گورنر کے نام لایا ہوں۔''

پہرے داروں نے آپس میں مشورہ کیا پھر ایک نے پوچھا۔''تمہارے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں؟''

''اور کوئی نہیں ہے۔'' افانسو نے جواب دیا۔ کوئی پرتگالی ڈھاکہ آنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔''

''پھر تم کیوں آئے ہو؟ اور مغل خاتون نے تمہیں خط کیوں دیا؟ وہ خود کیوں نہیں آئیں؟''

''وہ پرتگالیوں کی قید میں ہیں۔''

''تم بھی تو پرتگالی ہو؟''

''ہاں میں بھی پرتگالی ہوں لیکن راجرز کی طرح ظالم نہیں ہوں۔''

''لاؤ خط ہمیں دے دو۔ ہم گورنر کو پہنچا دیں گے۔''

''خط صرف میں ہی گورنر کے حوالے کروں گا۔'' افانسو نے حتمی لہجے میں کہا۔''اگر تمہیں اعتبار نہیں تو مجھے گرفتار کر کے گورنر کے پاس لے چلو میں باقی باتیں انہی سے کروں گا۔''

محافظوں نے افانسو سے اور بہت سے سوالات کیے مگر افانسو نے جواب میں خاموشی اختیار کرلی۔ محافظ اسے پکڑ کر چوکی پر لے گئے۔ وہاں بھی افانسو خاموشی اختیار کیے رہا۔ چوکی کے سردار نے سختی کرنے کے بجائے چار پہرے داروں کے ساتھ اسے ڈھاکہ بھیج دیا۔

ڈھاکہ میں فوجی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھی۔ افانسو دن چڑھے محافظوں کے پہرے میں ڈھاکہ پہنچا۔ بنگال کا گورنر اس وقت میدان میں نئے بھرتی ہونے والے سواروں کا معائنہ کر رہا تھا۔ سرحدی چوکی کا ایک محافظ گھوڑا بڑھا کر گورنر کے قریب پہنچا اور

سلام کر کے سرگوشیوں میں اس سے کچھ گفتگو کرنے لگا- قاسم خان اس گفتگو کے دوران بار بار پلٹ کر افانسو کو دیکھتا رہا- افانسو کے دونوں پیر اور ایک ہاتھ زین سے بندھا ہوا تھا-

قاسم خان معائنہ ملتوی کر کے اپنی حویلی میں چلا گیا- تھوڑی دیر بعد افانسو کو اس کے سامنے پیش کیا گیا- اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے گئے تھے وہ گورنر کے سامنے پیش ہوا اور ادب سے سلام کیا-

قاسم خان نے اسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا- تمہارا کیا نام ہے اور تم کس کا خط لائے ہو؟''

افانسو نے جواب دینے کے بجائے اندرونی جیب سے حور محل کا خط نکال کر گورنر کی طرف بڑھا دیا- خط ایک لفافے میں بند تھا- قاسم خان نے خط نکال کر جلدی جلدی پڑھنا شروع کیا- حور محل نے بڑی تفصیل سے خط لکھا تھا- قاسم خان کو خط پڑھنے میں دس منٹ لگ گئے' اس دوران میں افانسو اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لیتا رہا تھا-

قاسم خان نے خط ختم کر کے افانسو کی طرف دیکھا- ''میرے دوست'' وہ بولا ''تم میرے دوست ہی نہیں میرے محسن بھی ہو- تم نے حور محل کے ساتھ محبت کا جو سلوک کیا ہے' اس کے لیے میں تمہارا احسان مند ہوں- میں تمہیں منہ مانگا انعام دینا چاہتا ہوں-''

''میں نے یہ کام کسی انعام کی خاطر نہیں کیا' گورنر بہادر......!''

افانسو نے مستقل مزاجی سے کہا- ''ایک مغل دوشیزہ کو میں نے سینکڑوں اسیروں میں دیکھا تو بے چین ہو گیا اور اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر اپنے گھر لے گیا-''

یہ گفتگو حویلی ہی کے ایک حصے میں ہو رہی تھی- گفتگو کے دوران قاسم خان کی زبان سے حور محل کا نام نکلا تھا- کنیزیں اس نام کو لے اڑیں- ہر طرف شور مچ گیا کہ ہگلی سے ایک پرتگالی' حور محل کا خط لے کر آیا ہے- حور محل کی ماں بستی کی تباہی کے بعد اپنی بہن کے پاس

ڈھاکہ آ گئی تھی۔ حور محل کا نام سن کر وہ تڑپ اٹھی اور بھاگتی ہوئی دربار کی چلمن تک آ گئی۔

قاسم خان نے حور محل کی ماں کو افانسو کے سامنے ہی اندر بلوا لیا۔ حور محل کی ماں کے پیچھے پیچھے قاسم خان کی بیوی بھی آ گئی۔

''میری محترم بہن!'' قاسم خان نے حور محل کی ماں کو مخاطب کیا۔ ''یہ پرتگالی میرے دوست اور سلطنت مغلیہ کے وفادار ہیں اور سیدھے ہگلی سے آ رہے ہیں۔''

''میری بچی...... حور محل زندہ ہے اب تک؟'' حور محل کی ماں نے بے چینی سے پوچھا۔

''عالی مقام خاتون......'' افانسو نے ادب سے کہا۔ ''آپ اطمینان رکھیے۔ بیٹی حور محل زندہ اور سلامت ہیں۔ میں انہیں ظالموں کے پنجے سے رہا کرا کے محفوظ علاقے میں بھجوا چکا ہوں۔ وہ اس وقت تک مغل علاقے میں پہنچ چکی ہوں گی۔ میں نے انہیں۔''

''لیکن برادر! تم اسے اپنے ساتھ ہی کیوں نہیں لائے؟ اسے کہاں بھیج دیا ہے تم نے؟'' حور محل کی ماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

''پرتگالیوں نے ہگلی کے گرد سخت پہرہ لگا رکھا ہے۔'' افانسو نے کہا۔ ''اگر میں حور محل کو ساتھ لے کر آتا تو ہم دونوں گرفتار کر کے مارے جاتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بحفاظت محفوظ علاقے میں پہنچ گئی ہوں گی۔ میں نے ان کے ساتھ ایک مسلمان رہبر بھیجا ہے جو تمام راستوں سے واقف ہے۔''

اسی وقت چوبدار نے اطلاع دی کہ قلعہ آگرہ سے شاہی ہرکارہ آیا ہے۔ قاسم خان نے خواتین کو اندر بھیج دیا اور افانسو کو مہمان خانے میں ٹھہرانے کا حکم دیا پھر اس نے شاہی ہرکارے کو اندر بلا لیا۔

شاہی ہرکارے نے قاسم خان کو اطلاع دی کہ شہنشاہ شاہجہاں نے دو ہزار سوار اور ڈھائی سو جنگی کشتیاں مع اسلحہ کے کمک کے طور پر بنگال روانہ کر دی ہیں جو ایک دو روز میں پہنچ

جائیں گی۔ شہنشاہ نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ پرتگالیوں کی تمام قلعہ بندیوں کو تباہ کر کے ان کے سردار کو گرفتار کیا جائے۔ قاسم خان کے لیے شاہی کمک کی اطلاع ایک نوید مسرت تھی۔ اس نے اپنے طور پر پرتگالیوں کے خلاف کارروائی کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ عوام کے شدید مطالبے کے تحت وہ ہگلی پر حملہ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ خود اس کی بیوی اور سالی ہگلی پر فوری حملے کے لیے زور دے رہی تھیں۔

دوسرے روز قاسم خان نے فوجوں کو آراستہ کیا اور کوچ کا نقارہ بجوا دیا۔ اس نے اپنے منصوبے کے مطابق یہ خبر پھیلائی کہ ہجلی وال میں حکومت کے خلاف بغاوت ہو گئی ہے اور وہ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے جا رہا ہے۔ قاسم خان نے اپنے بیٹے عنایت خان کو لشکر کے ایک حصے کا سالار مقرر کیا اور بڑی تیزی سے ہجلی وال کی طرف بڑھا پھر راستہ بدل کر ہگلی کی طرف چل پڑا۔

قاسم خان نے افانسو کو پہلے ہی ہگلی بھیج دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ وہ پرتگالیوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھے کہ لشکر ایک بغاوت فرو کرنے جا رہا ہے۔ افانسو نے ہگلی پہنچ کر اس کا خوب پروپیگنڈہ کیا اور راجر کو اس وقت تک لشکر کی خبر نہ ہو سکی جب تک قاسم خان نیم دائرے کی شکل میں ہگلی کے قریب نہ پہنچ گیا۔

راجر کو جب معلوم ہوا کہ مغل لشکر اسے غافل رکھ کر ہگلی کے قریب پہنچ گیا ہے تو وہ بہت گھبرایا لیکن اسے اپنی فوجی طاقت اور قلعہ بندیوں پر ناز تھا۔ اس کے پاس سات آٹھ ہزار کا لشکر اور کئی سو جنگی کشتیاں تھیں۔ اس نے پہلے کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن سرداروں کے سمجھانے سے اس نے یہ ارادہ بدل دیا اور قلعہ بندیاں مضبوط کرنے لگا۔ اس وقت تک قاسم خان اپنے لشکر کے دائرے کو سمیٹتا ہوا بردوان اور سہرام پور سے گزر کر ہگلی کے اطراف میں پہنچ گیا تھا۔ اس دوران میں اس کے دو سردار معصوم زمیندار اور خواجہ شیر

اپنے پانچ سو سواروں کے ساتھ ہلدی پور سے اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ قاسم خان نے ڈھاکہ میں شاہی کمک کا انتظار نہیں کیا تھا اور پیغام چھوڑ آیا تھا کہ کمک کو ہگلی بھیج دیا جائے۔

پھر ایک صبح قاسم خان کا مغل کمانڈر بہادر خان اپنے دستوں کے ساتھ ہگلی کی قلعہ بندیوں کے سامنے نمودار ہوا تو پرتگالیوں کے ہوش اڑ گئے۔ مغلوں کے لشکر کو ہگلی کے سامنے دیکھ کر راجر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ بار بار آنکھیں ملتا اور برج سے گردن نکال کر مغل سواروں کو دیکھتا جو بڑے اطمینان سے پوزیشن سنبھال رہے تھے۔ پرتگالیوں نے ہگلی میں قلعہ بندیاں اس طرح کی تھیں کہ ان کے سامنے دریا تھا اور پشت پر خندقیں کھود کر ایک مصنوعی دلدل بنا دی گئی تھی۔ قلعہ بندیوں سے خشکی کی طرف ایک چھوٹا سا راستہ آتا تھا اس راستے کے سامنے برجوں پر توپیں نصب تھیں اور بے شمار تیر انداز کمانیں سنبھالے پہرے پر موجود تھے۔ بہادر خان نے اپنے مورچے ان قلعہ بندیوں کے سامنے دریا کے پار لگائے تھے

پرتگالی سردار راجر پر کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اس نے جنگ کرنے کے بجائے صلح کی پیش کش کی اور ایک پرتگالی سردار کو سفید جھنڈے کے ساتھ کشتی پر سوار کر کے بہادر خان کے پاس بات چیت کے لیے بھیجا۔ اس وقت امیر زادہ عنایت خان اپنے دستوں کے ساتھ خشکی کے راستے پر بڑھ رہا تھا۔

راجر کے قاصد کو بہادر خان کے سامنے پیش کیا گیا۔ پرتگالی قاصد نے سلام کرنے کے بعد کہا۔ ''اے مغل سالار! ہمارے سردار نے آپ کو صلح و دوستی کا پیغام دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہم صرف تاجر ہیں اور شاہی حکم کے تحت صدیوں سے نمک کی تجارت کر رہے ہیں۔ ہم سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو اسے معاف کیا جائے۔ ہم مغل سردار کو ایک معقول رقم پیش کرنے کو تیار ہیں۔ رقم کا تعین کیا جائے۔ ہم اس کی ادائیگی فوری طور پر کر دیں گے۔''

بہادر خان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''اے دھوکے باز پرتگالی تاجرو! تم ہمیں

رقم دے کر اپنے ظلم و ستم پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو۔ تمہیں صرف تجارت کی اجازت دی گئی تھی۔ تم نے بنگال کی زمین پر قلعہ بندیاں کس کے حکم سے تعمیر کیں؟ تم نے بنگال کے عوام سے ان کی زمینیں چھین لیں، تم نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا، تم ظالم اور نمک حرام ہو، تم نے ہماری پگڑیاں اچھالیں، ہم نہ تمہیں معاف کر سکتے ہیں اور نہ ہی صلح کی بات چیت پر آمادہ ہیں۔''

خوف کے مارے قاصد کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ یہاں کی زمین اور قلعہ بندیاں سب آپ ہی کی ہیں۔ ہم تو صرف تاجر ہیں۔ ہمیں صرف تجارت کی اجازت دیجئے۔ اس کے صلے میں جس قدر رقم آپ مقرر کریں ہم ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

بہادر خان رقم کے نام پر چڑ کر بولا۔ ''تم کتنی رقم ادا کر سکتے ہو؟''

''آپ محاصرہ اٹھانے پر تیار ہوں تو ڈیڑھ لاکھ کی رقم فوراً ادا کی جا سکتی ہے۔'' قاصد نے بہادر کو نرم پڑتے دیکھ کر سودے بازی شروع کر دی۔

ڈیڑھ لاکھ کی رقم اس زمانے میں ایک بہت بڑی رقم تھی۔ بہادر خان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس رقم کے علاوہ ہم ہگلی کی تلاشی لے کر بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کو تمہاری قید سے آزاد کرائیں گے، اس کے ساتھ ہی اغوا کرنے والوں اور غلام بنانے والوں کو سزا بھی دی جائے گی۔ اگر تم آمادہ ہو تو میں گورنر سے بات کر سکتا ہوں۔''

''ہم رقم دو لاکھ تک دے سکتے ہیں لیکن تلاشی کی شرط نہ رکھی جائے۔'' قاصد نے جواب دیا۔ ''ہم تمام قیدیوں کو آپ کے حوالے کر دیں گے۔''

''ہمیں رقم کی اتنی پروا نہیں لیکن پرتگالیوں کے ہر گھر کی تلاشی ضرور لی جائے گی۔'' بہادر خان نے دو ٹوک جواب دیا۔

''اس کے لیے ہمیں چوبیس گھنٹے کی مہلت دی جائے-'' قاصد نے اپنی جان بچانے کے لیے کہا-''میں اپنے سردار سے مشورہ کر کے کل اسی وقت جواب لے کر حاضر ہوں گا-''

بہادر خان نے قاصد کو جانے دیا پھر چوبیس کے بجائے اڑتالیس گھنٹے گزر گئے لیکن پرتگالیوں کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا- گورنر بنگال باقی لشکر کے ساتھ ہگلی پہنچ گیا تھا- اس نے محاذ کا معائنہ کیا پھر بحری اور بری دونوں طرف سے ہگلی پر زبردست حملہ کر دیا گیا- مغلوں کو اگرچہ اس حملے میں کامیابی حاصل نہ ہوئی لیکن پرتگالیوں میں سراسیمگی پھیل گئی- ہگلی پر دونوں طرف سے حملے ہونے لگے اور محاصرہ طول کھینچنے لگا- ایک ماہ کے مسلسل حملوں سے پرتگالی بدحواس ہو گئے-

قاسم خان کو برابر تازہ دم کمک پہنچ رہی تھی- اس دوران میں شاہی کمک بھی ہگلی پہنچ گئی- پرتگالیوں نے نازک حالات کے پیش نظر ایک بار پھر صلح کی سفارت بھیجی اور نصف کے قریب غلام آزاد کر کے دریا پار بھیج دیئے- قاسم خان اور اس کے لشکر کے حوصلے بڑھ گئے- قاسم خان نے مطالبہ کیا کہ پرتگالیوں کی نصف جائدادیں اور چار لاکھ کی رقم ادا کی جائے اور باقی تمام غلاموں کو آزاد کیا جائے- راجر نے شرطیں قبول کر کے دو لاکھ کی رقم فوراً ادا کر دی اور باقی رقم کی ادائیگی کے لیے محاصرہ اٹھانے کی شرط رکھی-

قاسم خان نے سفارت کاروں کو یرغمال بنا کر دو لاکھ کی رقم اپنے لشکریوں میں تقسیم کر دی- اس کے ساتھ ہی اس نے کشتیوں کا پل بنانے کا حکم دیا اور پرتگالی جہازوں اور کشتیوں کو جلانے کے انتظامات شروع کر دیئے-

محاصرے کے چالیسویں روز' پرتگالیوں نے کشتیوں پر سوار ہو کر شہر خالی کرنے کا منصوبہ بنایا- راجر کا مخالف افانسو اس وقت شہر میں موجود تھا- وہ دریا میں چھلانگ لگا کر تیرتا ہوا ایک مغل کشتی تک پہنچ گیا- افانسو کو قاسم خان کے سامنے پیش کیا گیا- اس نے قاسم خان کو

بتایا کہ فوراً کوئی انتظام نہ کیا گیا تو راجر تمام پرتگالیوں کے ساتھ بحری راستے سے نکل بھاگے گا۔

قاسم خان نے پورے ساحل کو گھیر لیا اور جنگی کشتیاں' دریا کے تیز دھارے کے مخالف چڑھاؤ کی طرف بڑھتی ہوئی ہگلی کی قلعہ بندیوں تک پہنچ گئیں۔ راجر قلعہ بندیوں سے نکل کر کشتیوں کی طرف آ رہا تھا۔ قاسم خان نے اسے کشتیوں تک نہ پہنچنے دیا اور راستے ہی میں حملہ کر دیا۔ اس حملے میں بڑی قتل و غارت گری ہوئی۔ مغلوں نے پورا پورا انتقام لیا اور پرتگالیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

قاسم خان نے اعلان کرا دیا کہ راجر کو زندہ گرفتار کیا جائے لیکن اس اعلان کی اچھی طرح تشہیر نہ ہو سکی اور ایک مغل سوار انعام کے لالچ میں راجر کا سر کاٹ کر قاسم خان کے پاس لے گیا۔ قاسم خان پرتگالی سردار راجر کو گرفتار کر کے شہنشاہ کے دربار بھیجنا چاہتا تھا بہر حال اس نے راجر کا سر محفوظ کرا دیا۔

راجر کے مرتے ہی پرتگالیوں کی مدافعت ختم ہو گئی۔ اس جنگ میں دس ہزار پرتگالی مارے گئے اور ایک ہزار مغل کام آئے تین ہزار پرتگالی جان بچا کر نکل گئے اور چار سو پرتگالی گرفتار کیے گئے۔ اس جنگ کے ساتھ ہی بنگال میں پرتگالیوں کے ظلم و ستم کا دور ختم ہو گیا۔

قاسم خان نے ایک تیز رفتار سوار کے ذریعے پرتگالیوں کے خلاف اپنی مہم کی کامیابی کی اطلاع قلعہ آگرہ بھجوائی۔ اس نے چار سو قیدیوں اور راجر کے سر کو بھی آگرہ بھیج دیا۔ قاسم خان نے ہگلی میں دو ہفتے قیام کیا۔ اس نے پرتگالیوں کی تمام قلعہ بندیاں تڑوا دیں۔ ہگلی سے اسے بہت مال و دولت حاصل ہوئی جس سے ساحل کے ساتھ ساتھ کئی فوجی چوکیاں قائم کی گئیں اور سمندر میں جنگی کشتیوں کا جال بچھایا گیا۔ پرتگالیوں نے دس ہزار عورتوں بچوں اور مردوں کو قید کر رکھا تھا۔ ان سے لونڈی اور غلاموں کا کام لیا جاتا تھا۔ قاسم

خان نے سب کو آزاد کر کے ان کے گھروں کو بھجوا دیا۔

قاسم خان جب کامیاب و کامران ڈھاکہ پہنچا تو وہاں ایک اور خوش خبری اس کی منتظر تھی۔ قلعہ آگرہ سے شاہی پیغام آیا تھا جس میں قاسم خان کو اطلاع دی گئی تھی کہ حور محل پرتگالیوں کی قید سے فرار ہو کر آگرہ پہنچ چکی ہے۔ اس فرار میں افانسو نامی ایک پرتگالی نے اس کی مدد کی تھی۔ شہنشاہ نے حکم دیا تھا کہ افانسو کی خدمات کا اسے صلہ دیا جائے اور جب قاسم خان ہگلی کی مہم سے فارغ ہو تو اپنے گھر والوں کے ساتھ امیر زادے عنایت خان کی برات لے کر آگرہ آئے۔ حور محل اب قلعہ آگرہ کی بیٹی ہے اور شہنشاہ اسے خود اپنی بیٹی کی طرح رخصت کریں گے۔

ڈھاکہ والوں کو ہگلی کی فتح کی خبر پہلے ہی مل گئی تھی اور وہ لوگ جشن منا رہے تھے۔ قاسم خان کی حویلی میں بھی جشن کا سا سماں تھا۔ حور محل کی ماں تو خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔ چند روز بعد قاسم خان اپنے خاندان کے ساتھ آگرہ روانہ ہوا۔ امیر زادہ عنایت خان نے بھی ہگلی کے معرکے میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے لیکن آگرہ کے سفر میں وہ دلہا بنا ہوا تھا اور اس کے خاندان والے باراتی تھے۔

☆☆☆

شہنشاہ ہند شاہجہاں کو ارجمند بانو ممتاز محل کی وفات کا جو شدید صدمہ ہوا تھا' اس میں آہستہ آہستہ کمی واقع ہو رہی تھی۔ مرحوم ملکہ کی پہلی وصیت یہ تھی کہ اس کی وفات کے بعد شہنشاہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھائے' جس سے موجودہ شہزادوں کا کوئی اور مد مقابل پیدا ہو جائے۔ شاہجہاں نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا کیونکہ دہرآرا کی پیدائش کے بعد تاریخ' شاہجہاں کی کسی اور اولاد کی نشاندہی نہیں کرتی۔ ان دنوں شاہجہاں اپنی محبوب ملکہ کی دوسری وصیت کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

شاہجہاں نے مزار کے لیے قلعہ آگرہ کے بائیں جانب' دریائے گنگا کے کنارے ایک ایسی جگہ پسند کی تھی جہاں سے روضہ تاج' دن رات اس کے پیش نظر رہے- اس کی پسند کی ہوئی جگہ قلعے کی مشرقی جانب برج کہکشاں سے قریب ترین تھی- مزار کے نقشے کے لیے شہنشاہ نے برصغیر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی تشہیر کرائی تھی اور ایک معقول انعام مقرر کیا تھا- ملکہ کا جسد خاکی شہنشاہ کی پسند کی ہوئی جگہ میں امانتاً دفن کر دیا گیا تھا-

ماہرین نقشہ جات اپنے اپنے کاغذات دربار میں پیش کر رہے تھے کہ شہنشاہ کی خواہش کے مطابق اب تک کوئی نقشہ نہ ہوا تھا- آخر شیراز کے نادرالعصر عیسیٰ نے ایک نقشہ پیش کیا جسے دیکھ کر شہنشاہ پھڑک اٹھا پھر اسی کے مطابق روضے کا ماڈل تیار ہوا-

جب قاسم خان اور عنایت خان آگرہ پہنچے تو تاج محل کی تعمیر شروع ہو چکی تھی اور شاہجہاں بہت مطمئن تھا کیونکہ روضے کی تعمیر اس کے تصور اور خواہش کے عین مطابق ہو رہی تھی- قاسم خان کی آمد کی اطلاع پا کر شاہجہاں نے تمام امرا اور شہزادوں کو بارات کے استقبال کے لیے قلعے کے دروازے پر بھیجا-

شاہجہاں نے اپنے قول کے مطابق حورمحل کو قلعہ آگرہ کی بیٹی ہی کی طرح رخصت کیا- بارات کو ایک ہفتہ تک ٹھہرایا گیا- اس دوران میں قلعے اور شہر میں کسی کو چولہا جلانے کی اجازت نہیں تھی- ہر شخص کو شاہی مطبخ سے کھانا پہنچایا جاتا تھا- یہ پورا ہفتہ قلعے اور شہر میں جشن مناتے گزرا- پھر بڑی دھوم دھام سے حورمحل کو رخصت کیا گیا-

اس کا تمام جہیز شاہی خزانے سے تیار کیا گیا تھا اور جب رخصت کے وقت حورمحل' شہنشاہ کے سلام کو حاضر ہوئی تو شاہجہاں نے حورمحل کو سلامی میں ہگلی کی جاگیر عطا کی اور عنایت خان کو اس جاگیر کا ناظم مقرر کر دیا-

شکنتلا

سرزمین ہندوستان کی ایک دیوی جس نے اپنا سب کچھ اپنے دیوتا کے چرنوں کی بھینٹ کر دیا

ریاست ہستنا پور کا نوجوان اور خوبرو راجہ دشنیت تیر کمان سنبھالے ایک رتھ میں بیٹھا ہوا ہے۔ رتھ بان تیزی سے رتھ کو بھگا رہا ہے۔ رتھ کے سامنے دور پرے ایک ہرن بھاگتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔

خوشامدی رتھ بان رتھ بھگاتے ہوئے راجہ سے کہتا ہے کہ راجہ بہادر جب میری نظر آپ کی کمان کے چڑھے ہوئے چلوں پر پڑتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے خود شیو جی اس بھاگتے ہوئے ہرن کا پیچھا کر رہے ہیں۔ راجہ افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ کم بخت ہرن ہمیں کہاں سے کہاں لے آیا ہے اور کس مزے سے مڑ مڑ کے ہمارے رتھ کو کن انکھیوں سے تاکتا جا رہا ہے اور اس کی تیز رفتاری کو تو دیکھو۔ یہ نہیں لگتا کہ وہ زمین پر ہے بلکہ یوں گمان ہوتا ہے جیسے ہوا پر اڑ رہا ہو۔ اس کم بخت نے تو اندر اور سورج دیوتا کے گھوڑوں کو بھی مات کر دیا ہے۔

اس وقت رتھ بان آگے نظریں ڈال کر کہتا ہے کہ اب ہرن بچ کر نہیں جا سکتا کیونکہ جنگل ختم ہو چکا ہے اور آگے سپاٹ میدان ہے۔ راجہ بھی آگے کی طرف دیکھتا ہے پھر رتھ بان کو حکم دیتا ہے کہ وہ گھوڑوں کی راسیں چھوڑ دے تا کہ وہ تیز بھاگ سکیں اور ہم ہرن پر قابو پا سکیں۔

راجہ کا حکم پا کر رتھ بان راسیں ڈھیلی کر دیتا ہے۔ گھوڑے اور تیزی سے بھاگنے لگتے ہیں اور اب درمیانی فاصلہ ہر لمحے کم ہونے لگا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قربت اور

فاصلے میں کوئی فرق نہیں رہا۔

راجہ فوراً چلہ چڑھاتا ہے اور خوش ہو کر کہتا ہے کہ بس اب تم ہرن کو مرتے ہوئے بھی دیکھ لو۔

راجہ کے منہ سے یہ جملہ ادا ہوا تھا کہ ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

''مہاراج خبردار! تیر نہ چلایئے۔ یہ آشرم کا ہرن ہے۔ اسے نہ ماریئے۔''

راجہ کا ہاتھ جہاں ہے وہیں رک جاتا ہے۔ وہ رتھ بان سے پوچھتا ہے کہ یہ آواز کس کی ہے اور وہ ہمیں کیوں روک رہے ہیں؟

رتھ بان، رتھ روک کر راجہ کو بتاتا ہے کہ تیر کی زد اور ہرن کے درمیان کچھ سادھو آ گئے ہیں۔ اس وقت چند سادھو رتھ کے قریب آ جاتے ہیں اور راجہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ تیروں کو ترکش میں رکھ لیں کیونکہ یہ تیران معصوم جانوروں کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ بچانے کے لیے ہیں۔

راجہ سادھوؤں کی درخواست قبول کرتے ہوئے چلہ اتار لیتا ہے۔ سادھو راجہ کو دعائیں دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بھگوان کرے تو ایسے بیٹے کا باپ ہو جو راجاؤں کا راجہ ہو اور راجہ آمین کہہ کر سادھوؤں کی دعاؤں میں شامل ہو جاتا ہے۔

اس وقت ایک سادھو راجہ کو بتاتا ہے کہ وہ سامنے مالتی ندی کے کنارے ان کے گرو ''کنو'' رشی کا آشرم (مندر) ہے۔ اگر راجہ پسند کریں تو وہاں چلیں اور ہم سب کو اپنی میزبانی کا شرف بخشیں۔ نیز اپنی آنکھوں سے ہم سادھوؤں کو پوجا پاٹ کرتے دیکھیں۔ راجہ پوچھتا ہے کہ کیا اس کے گرو وہاں موجود ہیں۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ سوم تیرتھ گئے ہوئے تھے مگر ان کی بیٹی شکنتلا وہاں موجود ہے جو راجہ کی میزبانی کا شرف حاصل کرے گی۔ راجہ کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں۔ میں شکنتلا ہی سے مل لوں گا اور وہ میری بھگتی کا سندیسہ اپنے بابا کو سنا دے

گی۔

راجہ رتھ آگے بڑھواتا ہے اور تب بن میں داخل ہوتا ہے۔ اس وقت راجہ رتھ رکوا کر اپنے جواہرات اور تیر کمان رتھ بان کے حوالے کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آشرم میں داخل ہوتے وقت تن پر سادہ لباس ہونا چاہیے۔ راجہ دروازے سے آشرم میں داخل ہوتا ہے وہاں اسے ایک جھرمٹ کے پیچھے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ راجہ جھک کر اور جھانک کر دیکھتا ہے تو اسے وہاں آشرم کی کنواریاں نظر آتی ہیں جو پیڑوں کو پانی دے رہی ہیں۔

راجہ ایک کنواری کو ادھر آتا دیکھ کر اس کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا حسن و جمال تو شاہی حرم میں بھی نایاب ہے۔ لڑکیاں آپس میں گفتگو کر رہی ہیں۔ ایک لڑکی دوسری سے کہتی ہے کہ بہن پریمودا نے چوکی کا بند اس قدر کس دیا ہے کہ دم گھٹ رہا ہے۔ ذرا اسے ڈھیلا تو کر دینا۔ اس کی سہیلی بند ڈھیلا کرتے ہوئے کہتی ہے اے شکنتلا تم اپنی جوانی کو نہیں کہتیں جو تمہارے جوبن کو ابھار رہی ہے۔

راجہ دل ہی دل میں کہتا ہے کہ یہ سرو قامت چھال کے کپڑوں میں بھی بھلی لگتی ہے۔ پھر بھی اس کے حال چال کا ٹھیک پتہ لگانا چاہیے۔ اس وقت شکنتلا ایک سہیلی انسویا' شکنتلا کو یاد دلاتی ہے کہ کیا وہ اس چنبیلی کو بھول گئی جس نے آم کے اس پیڑ سے خود ہی بیاہ کر لیا تھا اور تم نے اس کا نام ''بن جوت'' رکھا تھا۔ شکنتلا مسکرا کر جواب دیتی ہے کہ وہ اس بیل کو تب ہی بھولے گی جب وہ خود کو بھی بھول جائے گی۔

اس وقت دوسری سہیلی شکنتلا پر چوٹ کرتی ہے کہ کیا کوئی جانتا ہے کہ شکنتلا اس بیل کو اس چاؤ سے کیوں تک رہی ہے۔ دوسری سہیلی کہتی ہے کہ مجھے تو پتہ نہیں اگر تمہیں معلوم ہو تو ضرور بتاؤ۔ پہلی سہیلی مسکرا کر جواب دیتی ہے کہ شکنتلا اپنے دل میں سوچ رہی ہے کہ اس بیل

کو جیسا من بھاتا پیڑ مل گیا کاش ایسا ہی پیارا دولہا اسے بھی مل جائے۔

شکنتلا جھینپ جاتی ہے مگر بات بناتے ہوئے کہتی ہے کہ کیوں ری تو نے آخر اپنے دل کا حال کہہ ہی دیا۔ پھر سب سہیلیاں اور شکنتلا ایک ساتھ ہنسنے لگتی ہیں۔ اس وقت ایک بھونرا چمبیلی کو چھوڑ کر شکنتلا کے منہ کی طرف لپکتا ہے۔ شکنتلا سہم جاتی ہے اور چیختی ہے کہ مجھے للہ بچاؤ۔ اس بے ہودہ بھنورے نے تو مجھے ہلکان کر دیا ہے۔

شکنتلا کی دونوں سہیلیاں ہنستی ہیں اور کہتی ہیں کہ ہم بچانے والے کون ہوتے ہیں تم راجہ دشنیت کی دہائی دو۔ تپ بن کا رکھوالا تو راجہ دشنیت ہی ہے۔ اس وقت راجہ دشنیت بغیر اپنا تعارف کرائے کہتا ہے کہ یہ کون ہے جو بھولی بھالی کنواریوں سے چھیڑ خانی کر رہا ہے۔ کیا اسے معلوم نہیں کہ پرو کا نام لیوا نہجاروں کا بیری دنیا پر راج کر رہا ہے۔

شکنتلا کی سہیلی آنسویا کہتی ہے کہ اے راجہ دشنیت! آپ کے راج میں کس کی مجال ہے کہ وہ یہاں اگر کنواریوں سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ پھر وہ راجہ کو بتاتی ہے کہ اس کی سہیلی شکنتلا کو ایک بھنورے نے اس قدر دق کیا ہے کہ وہ بیاری سے تنگ آ گئی ہے۔

یہ کہتے ہوئے آنسویا' شکنتلا کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آنسویا کے اشارے پر راجہ دشنیت سر گھما کر دیکھتا ہے تو دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس کے راج محل میں ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ راجہ کے کئی رانیاں تھیں اور وہ سب کی سب حد درجہ کی حسین و جمیل تھیں مگر شکنتلا کی کچھ بات ہی اور تھی۔ راجہ' شکنتلا کو دیکھ کو بوکھلا گیا۔ اس نے ایسی خوبصورت دوشیزہ اپنی تمام عمر میں نہ دیکھی تھی بلکہ اس کے محل اور پورے راجواڑے میں کوئی لڑکی یا عورت شکنتلا کے پاسنگ کے برابر بھی نہ تھی۔

چنانچہ راجہ دشنیت گھبرایا اور بوکھلایا ہوا شکنتلا کے سامنے آیا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

''آپ......آپ شکنتلا ہیں نا؟''

''آپ تپ بن کے رشی کنو کی بیٹی ہیں نا؟''

شکنتلا نے دوبارہ سر ہلا کر راجہ کو ہاں میں جواب دیا۔

اس وقت شکنتلا کی سہیلی آنسویا نے اس کو سہارا دیا اور شکنتلا سے کہا کہ وہ بھاگ کے کٹیا سے پوجا پاٹ کا سامان تو لے آئے کیونکہ راجاؤں مہاراجاؤں کی آؤ بھگت کرنا بھی تو تپسیا ہی ہے۔ پھر جب شکنتلا سامان لینے جانے لگی تو آنسویا نے اسے تاکید کی۔

''او شکنتلا! پھل پھول لانا نہ بھولنا۔ پاؤں دھونے کے لیے یہ پانی کافی ہے۔''

راجہ دشنیت نے فوراً دخل دیا اور کہا کہ میٹھے بول ہی تو ایک طرح کی تپسیا ہے۔ اس وقت شکنتلا کی دوسری سہیلی پریمودا بھی آ گئی۔ اس نے تعجب اور حیرت سے راجہ دشنیت کو دیکھا۔ راجہ ہستنا پور کا ایک خوبصورت اور شکیل جوان تھا۔ وہ اپنے دیس میں بھی لڑکیوں اور جوان عورتوں کو اس قدر پسند تھا کہ جب اس کی سواری گلی کوچوں سے نکلتی تو تمام عورتیں اپنے اپنے کوٹھوں پر اسے دیکھنے کے لیے جھک پڑتی تھیں۔

چنانچہ شکنتلا کی سہیلی پریمودا نے راجہ کو پیشکش کی کہ راجہ بہادر آپ تھک گئے ہوں گے اس لیے اگر تھوڑی دیر کے لیے اس پیڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ جائیں تو کم از کم آپ کا پسینہ تو خشک ہو جائے گا اور آپ پھر سے چست ہو جائیں گے۔ راجہ دشنیت تو عورتوں کا بھوکا ہی تھا۔ چنانچہ اس نے جھک کے اور بڑے ادب سے پریمودا سے کہا کہ وہ خود بھی تو کام کاج سے تھک گئی ہوں گی پھر بھی اگر وہ اس کے ساتھ سائے میں بیٹھنے کو تیار ہو تو اسے بہت خوشی ہو گی۔

دوسری طرف شکنتلا کا راجہ دشنیت کو دیکھ کر برا حال ہو گیا تھا۔ دراصل شکنتلا رات دن مندر میں پوجا پاٹ میں لگی رہتی تھی۔ وہ تپ بن سے قصبے یا شہر میں برسوں بعد جاتی تھی۔ اس لیے اس نے مردوں کو اور مردوں میں خوبصورت مردوں کو بہت کم دیکھا تھا۔ چنانچہ جب

شکنتلا نے راجہ دشنیت جیسے بانکے جوان کو اتنے قریب سے دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔ چونکہ وہ ایک بھولی بھالی اور نیک لڑکی تھی اس لیے جب اس نے راجہ دشنیت سے نظریں ملائیں تو اس کے دل سے ایک آواز سی اٹھی جیسے اس کے دل نے کہا۔

''شکنتلا! کیا بات ہے کہ اس اجنبی کو دیکھ کر تو ایک ایسے جذبے سے مغلوب ہوئی جا رہی ہے جو اس تپ بن کے لیے ناروا ہے۔''

ادھر تو شکنتلا کا دل یہ کہہ رہا تھا اور ادھر راجہ دشنیت، شکنتلا کو دیکھ کر ایسا بوکھلایا کہ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور اس کے عیاش اور مکار ذہن نے اسے مشورہ دیا کہ کسی طرح اس خوبصورت اور پری جمال لڑکی کو اپنے پھندے میں پھنسائے۔ پس راجہ نے انہیں خوش کرنے کے لیے ان کی تعریفیں شروع کر دیں۔

''آپ تینوں کو دیکھ کے آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے۔ آپ سب کی عمریں اور رنگ و روپ بھی ایک جیسا ہے۔''

پھر راجہ انہیں بتاتا ہے کہ پروبنسی راجہ نے اسے دھرم کاج کی رکھوالی پر مامور کیا ہے اور یہ کہ وہ اس دھرم شالے تک یہ دیکھنے آیا ہے کہ تپ بن میں کوئی رکاوٹ تو نہیں ہے۔ آنسویا یہ سن کے بہت خوش ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ بھگوان نے ان کے لیے ایک پاسبان بھیج دیا ہے۔ پھر راجہ اک دم چونک کے کہتا ہے کہ اس نے تو سنا تھا کہ کنورشی سدا کے کنوارے ہیں پر تمہاری یہ سہیلی ان کی بیٹی کیسے ہوئی۔ آنسویا راجہ کو بتاتی ہے کہ ایک مہارشی کوشک گھرانے میں ہوئے ہیں جن کا نام وشواستر ہے۔ ہماری سہیلی شکنتلا ان کی بیٹی ہے۔ کنوان معنوں میں ان کے باپ اس لیے ہوئے کہ شکنتلا انہیں پڑی ملی تھیں۔ وہ اسے اٹھا لائے اور پال پوس کر بڑا کیا۔

اس وقت راجہ سہیلی سے ایک چبھتا ہوا سوال کرتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ آپ کی سہیلی کا یہ بیراگ کب تک کے لیے ہے۔ صرف شادی تک ہے یا سدا ان کے بیچ رہیں گے۔ پریمو

ہنس کے بتاتی ہے کہ اس کے بابا کسی جوگ بر سے اس کا بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔
شکنتلا اٹھ کے کھڑی ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ وہ جا رہی ہے مگر پریموداا سے یہ کہہ کر روک لیتی ہے کہ شکنتلا اس کی قرضدار ہے کیونکہ اس نے شکنتلا کے بدلے دو پیڑوں کو پانی دیا ہے۔
راجہ دشنیت، شکنتلا کی سفارش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پریمودا یہ تو تمہاری زیادتی ہے کہ شکنتلا کا کومل بدن تو اپنے ہی حصے کا کام کرنے سے نڈھال ہو چکا ہے۔ گھڑی اٹھانے سے ان کے کاندھے ڈھل گئے ہیں اور ہتھیلی لال گلاب ہوگئی ہے۔ کانوں میں سرس کے پھولوں کے جوجھومر پڑے ہیں وہ پسینے کے تار سے چپک گئے ہیں۔ زور زور سے سانس لینے کی وجہ سے ان کا دل اب بھی دھڑک رہا ہے۔ جوڑا کھل گیا ہے اور ایک ہاتھ سے سنبھالنے کے باوجود بال کھل کر پریشان ہو گئے ہیں۔ ہاں لیجیے میں ان کا قرض بے باق کرتا ہوں۔
اور راجہ اپنی انگوٹھی انگلی سے اتار کے ان کے حوالے کر دیتا ہے۔ انگوٹھی کے نگینے پر راجہ کا نام کھدا ہوا ہے اسے پڑھ کر دونوں حیران ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کا منہ تکتی ہیں۔ راجہ انہیں اطمینان دلانے کے لیے کہتا ہے کہ آپ کو فکر کرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ایک راجہ کی دین ہے۔ پریمودا راجہ کو منع کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اب قرض چکانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے۔ پھر وہ شکنتلا سے کہتی ہے ہمارے مہمان مہاراجہ کی مہربانی سے تم آزاد کی جاتی ہو۔ اب تم جا سکتی ہو۔
راجہ شکنتلا کو دیکھ کر خود سے کہتا ہے۔
کیا یہ بھی میری طرف اسی طرح مائل ہے جس طرح میں اس کی طرف۔ کیا میری دعا نے اثر کیا۔ گو وہ مجھ سے مخاطب نہیں ہوتی لیکن جب میں کچھ کہتا ہوں تو توجہ سے سنتی ہے۔
وہ میری طرف نہیں دیکھتی تو کیا ہوا وہ آنکھ بھر کر اور کسی کو بھی تو نہیں دیکھ سکتی۔

اس وقت دور سے ایک آواز آتی ہے۔

''ارے اور جوگیو! تپ بن کے جانوروں کی حفاظت کا دھیان رکھنا۔'' راجہ دشنیت شکار کھیلتے کھیلتے کہیں قریب ہی آتے ہیں۔'' دیکھو! گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑتی ہوئی خاک کے ذرے سورج کا رنگ لے کر جب آشرم کے پیڑوں پر بیٹھنے لگتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ٹڈی دل نے دھاوا بول دیا ہے اور اس ہاتھی کو دیکھو جو رتھوں کی آواز سے گھبرا کر بوکھلایا ہوا یوں چلا آ رہا ہے گویا ہماری تپسیا کو درہم برہم کرنے کے لیے کوئی مجسم بلا آ رہی ہو۔ ایک پیڑ کے تنے میں اس نے اپنا دانت گھسیڑ دیا ہے اور وہ کہیں سے بیلوں کو اپنے پاؤں میں لپیٹنا چاہتا ہے جو جال کی طرح لپٹی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھو ہرن اس کے ڈر سے بھاگے جا رہے ہیں''

یہ سن کر سب لوگ چونک پڑتے ہیں۔

اس وقت راجہ کہتا ہے کہ میری تلاش میں آئے ہوئے یہ لوگ تپ بن کو اجاڑے ڈال رہے ہیں۔ اس لیے مجھے فوراً واپس جانا چاہیے۔

راجہ کے خاموش ہوتے ہی شکنتلا کی سکھیاں کہتی ہیں کہ اس پاگل ہاتھی کی خبر سن کر ہمارا کلیجہ دھڑ کنے لگا ہے۔ پھر وہ راجہ سے اپنی کٹیا میں واپس جانے کی اجازت مانگتی ہیں۔

راجہ انہیں رخصت کر دیتا ہے اور خود یہ دیکھنے چلتا ہے کہ ان لوگوں نے تپ بن کے امن میں کسی قسم کا خلل تو نہیں ڈال دیا ہے۔

سکھیاں راجہ سے معذرت کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ان کی خدمت نہ کر سکے۔ وہ راجہ سے بھی درخواست کرتی ہیں کہ وہ ایک بار پھر انہیں درشن دینے کو تپ بن آئیں گے۔ راجہ ان سے وعدہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس کی خوش نصیبی ہے کہ اس نے انہیں دیکھا اور ان سے گفتگو کی ہے۔

شکنتلا چلتے چلتے لنگڑانے لگتی ہے اور کہتی ہے شاید اس کے پیر میں کانٹا لگ گیا ہے۔ اس

بہانے سے وہ راجہ کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنی سکھیوں کے ساتھ واپس ہوتی ہے۔
ان کے جانے کے بعد راجہ خود کلامی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میری تو اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ جسم تو آگے کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن دل بے قرار پیچھے کی طرف بھاگ رہا ہے جیسے باد مخالف میں کسی ریشمی جھنڈے کا ریشمی پھریرا مخالف میں اڑتا ہے۔

(۲)

خستہ حال مسخرا مادھو، راجہ کے ڈیرے پر آتا ہے اور ٹھنڈی سانس لے کر بڑبڑاتا ہے۔
''ہائے ری قسمت! اس شکاری راجہ کی دوستی نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ یہ ہے ہرن، وہ ہے سور، یہ بھاگا شیر۔ اسی تگ ودو میں زندگی بنجارے کا چولہا بن کے رہ گئی ہے۔ بھری دوپہر میں بن بن کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ پہاڑی جھرنوں کا کسیلا اور گندا پانی پینا پڑتا ہے۔ وقت بے وقت کچا گوشت کھانا پڑتا ہے۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے بند بند ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ راتوں کو کیا خاک نیند آئے۔ پھر نور کے تڑکے یہ حرام زادے چڑی مار جنگل میں ایسا ہانکا کرتے ہیں کہ آنکھ کھٹ سے کھل جاتی ہے مگر مصیبت اتنے پر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ وہ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ مرے کو ماریں شاہ مدار۔ کل جو ہم بچھڑ گئے تو قسمت نے غچہ دیا یعنی سرکار ایک ہرن کا پیچھا کرتے ہوئے ایک آشرم میں جا گھسے اور وہاں کسی سادھو کی لڑکی کو دیکھ لیا۔ اب حضرت کسی طرح شہر لوٹنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اس سوچ میں مجھے رات رات بھر نیند نہیں آتی۔ کیا کیا جائے۔''
''حضور نہا دھو لیں تو سلام کو جاؤں۔'' پھر سامنے دیکھ کر کہتا ہے۔
''تو ہمارے مہربان ادھر ہی تشریف لا رہے ہیں۔ بھیلین ہاتھ میں تیر کمان لیے، گلے میں جنگلی پھولوں کے ہار ڈالے ان کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہیں۔ میں یوں بے حرکت کھڑا ہو جاؤں گویا مفلوج ہو گیا ہوں۔ چلو اس بہانے تھوڑا سا آرام مل جائے گا۔''

مادھو ڈنڈے پر بار دے کر کھڑا ہو جاتا ہے- اتنے میں راجہ اپنے حواریوں کے ساتھ آتا ہے- راجہ خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے-

''یہ سچ ہے کہ میرا محبوب آسانی سے نہیں مل سکتا لیکن اس کی ادائے محبت دل کو تسکین دیتی ہے- عشق اپنی منزل کو نہیں پہنچا تو کیا ہوا- دونوں طرف برابر آگ لگی ہوئی ہو تو مزہ ملتا ہے- جب کسی کی کسی سے لگی ہوئی ہو اور وہ اپنے حال دل سے دوسرے کے جذبات کا اندازہ لگانا چاہے تو یونہی دھوکہ کھاتا ہے- توبہ! عاشق بھی کتنا خود فریب ہوتا ہے-''

اب مادھو راجہ سے شکوہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ راجہ بہادر آپ کی ذات والا صفات میری پریشانیوں کا سبب ہے- راجہ کے پوچھنے پر مادھو بتاتا ہے کہ آپ تو راج پاٹ چھوڑ کر اس جنگل میں آ گئے ہیں اور ہر دم شکار کی فکر لگی رہتی ہے- ادھر میرا جانوروں کا ہانکا کرتے کرتے برا حال ہو گیا ہے- سٹی گم ہو گئی ہے- ہڈی پسلی چکنا چور ہے- مجھ پر رحم کھائیے اور کچھ دنوں کے لیے شکار سے ہاتھ کھینچ لیجیے-

راجہ مادھو کی بات مان لیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ آج شکار نہیں ہوگا اور ہم آرام کریں گے مگر راجہ کو تو شکنتلا کی یاد ستا رہی تھی- چنانچہ اس نے شکنتلا کی تعریفیں شروع کر دیں- اس نے کہا-

''خالق کی قدرت اور شکنتلا کے حسن کو دیکھتے ہوئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ پہلے اس کی تصویر بنائے بغیر بھگوان کو جرات نہ ہوئی ہوگی کہ اس کے پیکر میں روح پھونکے اور تصویر میں دنیا کی تمام خوبصورت چیزوں کی جھلک ڈال کر پھر کہیں یہ دوسری لکشمی بنائی گئی ہوگی- اس کا معصوم جمال ایک ایسا پھول ہے جسے اب تک کسی نے نہیں سونگھا- ایسی نئی کونپل ہے جو ابھی ڈنٹھل سے نہیں توڑی گئی- ایسا موتی ہے جو ابھی ہار میں نہیں پرویا گیا- ایسا شہد ہے جو ابھی نہیں چکھا گیا- عصمت کا ایسا چاند ہے جس میں کوئی داغ نہیں پڑا- معلوم نہیں بھگوان نے یہ

نعمت کس کے نام لکھی ہے۔‘‘

مادھو نے ہنس کے کہا۔ ’’راجہ بہادر! اللہ اس غریب کو نجات دلائیے۔ اگر بیچاری کسی گنجے یا کن پھٹے سادھو کے ہتھے چڑھ گئی تو کیا ہوگا؟‘‘

راجہ سادھو کا ہاتھ تھام کر کہتا ہے کہ یار میں تو محض سادھوؤں کے خیال سے آشرم میں ٹھہر رہا ہوں ورنہ مجھے سادھو کی بیٹی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ مادھو تو سوچ تو سہی۔ کہاں ہم اور کہاں یہ لڑکی جو ہرنیوں اور پنچھیوں میں پلی ہے۔ یہ بے چاری عشق کی رمزوں کو کیا سمجھے۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کہیں تم دل لگی کو سچ نہ سمجھ بیٹھنا۔

راجہ صاحب اپنی شکنتلا کے ساتھ ملاقاتوں اور باتوں کو محبت کی بجائے محض ایک دلچسپی کا نام دیتے ہیں اور مادھو کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر مادھو ان پڑھ ہونے کے باوجود سمجھدار اور ذہین ہے اسے یقین ہو جاتا ہے کہ راجہ کو شکنتلا اور شکنتلا کو راجہ سے محبت ہو گئی ہے۔ پس ادھر راجہ صاحب مادھو کو اپنے اعتماد میں لیتے ہیں اور دوسری طرف شکنتلا کی دونوں سکھیاں یعنی آنسویا اور پریمودا کو یقین ہو جاتا ہے کہ شکنتلا نے راجہ کو پسند کر لیا ہے اور وہ ایک دوسرے سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں۔

چنانچہ ایک دن شکنتلا خود اس کی تصدیق کر دیتی ہے۔ اس کے منہ سے اچانک نکل جاتا ہے کہ جب سے ہمارے آشرم کے رکھوالے راجہ نے ہمیں درشن دیے ہیں اس دن سے......‘‘ یہ کہہ کر شکنتلا رک جاتی ہے اور دونوں سہیلیاں کہتی ہیں۔

’’پیاری شکنتلا! تم چپ کیوں ہو گئیں۔ آگے کچھ تو کہو۔‘‘

اور شکنتلا شرما کے اقرار کرتی ہے۔

’’اس دن سے مجھے بس انہی کا دھیان ہے۔‘‘

اتنی بات ہوئی تھی کہ راجہ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ راجہ کا دھرم ہے کہ وہ پرجا

میں کسی کا دکھ درد ہو تو اس کی مشکل کشائی کرے۔ اس وقت پریمودا صاف الفاظ میں راجہ کو بتاتی ہے کہ ان کی پیاری سکھی آپ کے پریم کی ماری ہوئی ہے اور یہ کہ راجہ کو ان کی مشکل دور کرنا چاہیے۔ راجہ خوش ہو جاتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ خود شکنتلا کے تیر نظر کا شکار ہے اور شکنتلا کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

آنسویا بھی یہی چاہتی تھی مگر اس نے راجہ کو چھیڑنے کے لیے کہا کہ سب جانتے ہیں کہ راجہ کے کئی کئی رانیاں ہوتی ہیں۔ اگر راجہ یہ وعدہ کرے کہ وہ ہماری سکھی کو کوئی تکلیف نہیں دیں گے تو وہ دونوں شکنتلا کو راضی کرنے کی کوشش کریں گی۔ راجہ دونوں سہیلیوں سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ شکنتلا کو سب سے زیادہ چاہے گا۔ چنانچہ دونوں سکھیاں اسے راجہ کے حوالے کر کے خود چلی جاتی ہیں۔

شکنتلا بھی ان کے ساتھ جانا چاہتی ہے مگر راجہ اسے روک کے کہتا ہے کہ ابھی دھوپ تیز ہے اور تمہارا یہ حال ہے پھر پھولوں کی اس نگری کو چھوڑ کر جس کی پھول پتیاں تمہاری سینہ بندی کر رہی ہیں، تم اس دوپہر میں کہاں جاؤ گی۔ سوچو تو تم دکھ جھیل کر کتنی نڈھال ہو گئی ہو۔

یہ کہتے ہوئے راجہ اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لیتا ہے۔ شکنتلا راجہ کو اگلا قدم اٹھانے سے روکتی ہے اور کہتی ہے کہ راجہ کو بے قابو نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ وہ خود بھی کام دیو (عشق کے دیوتا) کی ستائی ہوئی ہے لیکن وہ پرائے بس میں ہے۔ راجہ اسے ڈرپوک ہونے کا طعنہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ بڑھے بوڑھوں کا خوف وہ کب تک کرتی رہے گی۔ تمہارے بابا شاستروں سے واقف ہیں۔ تمہاری حالت کا علم ہونے کے بعد وہ تم پر کوئی تہمت نہ دھریں گے۔ پہلے بھی بڑے بڑے رشی منیوں کی بیٹیوں نے اپنی مرضی سے گاندھرو بیاہ کر لیا اور ان کے ماں باپ نے برا نہیں مانا۔

اس موقع پر شکنتلا سچ مچ یا جھوٹ موٹ راجہ سے کہتی ہے کہ راجہ کم از کم اس کا ہاتھ تو

چھوڑ دے تا کہ وہ اپنی سکھیوں سے تو اس سلسلے میں مشورہ کر سکے۔
راجہ اسے دبوچے ہوئے اسے جھوٹی تسلی دیتا ہے کہ اسے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا مگر جب میں تمہارے اچھوتے ہونٹوں کا رس گھونٹ گھونٹ پی لوں گا۔ اس کے ساتھ ہی راجہ اس کا منہ اوپر کو اٹھاتا ہے اور وحشیانہ انداز سے اس کے کنوارے بدن سے چمٹ جاتا ہے پھر اس کے بعد وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔
اس جگہ ''گاندھرو بیاہ'' کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ اس بیاہ کی تشریح یہ ہے کہ گاندھرو بیاہ شادی کی مختلف قسموں میں سے ایک قسم ہے جس میں صرف میاں بیوی (اس جگہ مرد اور عورت) کی رضامندی کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی گواہ کا ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ ہندو شاستروں میں اس قسم کی شادی کو جائز بنایا گیا ہے۔
اس وقت شکنتلا کی سکھیاں اشارے سے بتاتی ہیں کہ کوئی آ رہا ہے۔ چنانچہ شکنتلا راجہ سے الگ ہوتے ہوئے کہتی ہے۔
''پیارے راجی جی! غضب ہوا۔ گومتی مائی میری مزاج پرسی کے لیے یہیں آ رہی ہیں۔ تم ان جھاڑیوں میں چھپ جاؤ۔''
راجہ بہت اچھا کہہ کر شکنتلا سے الگ ہو کر جھاڑیوں میں چھپ جاتا ہے۔ گومتی مائی آتی ہیں اور شکنتلا کی مزاج پرسی کرتی ہیں اور کش گھاس کا پانی جسے وہ ساتھ لے کر آئی ہیں، شکنتلا کے سر پر چھڑک کے کہتی ہیں کہ بیٹی اب جھٹ پٹے کا وقت ہو گیا ہے اور وہ شکنتلا کو اپنے ساتھ کٹیا میں واپس لے جاتی ہیں۔
ان کے جانے کے بعد راجہ جھاڑیوں سے نکل کر آتا ہے اور تنہائی میں شکنتلا کے ساتھ جو لمحات گزارے اور اس کے کنوارے بدن سے جو خوشہ چینی کی اس کو مزے لے لے کر اس

طرح بیان کرتا ہے۔

''جب اپنے ہونٹوں کو اس نے اپنی انگلیوں میں چھپالیا اور ان ہونٹوں سے حرفِ انکا
کچھ نکلے اور کچھ مسوس کے رہ گئے تو اس کا مکھڑا کس قدر دل فریب ہو گیا تھا۔ اپنا مکھڑا وہ
بار ادھر ادھر موڑ لیتی تھی اور جب لے دے کے میں نے اسے اوپر اٹھایا بھی تو چومنے کی ہمت
نہ ہوئی۔ چلو اس کنج میں گھڑی بھر بیٹھوں جسے میرے محبوب نے اتنی دیر نوازا تھا۔''

راجہ بڑی دلچسپی سے چاروں طرف دیکھتا ہے پھر کہتا ہے۔''یہ ہے چٹان پر پھولوں
وہ سیج جسے اس نازک اندام نے مسلا تھا۔ یہ ہے کنول کی پنکھڑی کی مرجھائی ہوئی پتی جس
اس نے ناخنوں سے لکھا تھا۔ یہ ہے کنول کے ڈنٹھلوں کی پہنچی جو اس کی کلائی سے گر پڑ
تھی۔ حالانکہ اب یہاں سناٹا ہی سناٹا ہے لیکن آنکھیں اس سے اتنی مانوس ہو گئی ہیں کہ ہٹنے
جی نہیں چاہتا۔''

اس وقت دور سے ایک آواز آتی ہے۔

''مہاراج! شام کی پوجا ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ راکشش بھوت بن کر اور لال لا
بادلوں کا روپ دھار کر قربان گاہ کی آگ کے آس پاس منڈلانے لگے اور طرح طرح
ہمیں دق کرنے لگے۔''

راجہ اس آواز کے جواب میں کہتا ہے۔''جوگیو! گھبرانا نہیں، میں آ پہنچتا ہوں۔''

(۳)

شکنتلا کی دونوں سکھیاں پھول توڑنے آ رہی ہیں اور آپس میں گفتگو کر رہی ہیں۔

آنسویا خوشی کے لہجے میں دوسری سکھی پریمودا سے کہتی ہے کہ شکنتلا کو منہ مانگا دولہا مل
گیا اور دونوں کا گاندھرویت سے بیاہ بھی ہو گیا۔ دونوں نے شب عروسی بھی منا لی اس خیال
سے میرا دل باغ باغ ہے مگر ایک بات ضرور کھٹکتی ہے۔ پھر پریمودا کے پوچھنے پر وہ بتاتی

کہ آج قربانی ختم ہوگئی ہے اور پجاریوں کے راجہ کو واپس جانے کی اجازت بھی دے دی ہے مگر ڈر اس بات کا ہے کہ جب وہ اپنی نگری پہنچے گا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے دیس کی رنگ رلیوں میں پڑ کر یہاں کی بیتی ہوئی باتیں یعنی شکنتلا سے گاندھرو ریت بیاہ بھول جائے۔

پریمودا کہتی ہے کہ اس بات کو تو چھوڑ و' مجھے تو یہ فکر ستا رہی ہے کہ راجہ جیسے بھولی بھالی صورت والے جلاد بھی ہوتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب کنو بابا یہ قصہ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ پریموداا اس کی بات کاٹتے ہوئے کہتی ہے کہ میرا تو یہ خیال ہے کہ کنو بابا' اس بات کو پسند کریں گے۔ کیونکہ شکنتلا نے گاندھرو ریت کے تحت ایک راجہ سے شادی کی ہے اور ہر باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیٹی کا بیاہ کسی اعلیٰ اور بڑے گھرانے میں ہو۔ شکنتلا کو تو گھر بیٹھے راجہ ہستنا پور جیسا بر مل گیا ہے پھر وہ کیوں چنتا کریں گے ان کی آرزو تو خود ہی پوری ہوگئی۔

اس وقت پس پردہ سے ایک آواز بلند ہوتی ہے کہ کوئی گھر میں ہے کہ نہیں۔ تمہارے گھر مہمان آیا ہوں۔ آنسویا کہتی ہے کہ شاید کوئی مہمان ہے مگر شکنتلا اس آواز پر توجہ نہیں دیتی۔ اس وقت پس پردہ وہی آواز پھر ابھرتی ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو۔

''او مہمانوں کی توہین کرنے والی جس کے دھیان میں تو ایسی ڈوبی ہوئی ہے کہ اس کی بھی سدھ نہیں کہ مجھ جیسا تپسیا کرنے والا تیرے در پر کھڑا صدا لگا رہا ہے۔ جا اب ایسا ہوگا کہ وہ تجھے یکسر بھول جائے گا اور یاد دلانے پر بھی نہ پہچان سکے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی متوالا اپنے وعدے بھول جاتا ہے۔''

اب تو پریمودا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ ہائے افسوس شکنتلا یہ کیا غضب ہوا۔ یہ کسی معمولی آدمی کی آواز نہیں تھی بلکہ وہ تو نامی گرامی رشی (درداسنا) ہے جس کا تنک چڑھاپن تمام جگ میں مشہور ہے۔ وہ بد دعا دے کر غصے کے مارے تھرتھراتا ہوا

سرپٹ چلا جا رہا ہے- وہ تو موا آگ کا بھٹا ہے- اب تو آنسویا بھی بدحواس ہو جاتی ہے وہ پریمودا کی خوشامد کرتے ہوئے کہتی ہے کہ میری بہن میں تیرے پیر پڑتی ہوں تم کسی طرح اس تن جلے کو واپس لے آؤ- میں اس کی پوجا کا انتظام کرتی ہوں-

آنسویا گھبرا کر ''رشی'' درداسا کے پیچھے بھاگتی ہے- اس بھاگ دوڑ میں اس کے ہاتھ سے پھولوں کی ٹوکری گر جاتی ہے اور وہ پھول چننے لگتی ہے- اس وقت پریمودا نے گڑگڑا کر رشی سے التجا کی-

''اے مہابلی! یہ تو دیکھو کہ وہ تمہاری ہی بچی ہے- وہ تپ کی طاقت کو کیا جانے اور پھر یہ اس کی پہلی بھول ہے- اپنی کرامات کے صدقے میں اسے معاف کر دو- رشی درداسا کو شکنتلا پر ترس آ جاتا ہے اور وہ چلتے چلتے کہتے ہیں کہ اگرچہ ان کا کہنا پتھر کی لکیر ہے مگر نشانی کی انگوٹھی دیکھنے کے بعد میری بددعا کا اثر جاتا رہے گا-

رشی درداسا کے اس طرح شکنتلا کو معاف کر دینے سے دونوں سہیلیاں خوش ہو جاتی ہیں- انہیں آس بندھ گئی کہ اب بددعا کا اثر نہ ہوگا- انگوٹھی ان کے پاس تھی کیونکہ جب راجہ واپس جا رہا تھا تو اس نے یادگاری کے طور پر اپنی انگوٹھی شکنتلا کو پہنا دی تھی-

پھر بھی پریمودا دوسری سکھی کو سمجھاتی ہے کہ اس واقعہ کی کسی تیسرے کو خبر نہ ہونے پائے کیونکہ شکنتلا کا دل بہت نازک ہے- اسے اس افتاد کا پتہ نہ چلنا چاہیے-

پریمودا جواب میں کہتی ہے کہ وہ اس قدر بے وقوف نہیں کہ چمبیلی پر گرم پانی ڈال کر اسے جلا دے-

(۴)

شکنتلا کی سہیلی آنسویا اور رشی گرو کے چیلے میں راجہ دشنیت کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے-

آنسویا گرو کے چیلے سے راجہ کی شکایت کرتے ہوئے کہتی ہے۔

''میں دنیا کی رسم وراہ سے انجان ہوں تو کیا ہوا' اتنا تو سمجھ ہی سکتی ہوں کہ راجہ نے شکنتلا کے ساتھ برا سلوک کیا۔ کام دیو ہماری بھولی بھالی سکھی کو ایک نردئی کے پھندے میں پھنسا کر تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا یا پھر اس تغافل کی اصل وجہ درواسا کی بددعا ہے ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ راجہ ایسے ایسے وعدے وعید کرنے کے باوجود اتنی مدت میں ایک چھٹی بھی نہ بھیجتا۔ مگر ہاں ایک بات یہ بھی ہے کہ اس صورت میں نشانی کی وہ انگوٹھی یہاں سے اس کے پاس جانی چاہیے مگر سب سادھو تو اپنی اپنی تپسیا میں ڈوبے ہوئے ہیں پھر بھیجیں کیسے؟ نہ میں کنو بابا سے کہہ سکتی ہوں کہ شکنتلا کا بیاہ ہو چکا ہے اور اس کا پاؤں بھاری ہے کیونکہ سارا قصور تو اس مت ماری کا ہے۔ ہائے اس مصیبت میں ہم کیا کریں۔

اس وقت پریمودا ہنستی ہوئی آتی ہے اور بتاتی ہے کہ تم سب جلدی چلو۔ شکنتلا اپنے دولہا کے گھر جا رہی ہے۔ ہم سب کو رخصتی کی رسم ادا کرنی ہے۔ آنسویا پوچھتی ہے کہ اری یہ سب کچھ ہوا کیے۔ پریمودا بتاتی ہے کہ میں ابھی شکنتلا سے پوچھنے گئی تھی۔ وہاں میں نے شکنتلا کو لاج کی ماری اور شرمائی شرمائی کھڑے ہوئے دیکھا۔ کنو بابا اسے گلے لگا کر کہہ رہے تھے کہ مرحبا۔ بچاری کی آنکھیں دھوئیں کے مارے دھندلا گئیں تو کیا ہوا اس کا چڑھاوا تو آگ کو پہنچ ہی گیا پھر بابا نے شکنتلا کو گلے سے چمٹاتے ہوئے کہا کہ میری بچی تو اس ہنر کی طرح ہے جو کسی سعادت مند شاگرد کو سکھایا گیا ہو کیونکہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتی جو میری ذلت کا باعث ہو۔ آج ہی میں تجھے تیرے پیا کے گھر بھیج دوں گا۔

آنسویا پوچھتی ہے کہ لیکن یہ تو بتاؤ کہ کنو بابا پر یہ راز کیسے کھلا؟ پریمودا نے اسے بتایا کہ جب بابا دیوالا کو جا رہے تھے تو انہیں ایک آکاش بانی (صدائے ربی) سنائی دی۔ آنسویا حیران رہ گئی۔ اس نے پوچھا کہ آخر اس آکاش بانی نے کیا کہا۔ اس پر پریمودا نے بتایا کہ

آ کاش بانی نے یہ انکشاف کیا کہ اس برہمن کی بیٹی کو کیکر کا پیڑ سمجھ- اس کے تنے میں آگ بھری ہے کیونکہ راجہ دشنیت نے اسے آگ کی اس چنگاری کا حامل بنایا ہے جو کبھی دنیا کو اجال دے گی (پاک کرے گی)-

آنسویا نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہوا مگر اب دکھ تو یہ ہے کہ شکنتلا ہم سے بچھڑ جائے گی- پریمودا نے بڑی سمجھداری کی بات کی- اس نے کہا کہ ہم تو اپنا دل کسی نہ کسی طور بہلا لیں گی مگر خوشی اس بات کی ہے کہ شکنتلا کو تو شوہر کے پاس پہنچ کے سکھ اور چین ملے گا-

پھر اسی دن کنو بابا نے شکنتلا کو اپنے دو شاگردوں کے ساتھ جن میں ایک کا نام شارنگرد تھا- پیا کے دیس یعنی ہستنا پور روانہ کر دیا- شکنتلا کے جانے پر بابا کنو نے دکھے دل سے تبصرہ کیا کہ شکنتلا کو سسرال بھیج کر ایسا لگ رہا ہے کہ ایک بڑا بار اتر گیا- اس لیے کہ بیٹی آخر پرایا دھن ہے آج اسے پیا کے گھر بھیج کر ایسا اطمینان ہو رہا ہے جیسے میں نے کسی کی امانت اسے لوٹا دی ہے-

(۵)

اس زمانے میں سفر کرنا مشکل اور بڑی جان جوکھوں کا کام تھا مگر کنو رشی نے شکنتلا کو اپنے دو چیلوں اور گوتمی مائی کے ساتھ ستنا پور روانہ کر دیا- یہ سب راستے کی پریشانیاں جھیلتے اور گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح ہستنا پور پہنچ ہی گئے- وہاں پہنچ کے گوتمی مائی نے انہیں مشورہ دیا کہ راجہ سے ملاقات کے لیے پہلے انہیں راجہ کے کسی ہرکارے سے ملنا چاہیے تاکہ وہ سب مہمانوں کو عزت و احترام کے ساتھ راجہ کے حضور پیش کرے-

پس یہ سب کے سب راجہ کے حاجب (دربان وزیر) کے گھر پہنچے اور انہوں نے حاجب سے درخواست کی کہ انہیں راجہ کے حضور پیش کر دیا جائے- راجہ کا حاجب ایک نیک

ل انسان تھا- وہ اس وقت راجہ کے پاس پہنچا اور اس نے اطلاع دی کہ ہمالیہ کی ترائی کے
اسی (باشندے) دو سادھوؤں اور دو دویویوں کے ساتھ آئے ہیں کنورشی کا کوئی سندیسہ
لائے ہیں اور وہ راجہ بہادر سے فوراً ملنا چاہتے ہیں-

راجہ کو اس بات پر تعجب ہوا کہ اتنی دور سے لوگ اس سے ملنے کیوں آئے ہیں- اس
نے فوراً حکم دیا کہ پروہت سے کہا جائے کہ وہ رسم کے مطابق مہمانوں کی آؤ بھگت کریں پھر
نہیں ساتھ لاکر میرے حضور پیش کریں- میں اس دوران کسی ایسی جگہ جا کر بیٹھتا ہوں جو
سادھوؤں کے لیے مناسب ہو- یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ راجہ تپ بن میں درداسا کی
بددعا سے تمام باتیں بھول گیا تھا- اس لیے وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ رشی کنو کے پاس سے کون سا
پیغام آ سکتا ہے راجہ نے یہ مناسب خیال کیا کہ وہ رشی کنو کے کارندے سے اپنے دربار میں
ملاقات کرنے کے بجائے کسی متبرک مقام پر ملے اس لیے اس نے حاجب سے کہا کہ وہ
آتش کدہ وتیروتی جا رہا ہے اس لیے مہمانوں کو وہیں پیش کیا جائے- جب راجہ آتش کدے
میں پہنچا تو اسے بھاٹوں (تعریف کرنے والے چاپلوس) نے اسے گھیر لیا اور اس کی تعریف
میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیے-

ایک بھاٹ نے راجہ کا قصیدہ اس طرح شروع کیا کہ راجہ بہادر آپ اپنے عیش و آرام
کو تج کر صبح و شام پرجا سیوا میں لگے رہتے ہیں- یہی آپ کا دھرم ہے- پیڑ کا کام یہ ہے کہ
اپنی شاخوں پر سورج کی کرنوں کی گرمی کو سہہ لے اور اپنی چھاؤں میں بیٹھنے والے کو ٹھنڈک
پہنچائے-

پہلے بھاٹ کا قصیدہ ختم ہوا تو دوسرے بھاٹ نے راجہ کی شان میں اس طرح زمین و
آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیے- چنانچہ اس نے اپنا قصیدہ ان الفاظ میں پیش کیا- راجہ
بہادر آپ اپنے انصاف سے بھٹکے ہوؤں کو نیت کی ریت (طریقہ) سکھاتے ہیں اور پرجا

(رعایا) میں امن قائم کرتے ہیں۔ دھن مال ہو تو بھائی بہن مل جاتے ہیں لیکن مفلسی میں رشتہ جوڑنے والا ایک آپ ہی کا دم ہے۔ راجہ ان کی باتوں یعنی چاپلوسی سے خوش ہو کر کہتا ہے کہ لوگوں کی باتیں سن کر میری ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔

پھر راجہ نوکروں کے کاندھے کا سہارا لے کر کہتا ہے کہ پتہ نہیں کہ کنورشی نے یہ سادھو کس غرض سے بھیجے ہیں لیکن جوگیوں کے کام دھام میں کوئی رخنہ تو نہیں پڑا یا کوئی پاپی ان کے جانوروں کو تو نہیں ستا رہا ہے یا پھر ایسا تو نہیں کہ مرے کسی پاپ کی وجہ سے آشرم کے پودوں کی جڑ ادھیڑ دی گئی ہے۔ راجہ کے اس خیال میں ایک چوبدار اس کی چاپلوسی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ راجہ بہادر میرا تو یہ خیال ہے کہ سادھو آپ کی رعایا پروری سے خوش ہو کر آپ کو مبارکباد دینے آئے ہیں۔

اس کی باتیں یہیں تک پہنچی تھیں کہ شکنتلا کو ساتھ لیے ہوئے گوتمی مائی اور دونوں چیلے آتے ہیں۔ صاجب اور پجاری سومارت آگے آگے ہیں۔ راجہ کو دیکھ کر شارنگرد آہستہ سے اپنے ساتھی شاردوت سے کہتا ہے کہ یہ راجہ بڑا بھاگوان ہے۔ یہ راہِ راست سے نہیں ہٹا اس کے راج میں نیچ ذات والے بھی دھرم کی ڈگر سے نہیں ہٹتے مگر اسے کیا کروں کہ میری تنہائی پسند طبیعت اس بھیڑ بھاڑ سے گھبراتی ہے اور مجھے اس آنگن میں ہر طرف آگ ہی آگ نظر آتی ہے۔

شاردوت اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے نجس کہ ان عشرت پسندوں کو میں خود اس نظر سے دیکھتا ہوں جس نظر سے کوئی پاک صاف کسی نجس کو' کوئی ہوشیار کسی نیند کے مارے کو یا کوئی آزاد کسی غلام کو دیکھتا ہے۔

اس وقت شکنتلا اپنی بدشگونی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ہائے میری آنکھ کہاں پھڑک رہی ہے۔ گومتی اس کا وہم دور کرنے کے لیے کہتی ہے کہ بیٹی گھبرانے کی ضرورت

نہیں- اب دیوتا تیرا بھلا کریں گے اور تو سکھ پائے گی- ایک پجاری راجہ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ اے سنیاسی بھائیو! تم نے راجہ کا پاس ادب دیکھا کہ وہ پہلے سے کرسی چھوڑ کر تمہارا انتظار کر رہا ہے- شارنگرداس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے ان کا بڑا پن ظاہر ہوتا ہے اور ہم تو کہتے ہیں کہ یہی ان کا فرض تھا جس طرح پھل لانے والے پیڑ جھک جاتے ہیں' بادل آئیں تو وہ نیچے اتر تے ہیں- اچھے لوگوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ غریبوں کے سامنے جاتے ہیں- دوسرے کا بھلا کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں-

دشنیت راجہ ہستنا پور کی نظر نے شکنتلا کو دیکھا تو بھولا کہ یہ گھونگھٹ نکالے کون سندری ہے- یہ تو جیسے سوکھی پتیوں میں نئی کونپل آ گئی ہے- چوبدار راجہ کی تائید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کا حسن و جمال دیکھنے کے قابل ہے- شکنتلا کا دل دھڑکنے لگتا ہے تو وہ دل سے کہتی ہے کہ اے دل تو خواہ مخواہ بیٹھا جا رہا ہے- پریتم کے پیار کو یاد کر اور صبر سے کام لے-

اب پجاری راجہ سے کہتا ہے کہ یہ لوگ کنورشی کا کوئی پیغام لائے ہیں- وہ آپ کو سنانا چاہتے ہیں- راجہ حکم دیتا ہے کہ یہ پیغام سنائیں- میں توجہ سے سن رہا ہوں- پہلے یہ فرمایئے کہ آپ کے تپ میں کوئی روک ٹوک تو نہیں ہے- شارنگرد جواب میں راجہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب تک آپ اس جہان کے امین ہیں تب تک دھرم کے کاموں میں کیسے رکاوٹ پڑ سکتی ہے- جہاں سورج چمکتا ہے وہاں اندھیرے کا کیا کھٹکا- راجہ پوچھتا ہے کہ کنو رشی کے مزاج تو اچھے ہیں؟ شارنگرد راجہ کو بتاتا ہے کہ کنورشی بالکل خیرت سے ہیں- ہاں انہوں نے ایک سندیسہ آپ کو ضرور بھیجا ہے- راجہ اشتیاق سے کہتا ہے کہ رشی کا سندیسہ اسے فوراً سنایا جائے-

اب شارنگرد بات کو کھولتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ دونوں نے آپس میں رضامندی سے پریم بیاہ کیا جسے رشی نے پسند کیا کیونکہ ان کی نظر میں آپ نیکوں کے سرتاج ہیں اور شکنتلا

عورتیں کی رانی ہے۔ اب تک بھگوان کو شکایت ملتی رہی ہے کہ ان میں جوڑی ملاتے ہیں لیکن دشنیت اور شکنتلا کی جوڑی ملا کر بھگوان نے یہ کلنک دھویا ہے۔ اب دھرم ریت کے مطابق آپ اس حاملہ کو قبول کیجیے۔ شارنگرد کی بات ختم ہوتے ہی گوتمی مائی بول پڑتی ہیں کہ راجہ صاحب مجھے بھی آپ کے حضور کچھ عرض کرنا ہے لیکن سوچتی ہوں کہ کہوں یا نہ کہوں۔ اس نے یعنی شکنتلا نے شادی کے بارے میں اپنے بڑے بوڑھوں سے نہیں پوچھا اور نہ آپ نے اپنے بھائی بندوں کی رائے لی۔ اس صورت میں کسی تیسرے کے بولنے کا حق نہیں رہ جاتا۔

ان دونوں کی باتیں سن کے راجہ جیسے گھبرا جاتا ہے اور قدرے غصے سے کہتا ہے کہ کیسا سوانگ ہے؟" اس وقت شارنگرد کو بھی غصہ آ جاتا ہے۔ وہ چیخ کے کہتا ہے "راجہ جی! یہ آپ نے کیا کہا۔ آپ تو دنیا کی راہ ورسم سے بخوبی واقف ہیں۔ کوئی سہاگن اگر میاں کے جیتے جی اپنے میکے میں جا رہے تو لوگ اس پر انگلیاں اٹھاتے ہیں چاہے وہ کیسی ہی ستی ساوتری ہو۔ وہ اپنے پیا کی پیاری ہو یا نہ ہو لیکن گھر والوں کی یہی مرضی ہوتی ہے کہ جوان عورت اپنی سسرال یعنی اپنے شوہر کے گھر رہے۔

راجہ گھبرا کر سوال کرتا ہے کہ آپ لوگوں کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ میں نے کبھی اس دیوی سے بیاہ کیا تھا۔ اس وقت تو شکنتلا کو مایوسی ہو جاتی ہے مگر شارنگرد ذرا غصے سے کہتا ہے "راجہ جی اگر اپنی پتنی شکنتلا سے کوئی غلطی سرزد ہو بھی گئی ہے تو کیا ایک راجہ کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ اپنے دھرم کو بھول جائے؟"

اب راجہ کو بھی غصہ آ جاتا ہے اور ڈپٹ کر پوچھتا ہے کہ آخر اس بے بنیاد قیاس کا کوئی ثبوت ہے؟ شارنگرد بھی اتنے ہی سخت لہجے میں جواب دیتا ہے کہ دولت کا نشہ نیت کو ڈانواں ڈول کر دیتا ہے راجہ جی۔ اس پر راجہ کو اور زیادہ طیش آ جاتا ہے اور وہ شارنگرد کو وارننگ دیتا ہے کہ وہ اس توہین کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اس وقت گوتمی مائی آگے آتی ہیں اور شکنتلا سے کہتی ہیں کہ بیٹی پل بھر کے لیے لاج شرم چھوڑو- مجھے اجازت دو کہ میں تمہارا گھونگھٹ ہٹادوں تاکہ تمہارا دولہا تمہیں پہچان لے- یہ کہتے ہوئے گوتمی مائی شکنتلا کے چہرے سے گھونگھٹ ہٹا دیتی ہے- راجہ کی نظر جونہی شکنتلا کے مکھڑے پر پڑتی ہے تو وہ فوراً بول اٹھتا ہے کہ اس کا حسن ابھی نوبہار ہے لیکن یہ بیاہی ہے یا کنواری؟ یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے- اس شبہ کی وجہ سے نہ تو اسے قبولا جاتا ہے اور نہ چھوڑا جاتا ہے-

اس طرح راجہ شکنتلا کو نہ پہچانتے ہوئے بھی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے اور اس کا چوبدار بول پڑتا ہے کہ سرکار اگر گھر بیٹھے ایسی پری آئے تو پھر کون ہچر مچر کرتا ہے-

ادھر راجہ دم بخود کھڑا کچھ سوچ رہا ہے کہ شارنگردا سے بلوانے کے لیے کہتا ہے کہ راجہ صاحب آپ نے آخر چپ کیوں سادھ لی- راجہ پریشان ہوکر جواب دیتا ہے کہ میرے دوستو میں بار بار غور کرتا ہوں لیکن یاد نہیں پڑتا کہ میں نے اس سے کبھی لگن لگایا تھا- پھر اس حالت میں وہ اس وقت حمل سے ہے- میں اسے کیسے اپنالوں- میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا کہ پرائی عورت کو گھر ڈال لیا-

بیچاری شکنتلا گھبرائی کھڑی ہے اور خود سے کہتی ہے کہ ہائے ری قسمت! انہیں تو بیاہ سے ہی ایک میرے سے انکار ہے- ہائے میری تمناؤں کا تو طلسم ٹوٹ گیا- ادھر شارنگرد کو بہت غصہ آتا ہے اور وہ راجہ کو پھٹکارتا ہے کہ ایک راجہ کو کیا یہ زیب دیتا ہے کہ وہ ایک رشی کو اس طرح ذلیل کرے- راجہ نے رشی کی بیٹی کو دھوکہ دے کر اپنی غیرت بگاڑی مگر رشی دل میں ملال نہ لایا اور راجہ کے بیاہ کو تسلیم کرلیا مگر راجہ کا یہ حال ہے کہ اس نے جس کا مال چرایا ہے اب وہی یہ مال چور کے پاس اس لیے بھیج رہا ہے کہ وہ سچا اور ساہو کہلائے-

شاردوت' شارنگرد سے کہتا ہے کہ بھیا اب تم چپ ہو جاؤ- پھر شکنتلا سے کہتا ہے کہ

بہن شکنتلا ہمیں جو کہنا تھا کہہ چکے- اب تم خود راجہ پر اپنی سچائی ثابت کرو- شارودت کے کہنے پر شکنتلا راجہ کو مخاطب کرتی ہے اور تند لہجے میں کہتی ہے کہ راجہ صاحب آشرم میں جھوٹے وعدے وعید کر کے جس بھولی بھالی کو آپ ایک بار دھوکہ دے چکے ہیں اسے اس بیدردی سے ٹھکرانے کی ہمت آپ نہ کریں گے تو اور کون کرے گا-

راجہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر شکنتلا کو ڈانٹتا ہے کہ توبہ کر لڑکی توبہ کر- تو نے اپنے گھرانے کو رسوا کیا سو کیا اب تو مجھے اپنے ساتھ لپیٹے میں کیوں لیتی ہے- تیری مثال تو اس ندی جیسی ہے جو اپنے کنارے کو کاٹنے گئی تھی- پیڑوں کو گرایا' سو الگ' اپنے پانی کو بھی گدلا کر آئی- راجہ کی اس بات پر شکنتلا کو بہت غصہ آیا اور اس نے چیخ کر کہا اور راجہ! اگر تم مجھے پرائی عورت سمجھ کر یہ برتاؤ کر رہے ہو تو میں نشانی کی انگوٹھی دکھا کر ابھی سب بھرم دور کیے دیتی ہوں-

راجہ نے اس کی یہ بات فوراً مان لی مگر شکنتلا نے جب انگوٹھی کے لیے اپنا ہاتھ دیکھا تو اس کی انگلی خالی تھی- اب تو شکنتلا کے ہاتھ کے طوطے اڑ گئے- وہ زور سے چلائی- ہائے میری انگوٹھی کہاں گر پڑی- گوتمی مائی نے شکنتلا کو یاد دلایا کہ جس وقت وہ پشمی تیرتھ کے پاس گنگا جی میں کھڑی پوجا کر رہی تھی- اس وقت اس کی انگوٹھی پانی میں گر گئی ہوگی-

اب راجہ کی باری تھی- اس نے ان کا مذاق اڑانے کے لیے کہا کہ کون کہتا ہے کہ عورتیں حاضر جواب نہیں ہوتیں- گوتمی نے راجہ کو سمجھایا کہ وہ ایسی بات منہ سے نہ نکالیں کیونکہ شکنتلا کی پرورش ایک آشرم میں ہوئی ہے- وہ فن فریب نہیں جانتی- راجہ نے اس کے جواب میں کہا کہ انسان تو ایک طرف حیوانوں میں بھی بے سکھائے پڑھائے یہ وصف پایا جاتا ہے- ذرا کوئل کو تو دیکھو کہ کس چالاکی سے وہ اپنے بچوں کی پرورش کوّوں سے کراتی ہے-

شکنتلا یہ سن کر غصے سے تھرا اٹھی- اس نے چیخ کے کہا کہ کمینے کہیں کے- ساری دنیا کو تو اپنے جیسا سمجھتا ہے- میں کیا جانتی تھی کہ دھرم کے بھیس کے نیچے چھل' کپٹ گھاس پھونس سے

ڈھکے ہوئے اندھے کنویں کی طرح چھپا ہوا ہے۔ پھر بھلا کون تیرا بھید پا سکتا ہے۔

راجہ نے شکنتلا کی کڑوی کسیلی باتوں کے جواب میں اقبال کیا کہ اس عورت کا غصہ بناوٹی نہیں ہے لیکن اس کا سبب صرف اتنا ہے کہ بن باسی بناوٹ کو نہیں جانتے۔ وہ کن انکھیوں سے نہیں دیکھتے۔ دیکھو اس کی آنکھوں میں لہو اتر آیا ہے۔ کتنے سخت لہجے میں بول رہی ہے اور زبان ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔ گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ یوں کانپ رہے ہیں جیسے جاڑے کے مارے کٹ گئے ہوں اور اس کی بھوئیں جو پہلے سے خمدار تھیں اب وہ ٹیڑھی ہو گئی ہیں۔ اس کے غصے نے جس کے حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں' میری سمجھ بوجھ کو بھی چکر میں ڈال دیا ہے۔ جب مجھے اس کے ساتھ بیاہ ہونے کی بات یاد نہ آئی اور میں برابر یہی کہتا رہا کہ ہم میں تم میں کبھی پیت بیوپار نہیں ہوا تو غصے کے مارے اس کی آنکھیں اس طرح چڑھ گئیں گویا یہ ابرو کو نچا کر کام دیو کی کمان کو توڑ دیں گی۔ دیوی یاد رکھ کہ دشنیت کی طبیعت سے سارا زمانہ واقف ہے۔ ایسی حرکت تو ہماری رعایا میں بھی نہ کسی نے دیکھی اور نہ سنی۔

راجہ کے اس طعنے کو سن کر شکنتلا شیرنی کی طرح بپھر گئی اور چیخ کر جواب دیا کہ زمانے کی خوبی دیکھ کہ منہ در منہ مجھے آوارہ بتایا جا رہا ہے۔ پرونس کی شرافت پر بھروسہ کر کے مجھ بدنصیب نے اس مار آستین کو سب کچھ سونپ دیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اس کی زبان پر شہد لیکن دل میں زہر ہلاہل بھرا ہوا ہے۔

شکنتلا کا یہ کہتے ہوئے ایسا دل بھر آیا ہے کہ وہ منہ ڈھک کر رونے لگی۔ شارنگرد نے راجہ کو طعنہ دیا کہ کان کھول کر سن لو کہ نفس کو بے لگام چھوڑو گے تو انجام کار یونہی جلو گے۔ جب تک ایک دوسرے کو اچھی طرح جانچ پرکھ نہ لو کسی سے دل نہ لگاؤ۔ بنا جانے بوجھے پریم کرو گے تو ایک نہ ایک دن ناامیدی کا منہ دیکھو گے۔

راجہ بگڑ گیا اس نے غصے سے کہا کہ ایک لڑکی کی بات پر ایسا ایمان کہ ساری تہمت میرے سر منڈھی جا رہی ہے۔ شارنگرد نے جواب دیا کہ بڑے لوگوں کا بڑا بول۔ جس نے جنم دن سے آج تک فریب کا نام نہیں سنا اس کا بیان سفید جھوٹ اور جو دھوکہ دہی کو علم سمجھ کر سیکھتے ہیں ان کی بات پتھر کی لکیر۔ راجہ نے بات ختم کرنے کے لیے کہا خیر ایسا ہی سہی۔ آپ سچے میں جھوٹا لیکن یہ تو بتائیے کہ اس سے فریب کر کے مجھے کیا ملے گا؟

''جہنم کی آگ'' شارنگرد نے جل کے جواب دیا۔ وہ بہت دیر سے غصے میں تلملا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ساتھی شارودت نے راجہ کو سمجھایا کہ جو بھی ہو شکنتلا آپ کی جورو ہے۔ آپ جانیے اور آپ کا کام۔ رکھیے یا چھوڑیے۔ بیوی پر شوہر کو ہر قسم کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے ساتھی شارنگرد سے کہتا ہے کہ میرے بھائی اب اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم نے گرو جی کا کہا پورا کر دیا۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ گوتمی ماتا آپ ہمارے آگے آگے چلیں۔

ان کے واپسی کے فیصلے سے شکنتلا چیخ پڑتی ہے کہ یہ تم لوگوں نے کیا کیا۔ مجھے تم اس دغاباز کے حوالے کر رہے ہو۔ مجھے اس طرح نہ ٹھکراؤ۔ گوتمی ماتا، شکنتلا کی سفارش کرتی ہیں کہ دیکھو تو اس بیچاری کو یہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی ہمارے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ شارنگرد غصے سے کہتا ہے کہ اگر راجہ سچ کہتا ہے تو تیرے باپ کو تجھ سے اب کیا واسطہ۔ تو نے خود خاندان کے بندھنوں کو توڑ کے اپنی مرضی سے بیاہ کیا ہے اگر تو سچی ہے تو تیرا دھرم یہ ہے کہ شوہر لونڈی بنا کے رکھے تب بھی اس کے قدموں میں پڑی رہ۔

راجہ اعتراض کرتا ہے کہ سادھو مہاراج اس بیچاری کو کیا چکمہ دیتے ہو۔ میں تو پرائی عورت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر راجہ اپنے ساتھ آئے ہوئے پجاری سے کہتا ہے کہ پنڈت جی! اب تم ہی اس گتھی کو سلجھاؤ۔ میں پرائی عورت کو ہاتھ لگانے کا پاپ نہیں کر سکتا۔

پجاری ایک نیک انسان تھا- اس نے راجہ سے کہا کہ بے چاری حاملہ ہے- اسے آپ بچہ ہونے تک میرے گھر میں رہنے کی اجازت دیجیے اور یہ یاد رکھیے کہ بڑے بڑے رشی اور نجومیوں نے پیشین گوئی کی ہے کہ آپ کی پہلی اولاد ایک لڑکا ہوگا جو دنیا پر راج کرے گا اگر اس رشی کماری نے بیٹا جنا اور اس میں آپ کے سب لچھن (خوبیاں) ہوئے تو آپ اسے رانی بنائیں نہیں تو اسے تپ بن واپس بھجوادیں-

راجہ اس فیصلے کو نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس دوشیزہ سے کبھی میں نے دل لگایا تھا لیکن میرا دکھتا دل کہتا ہے کہ یہ سچی ہے-

(۱۶)

دوسرے دن یہ واقعہ پیش آیا کہ راجہ کا سالا جو شہر کا کوتوال تھا اس کے حضور سپاہی نے ایک چور کو پیش کیا جس پر ایک انگوٹھی کی چوری کا الزام تھا- دریافت کرنے پر مبینہ چور نے بتایا کہ وہ چور نہیں بلکہ مچھیرا ہے- ایک دن پہلے اس نے جو مچھلیاں پکڑی تھیں ان میں سے ایک مچھلی کے پیٹ سے ایک ہیرے کی انگوٹھی برآمد ہوئی تو مچھیرا اس انگوٹھی کو بیچنے بازار میں گیا تو اسے شہر کے کوتوال نے چوری کے جرم میں گرفتار کرلیا- غریب مچھیرے نے بہت کہا سنا کہ وہ چور نہیں ہے بلکہ یہ انگوٹھی اس کی پکڑی ہوئی ایک مچھلی کے پیٹ سے نکلی ہے-

کوتوال نے وہ انگوٹھی راجہ کے حضور پیش کی تو راجہ اسے دیکھ کر چونک پڑا اور اس کی یادداشت فوراً آپس آ گئی- اس قدر خوش ہوا کہ اس نے مچھیرے کو انعام بھجوایا- پھر راجہ نے مادھو کو بلا کر کہا کہ اب مجھے شکنتلا کا سارا قصہ یاد آ گیا لیکن میں نے تمہیں بھی تو سارا قصہ سنایا تھا حالانکہ تم اس وقت موجود نہ تھے جب میں نے سر عام اس کی توہین کی تھی مگر تم نے اب تک بھول کے بھی اس کا ذکر مجھ سے نہ کیا- کیا میری طرح تم بھی اس بات کو قطعی بھول گئے تھے- اب میں کیا کروں- جب میں نے اسے دھتکار دیا تو اس کی حالت ایسی خراب ہوئی تھی کہ یاد

کر کے کلیجے سے ہوک اٹھتی ہے- جب میں نے شکنتلا سے کہہ دیا کہ تجھے نہیں پہچانتا تو وہ اپنے ساتھیوں کے پیچھے بھاگی تھی مگران میں سے ایک نے جھڑک کر کہا تھا کہ تجھے یہیں رہنا ہوگا- اس وقت شکنتلا نے ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھا تھا- وہ نظریں مجھے اب تک یاد ہیں-

راجہ نے بتایا کہ میں نے سنا ہے کہ اس کی ماں منیکا نامی پری ہے- ہو نہ ہو اسی کی سہیلیاں اٹھا کر لے گئی ہوں گی- مادھو راجہ کو سمجھاتا ہے کہ راجہ بہادر آپ فکر نہ کیجیے- یہ انگوٹھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کھوئی ہوئی چیز مل بھی جایا کرتی ہے- بھگوان کے کاموں کو کوئی کیا سمجھے- راجہ انگوٹھی کو دیکھ کر بڑبڑاتا ہے کہ یہ انگوٹھی کتنی بدنصیب ہے کہ یہ اس مقام سے جا گری ہے جہاں دوبارہ پہنچانا اس کے لیے ناممکن ہے- اری مندری! تیرے انجام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تو بھی میری طرح قسمت کی کھوٹی ہے کیونکہ تو ان حنائی انگلیوں تک ایک بار پہنچ کر پھر نیچے گر پڑی- مادھو نے راجہ سے پوچھا کہ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ انگوٹھی شکنتلا تک کس طریقے سے پہنچی- راجا نے بتایا کہ جب میں تپ بن سے راجدھانی کو لوٹنے لگا تو میرے محبوب نے آنکھوں میں آنسو لاکر پوچھا کہ ساجن' پھر کب میری خبر لو گے؟ اس کے جواب میں یہ انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا کر میں نے کہا کہ اس میں جتنے اچھر ہیں انہیں تم ہر روز ایک ایک کر کے گنا کرنا- جس دن وہ ختم ہو جائیں تے سمجھ لینا کہ آج کوئی لینے آئے گا- لیکن ہائے مجھے اس کی یاد ہی نہیں رہی-

آخر شکنتلا کی سکھی سانومتی نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا کہ سنجوگ کا کیسا پیارا ڈھنگ نکالا تھا مگر قسمت نے سارا کھیل بگاڑ دیا- راجہ نے کہا یہ سب کیا دھرا اس انگوٹھی کا ہے- اچھا اب میں ذرا اس سے پوچھتا ہوں- پس راجہ نے انگوٹھی کو اس طرح مخاطب کیا-

''اری او مندری! ذرا یہ تو بتا کہ تو نے ان نازک نازک انگلیوں سے جدا ہو کر پانی میں

گرنے کی ہمت کیسے کی؟ لیکن یہ تو ایک بے جان چیز ہے- مجھے دیکھو کہ ہوش وحواس رکھتے ہوئے بھی میں نے رانی کو چھوڑ دیا اور اسے جانے دیا- پھٹکار ہے مجھ پر کہ میں نے گھر آتے ہوئے سکھ کو بھگا دیا- بیوی ہی گھرانے کی لاج ہوتی ہے اور پھر وہ تو میری اولاد کو جنم دینے والی تھی- میں نے اسے اس طرح نکال دیا جیسے فصل آنے کے موسم میں کسان اپنی بوئی ہوئی کھیتی کو چھوڑ دے-لعنت ہے مجھ پر- میرے پرکھوں کی آتما پر کیا بیت رہی ہوگی- وہ سوچتے ہوں گے کہ دشنیت کے بعد ہم پر کون فاتحہ پڑھے گا اور اب بس میرے دیے ہوئے پانی کو رو روکر پیتے ہوں گے-

اور راجہ دشنیت شدت غم سے بے ہوش ہو جاتا ہے-

سانومتی کہتی ہے کہ ہائے اس گھڑی اس کی وہی حالت ہے جیسے سامنے رکھے ہوئے ڈیوٹ (چراغ) پر پردہ پڑنے سے ہر کسی کو اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے- میں تو ابھی اس کا دکھ دور کر دیتی مگر کیا عرض کروں- اندر بھگوان کی ماتا' شکنتلا کو یہ سمجھاتے سن چکی ہوں کہ دیوتا جتن کر رہے ہیں جس سے تیرا دولہا تھوڑے دنوں میں خود ہی تیری زندگی اجالنے آئے گا- اس لیے جب تک وہ نیک ساعت نہ آ جائے مجھے کچھ نہ کرنا چاہیے- ہاں اتنا تو کروں گی کہ اپنی پیاری سکھی کو یہ ساری داستان سناؤں تاکہ اسے کچھ تسلی ہو-

اس وقت پس پردہ' خون' خون' دوڑو' بچاؤ کی آوازیں بلند ہوتی ہیں-

راجہ کہتا ہے کہ یہ آواز تو مادھو کی معلوم ہوتی ہے- کیا کوئی اسے ستا رہا ہے- ایک عرض بیگی راجہ کو بتاتی ہے کہ مہاراج! جانے وہ موا کوئی بھوت یا پریت ہے کسی کو نظر نہیں آتا- اس نے مادھو کی مشکیں کس کر اسے منڈیر پر ڈال دیا ہے- راجہ آواز دیتا ہے کہ میرا تیر کمان لایا جائے- ایک بھیلن راجہ کو تیر کمان دے کر کہتا ہے کہ راجہ بہادر اپنا دست پوش اور کمان سنبھالیے- راجہ تیر کمان لیتا ہے اس وقت پس منظر سے آواز آتی ہے میں تیرے لہو کا پیاسا

ہوں- جیسے شیر تڑپتے ہوئے شکار کو مارتا ہے ویسے ہی میں تجھے کھا جاؤں گا- اب بتا دکھیوں کا رکھوالا دشنیت جو بڑا تیر انداز بنتا ہے کہاں ہے؟ بچائے نا تجھے آ کر- راجہ کڑک کے جواب دیتا ہے تو مجھے خبر دار کر رہا ہے- ٹھہر جا! تیری موت تیرے سر پر منڈلا رہی ہے-

پھر راجہ چلا چڑھا کر کہتا ہے کہ کوئی ہے جو مجھے راستہ دکھائے- ایک عرض بیگی کہتی ہے کہ مہاراج راستہ یہی ہے- چنانچہ دونوں تیزی سے چلتے ہیں- جب کوئی نظر نہیں آتا تو راجہ کہتا ہے کہ یہاں تو کوئی نظر نہیں آتا- اس وقت پس پردہ سے آواز آتی ہے- مہاراج! راجہ ادھر ادھر دیکھتا ہے- آواز پھر آتی ہے کہ مہاراج میں تو آپ کو دیکھ رہا ہوں آپ مجھے کیوں نہیں دیکھ سکتے-

اب راجہ آواز دے کر کہتا ہے کہ اے جادوگر! میں اگرچہ تجھے نہیں دیکھ سکتا تو کیا ہوا میرا تیر تو تجھے دیکھے گا- لے سنبھل جا- میں تیرے سینے کو چھید کر اس برہمن کو اس طرح بچا لوں گا جیسے ہنس پانی میں سے دودھ نکال لاتا ہے-

اس وقت بھگوان اندر کا رتھ بان ماتلی آتا ہے اور راجہ سے کہتا ہے کہ بھگوان اندر نے تو راکششوں کو آپ کے تیر کا ہدف بنایا ہے اور آپ ان ہی پر تیر چلائیں گے- رشیوں پر تو رحمت کی بارش ہونی چاہیے نہ کہ تیروں کی یورش- راجہ اس سے پوچھتا ہے کہ اے اندر کے رتھ بان ماتلی تم یہاں کیسے آئے؟ ماتلی بتاتا ہے کہ آپ ہی کے پاس آیا ہوں- راجہ کے پوچھنے پر ماتلی بتاتا ہے کہ بھگوان اندر نے آپ کو راکششوں کے گھرانے ''درجے'' کے سردار کو ختم کرنے پر آپ کو مقرر کیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو لے کر آکاش (آسمان) پر جاؤں اور آپ اس بدذات کا خاتمہ کریں-

پس راجہ اندر بھگوان کے رتھ پر سوار ہو کر آکاش پر جاتا ہے- وہاں راجہ کی ملاقات پہلے اپنے بیٹے سے ہوتی ہے جو کہتا ہے کہ میرا باپ دشنیت ہے- راجہ مسکرا کر بیٹے کو گلے لگا لیتا

ہے- اس وقت بال کھولے ہوئے شکنتلا بھی آتی ہے- راجہ اسے دیکھ کر کہتا ہے کہ یہی میرے دل کی رانی ہے- بہت دنوں سے تپ (عبادت) کرتے کرتے بدن سوکھ گیا ہے- بال الجھے ہوئے ہیں تن پر گیروالباس ہے سب چھوڑ کر مجھ سنگدل کے لیے یہ باوفا بروگ کا دکھ سہہ رہی ہے-

راجہ بڑے دکھ کے ساتھ شکنتلا سے کہتا ہے کہ اے میری دیوی! میں نے تم پر اتنا ظلم کیا ہے لیکن اس کا انجام بھی مبارک ہوا کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ تم مجھے بھولی نہیں- شکنتلا خود کلامی کے انداز میں کہتی ہے کہ اے میرے سہمے ہوئے دل تو صبر کر مجھے یقین ہو چلا کہ قسمت نے آخر میرے دن بھی پھیر دیے- ہاں میرے سوامی یہی ہیں راجہ کہتا ہے کہ یہ کیسی نیک ساعت ہے کہ میری آنکھوں کے آگے سے وہ پردہ ہٹ گیا اور اب میں اپنی پیاری کو اس طرح روبرو دیکھ رہا ہوں جیسے گہن سے نکل کر دھندلایا ہوا چاند اپنی جوت کو دیکھتا ہے-

شکنتلا کا لڑکا ماں سے پوچھتا ہے کہ امی یہ تو بتاؤ کہ یہ آدمی کون ہے؟ اس پر شکنتلا کے آنسو نکل آتے ہیں اور وہ کہتی ہے کہ بیٹا یہ سوال اپنی قسمت سے پوچھ- راجہ اس وقت اس قدر شرمندہ ہوتا ہے کہ شکنتلا کے پیروں پر گر کر کہتا ہے کہ اے دیوی تو توہین اور بے قدری کے صدمے کو اپنے دل سے دھو ڈال- معلوم نہیں اس وقت مجھ پر کیسی خود فراموشی طاری ہو گئی تھی، میں تجھے بھول گیا- اپنی ناسمجھی کے باعث اپنے آگے رکھی ہوئی نعمت کو ٹھکرا دیا- اندھے کے گلے میں ہار ڈالو تو وہ سانپ سمجھ کر اسے پھینک دیتا ہے-

شکنتلا معافی مانگتے ہوئے کہتی ہے کہ اے میرے پیارے پتی- اب تم مجھے کانٹوں میں نہ گھسیٹو- ان دنوں میرے پچھلے جنم کے پاپ آگے آئے- جنہوں نے میری نیکیوں پر پردہ ڈال کر تمہیں مجھ سے برہم کر دیا- اب یہ کہو کہ مجھ دکھیا کی یاد تمہیں کیسی آئی- راجہ شرمندگی سے سر جھکا کر جواب دیتا ہے کہ میرے دل سے ندامت کا کانٹا نکل جائے تو

سناؤں- اس دن انجانے میں ہونٹ پر گرتے ہوئے تیرے آنسو کی بوند کو میں نے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیا تھا- اس پچھتاوے کو آج میں تیری پلکوں پر اٹکے ہوئے آنسو پونچھ کر ہٹاؤں گا اور اس کے ساتھ ہی راجہ اپنی پتنی کے آنسو پونچھتا ہے- اس وقت شکنتلا کی نظر راجہ کی انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی پر پڑتی ہے تو وہ پوچھتی ہے کہ کیا یہ وہی انگوٹھی ہے؟

راجہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہتا ہے کہ ہاں یہ وہی ہے- اس کے ملتے ہی مجھے تمہاری یاد آئی- شکنتلا افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ اس مندری نے کتنا ستم کیا- جب یاد دلانے کو میں نے اسے ڈھونڈا تو یہ گم ہو چکی تھی- راجہ کہتا ہے کہ پیاری شکنتلا دوبارہ سنجوگ ہونے کی نشانی کے طور پر لو یہ انگوٹھی تم پہن لو-

شکنتلا انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ تم ہی اسے پہنو مجھے اس پر بھروسہ نہیں- اب ماتلی راجہ کو مبارک باد دیتا ہے کہ راجہ نے کھوئی ہوئی رانی پائی اور بیٹے کا بھی منہ دیکھا- پھر ماتلی بتاتا ہے کہ مہاتما کشیپ آپ کے منتظر ہیں- راجہ چلتے ہوئے کہتا ہے کہ انگلی پکڑ لو- میں تمہارے ساتھ اس مہارشی کے درشن کروں گا-

مگر شکنتلا کو شرم آتی ہے اور وہ کہتی ہے کہ مجھے تمہارے سنگ بزرگوں کے سامنے ہوتے ہوئے شرم آتی ہے- راجہ اس پر زور دیتا ہے کہ اس مبارک موقع پر لاج اور شرم کی کیا ضرورت ہے- مختصر یہ کہ یہ لوگ کشیپ کے ساتھ جاتے ہیں جو اپنی بیوی اومتی کے ساتھ بیٹھے دکھائی دیتے ہیں- کشیپ اپنی بیوی کو بتاتا ہے کہ تمہارے سپوت اندر کی فوج کا سردار اور سنسار کا رکھوالا راجہ دشنیت یہی ہے- اومتی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اس کی چال ڈھال ہی سے اس کی بڑائی ظاہر ہوتی ہے-

ماتلی راجہ سے آہستہ سے کہتا ہے کہ مہاراج دیکھا آپ نے دیوتاؤں کے ماتا پتا کو- آپ کی طرف یہ اس شفقت سے دیکھ رہے ہیں جیسے کوئی اپنی اولاد کو دیکھتا ہے- آگے بڑھیے

اوران کے قدموں میں سر جھکا یئے - راجہ رانی سے پوچھتا ہے کہ ماتلی کیا کشیپ اوراومتی یہی ہیں؟ کیاان ہی نے سیاروں اور ستاروں کی تخلیق کی تھی - کیا یہی اندر کے جنم داتا ہیں - کیاان ہی کی کوکھ سے دشندوامن اوتار بن کے پیدا ہوئے تھے -

ماتلی تصدیق کرتا ہے اور بتا تا ہے کہ جی ہاں وہ یہی ہیں -

یہ سن کر راجہ فوراً سجدہ میں گر جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اندر سیوک دشنیت آپ دونوں کو پرنام کرتا ہے -

کشیپ راجہ کو دعا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ کیسی نیک ساعت میں تم سب کا ملاپ ہوا - پھر وہ شکنتلا کو مخاطب کرتا ہے کہ شکنتلا یہ ہونہار بچہ اور تم - یہ سمجھو کہ دھرم کا کرم اور دھن کا میل ہوا ہے -

راجہ ان کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ سب کچھ اس کی نوازش کا نتیجہ ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ دیکھا یہ گیا ہے کہ پہلے پھول آتا ہے پھر پھل لگتا ہے' پہلے بادل آتا ہے پھر بارش ہوتی ہے - لیکن آپ کی قدرت نرالی ہے کہ میری مراد پہلے پوری ہوئی اور دعا بعد میں ملی -

کشیپ کہتے ہیں کہ دشنیت اب تمہیں گناہ کا خیال دل سے نکال دینا چاہیے کیونکہ یہ سب کچھ انجانے میں سرزد ہوا اب تم میری بات توجہ سے سنو -

راجہ اور دوسرے موجود لوگ سب ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں - کشیپ بیان کرتے ہیں کہ منیکا سے اپنی بیٹی کا الم نہیں دیکھا گیا اور وہ اسے اومتی دیوی کے پاس اٹھا لائی - اس وقت میں نے کشف سے معلوم کرلیا کہ تم نے درواسا (بددعا دینے والا) کی بددعا کی وجہ سے اس کو (رانی) تج دیا ہے اور جب تک انگوٹھی نہ ملے گی اس بددعا کا اثر باقی رہے گا -

اس وقت راجہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ شکر ہے کہ وہ اس گناہ اور الزام سے بچ گیا مگر راجہ کی بات ختم ہوتے ہی رانی نے اس کی بات پکڑ لی اور کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

میرے پیارے نے مجھے جان بوجھ کر نہیں ٹھکرایا تھا لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مجھے کس نے اور کب بددعا دی تھی۔ شاید کہ اس وقت میں اپنے دکھ میں اپنا پرایا بھول گئی تھی کیونکہ بدائی کے سمے ساتھیوں نے بھی بتایا تھا کہ دولہا کو انگوٹھی دکھا دینا۔

کشیپ نے اس وقت شکنتلا کو نصیحت کی کہ اسے اب سب حال معلوم ہو گیا ہے اس لیے وہ اپنے میاں کو پھر کبھی مجرم قرار نہ دے۔ بددعا کی وجہ سے وہ خود فراموشی میں مبتلا ہو گیا اور تجھے بھلا دیا۔ اب وہ ساعت ٹل گئی اور تجھے اپنا راج پاٹ مل گیا۔ گرد پڑ جانے سے درپن میں عکس نہیں پڑتا مگر صاف کر دو تو کیسا جگمگانے لگتا ہے۔

راجہ فوراً بچے کا ہاتھ تھام کر دعا کرتا ہے کہ پربھو۔ یہ میرے ہنس کا نام لیوا اور پانی دیوا ہو۔ کشیپ نے راجہ سے پوچھا کہ بتاؤ تمہیں کوئی اور آشیرباد چاہیے۔ راجہ نے فوراً سر جھکا دیا اور بھرائی آواز میں یوں کہا کہ اے پربھو آپ نے تو اتنا دیا کہ میں اسی سے زیر بار ہو گیا تاہم اگر آپ پوچھتے ہیں تو دعا دیجیے کہ بھرت کا یہ بچن پورا ہو کہ

''راجا اپنی پرجا کی بھلائی کے دھیان میں رہا کریں' پنڈت گیان کی سیوا کیا کریں اور مہادیو مجھے نجات کا راستہ دکھائیں۔''

اور کشیب نے دعا دی ''جاؤ......یہی ہوگا۔''

میری مارتھا اور سلطانِ ترک

جس کی بے لوث محبت کا تڑپا دینے والا انداز آج بھی دلوں کو گدگداتا ہے۔

نپولین کی بیوی جوزیفین نے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ بچپن میں ایک نجومی نے اسے بتایا تھا- وہ پہلی شادی سے دو بچوں کی ماں بننے کے بعد بیوہ ہو جائے گی جبکہ اس کا دوسرا خاوند دنیا بھر میں شہرت' عزت اور قوت کی انتہائی بلندیوں کو چھوئے گا- وہ ملکہ کہلائے گی لیکن زندگی کے آخری ایام غم واندوہ میں گزریں گے- اسی طرح جوزیفین نے رشتہ کی بہن اور ہم عمر سہیلی میری مارتھا ایمی کے بارے میں بھی اسی نجومی کی پیشگوئی کے متعلق بتلایا کہ وہ بحری قزاقوں کے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد شاہی محل میں کنیز کی حیثیت میں داخل ہوگی- اس کا بیٹا ملک پر حکومت کرے گا مگر وہ خوشی کے ان دنوں میں وفات پا جائے گی-

میری مارتھا ایمی کا جدامجد ڈوئیل میں مدمقابل کو ہلاک کرنے کے بعد ملک سے فرار ہو کر ویسٹ انڈیز چلا آیا اور یہیں آباد ہو گیا- ایمی اس کی پوتی تھی- لوئیس کی تخت نشینی کے تین سال بعد ایمی کو فرانس کے کانونٹ سکول میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا- اس سکول کے مذہبی ماحول اور تعلیم نے اسے زندگی کی روحانیت سے دوچار کر دیا- وہاں چھ سال تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب گھر جانے کا وقت آیا تو امریکی مقبوضات کی وجہ سے فرانس اور امریکہ میں جنگ چھڑ گئی اور بحری سفیر غیر محفوظ ہو گیا- ایمی کو مجبوراً مزید کچھ عرصے کے لیے فرانس ہی میں رکنا پڑا اور ۱۷۸۴ء میں دونوں ممالک کے تعلقات بہتر ہونے پر وہ اپنی

خاص ملازمہ کے ساتھ گھر روانہ ہوئی۔

ایمی کے لیے یہ سفر ہر اعتبار سے پریشان کن ثابت ہوا۔ ایک تو جہاز کی حالت بہت خستہ تھی اور دوم سمندر میں طوفان نے رہی سہی کسر نکال دی۔ مسافروں کی خوش قسمتی سے عین وقت پر ایک ہسپانوی تجارتی جہاز اس طرف آ نکلا اور ڈوبتے ہوئے جہاز کے تمام مسافر اور عملے کو بچالیا گیا۔ اس ہسپانوی جہاز نے تمام مسافروں کو قریبی جزیرے پر پہنچانے کے لیے سفر کا آغاز کیا ہی تھا کہ بحری قزاقوں نے تعاقب شروع کر دیا۔ ان بحری قزاقوں کو ترکی کے سلطان کی حمایت و تعاون حاصل تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بڑی دیدہ دلیری سے سمندر میں دندناتے پھرتے تھے۔ انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر افریقہ میں قائم کر رکھا تھا۔ انہیں لوٹ مار میں جو کچھ بھی ہاتھ لگتا اپنے سرغنہ کو پیش کر دیتے اور جب کبھی کوئی انمول چیز ان کے ہاتھ لگتی ان کا سرغنہ ترکی کے سلطان کے حضور تحفتہً پیش کر دیتا۔ اس مرتبہ لوٹ مار میں ان کے ہاتھ سب سے قیمتی اور انمول چیز اکیس سالہ سفید فام سنہری زلفوں والی ایمی لگی تھی۔

ایمی کو دیکھتے ہی اسے ترکی کے سلطان کو تحفے میں دینے کے لیے ایک طرف کر دیا گیا۔ اس زمانے میں غلاموں کی تجارت بہت عام تھی اور خوبصورت جوان لڑکیوں کے تو منہ مانگے دام ملتے تھے۔ عرب امراء صرف لڑکیوں ہی کے خریدار نہیں تھے بلکہ خوبرو کڑیل لڑکوں کو بھی بھاری رقمیں ادا کر کے خریدا کرتے تھے۔ ترکوں میں ان غلام لڑکوں کو خصی کر کے خواجہ سرا کا کام ان کے سپرد کیا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ غلام مرد یا عورتیں سیاہ فام ہی ہوا کرتی تھیں جبکہ ایمی کا تعلق سفید فام قوم سے تھا۔ خدا نے اسے غیر معمولی حسن کی نعمت سے بھی نواز رکھا تھا اور وہ خاصی پڑھی لکھی بھی تھی۔

وہ اپنے بارے میں کئے جانے والے فیصلے سے بے خبر کمرے میں بند خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی لیکن لمحے گھنٹوں میں تبدیل ہونے کے بعد رات بھی خیریت سے گزر گئی اس

کی توقع کے خلاف اسے ہر طرح کا آرام پہنچایا گیا اور چند دن گزرنے کے بعد انتہائی قیمتی زرق برق ترکی لباس پہنا کر ترکی بھیجنے کے لیے سوار کیا گیا۔ ترکی کے دارالحکومت قسطنطنیہ کی بلند و بالا منقش عمارات' اونچے میناروں والی اعلیٰ شان مساجد' پھلوں سے لدے ہوئے باغات' اذیت پہنچانے کے ہولناک چیمبر' قید خانے کی فلک بوس دیواریں' اصطبل اور سب سے منفرد اور عالی شان سلطان کا محل ایمی کے لیے یہ سب کچھ بالکل نیا ہونے کے ساتھ از حد دلچسپ بھی تھا۔ وہ بارونق بازاروں سے گزر کر سلطان کی حرم سرا کے دروازے پر پہنچی جہاں سیاہ فام لحیم شحیم خواجہ سرا کلذر آغا نے اسے بحری قزاقوں سے وصول کر کے حرم سرا میں داخل کر لیا۔

سلطان کے حرم میں داخل ہونے والی وہ تنہا لونڈی نہیں تھی۔ پانچ سو پہلے سے وہاں موجود تھیں جن میں بارہ سال کی عمر سے لے کر تیس بتیس سال تک کی ہر عمر کی مختلف قوموں کی لڑکیاں اور عورتیں شامل تھیں۔ یہ سب خوبصورت عورتیں اور لڑکیاں صرف ایک مرد کا دل بہلانے کے لیے مخصوص تھیں۔ وہ صبح سے شام تک بناؤ سنگار اور آرائش و زیبائش کرنے میں مصروف رہتیں لیکن کسی کو بھی یہ علم نہ ہوتا کہ سلطان ان میں سے کس کو شب بسری کے لیے طلب کرے گا اور کس کی قسمت جاگنے والی ہے۔ ایمی جس نے اپنی زندگی کے چھ سال کانونٹ سکول میں رہبانیت کی تعلیم حاصل کرنے میں صرف کیے تھے اس کے لیے حرم سرا کا یہ ماحول انتہائی غلیظ اور قابل نفرت تھا۔

یہاں آنے کے ابتدائی چند دنوں کے دوران وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ شاید نیک دل خواجہ سرا یا سلطان اس پر رحم کھا کر رہا کر دیں یا پھر فرانس کی حکومت اس کی رہائی کے لیے سفارتی سطح پر کچھ کرے مگر بہت جلد اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی اور اسے مجبوراً جنسی غلاظت سے بھرے ہوئے اس ناپاک ماحول کو قبول کر لینے ہی میں اپنی عافیت دکھائی دی۔ اسے اس

کربناک حقیقت کا بھی علم ہو گیا کہ خواجہ سرا کلذر آغا ہی اس کے مستقبل کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے- نیز وہ اپنی بھرپور جوانی اور ہوشربا حسن سے بھی فائدہ اٹھا سکتی ہے ورنہ اسے زندگی بھر شاندار اور آرام دہ حرم سرا کی قید میں رہنا ہوگا جہاں اس کی طرح پانچ سو لونڈیاں اور بھی موجود ہیں اور ہر ایک سلطان کے بستر کی زینت اور اس کے بیٹے کی ماں بننے کے لیے کوشاں ہے تاکہ ''سلطانہ'' کہلانے کی مستحق ہو-

سلطان کے محل کی چار دیواری کے اندر حرم سرا کے علاوہ غلاموں کی رہائش گاہیں' گارڈ ہاؤس' خصی کرنے کا چیمبر' خواجہ سراؤں کی رہائش کے لیے بے شمار کمرے' قیدیوں اور مجرموں کو اذیت پہنچانے کا کمرہ اور تاج وتخت کے وارث کے لیے خاص کمرہ اور ان کے علاوہ درباریوں اور قاضی القضات کی رہائش گاہیں بھی تھیں-

ایمی کو سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ سلطان کی حرم سرا کا انچارج خواجہ سرا کلذر آغا مملکت کے تمام وزراء سے زیادہ باعزت اور بااختیار شخص تھا- اسے لونڈیوں پر زندگی اور موت کے اختیارات حاصل تھے- اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ اس کا اپنا مستقبل بھی کلذر آغا کے ہاتھ میں ہے جو انتہائی دیانتدار اور سلطان کا وفادار ہونے کے ساتھ معقول اور سمجھدار شخص ہے- کلذر آغا پہلے ہی دن سے ایمی میں خاص دلچسپی لینے لگا تھا- ہر روز اس کے پاس آتا اور ہر طرح سے اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھتا- اس نے ایمی کے بے پناہ حسن و خوبصورتی کی وجہ سے اسے ''نقش'' کا دلکش نام دیا- کلذر آغا کی اس پر خاص نظر عنایت دیکھ کر دوسری لونڈیاں حسد کرتیں اور جلتیں- اس نے حرم سرا میں داخل کیے جانے کے چند ماہ بعد ہی ترکی زبان سیکھنا شروع کر دی اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے بناؤ سنگار پر بھی توجہ دینے لگی- یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ بہت جلد اسے سلطان کی خلوت تک رسائی حاصل ہو گئی جبکہ وہاں موجود متعدد لونڈیاں گزشتہ کئی سال سے اپنی باری آنے کا انتظار کر رہی

تھیں۔لیکن ان کی بدقسمتی کہ سلطان کی شکل تک دیکھنے کی سعادت سے محروم چلی آ رہی تھیں۔ وہ اپنا بیشتر وقت لڑنے جھگڑنے یا بناؤ سنگار کرنے میں گزارتیں۔

ان میں سے اکثر ہم جنسی کی عادت بد کا شکار تھیں یا پھر خواجہ سراؤں سے تعلقات قائم کرر کھے تھے جن سے انہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ اس آرام دہ شاہانہ قید سے رہائی کی بس یہی ایک صورت تھی کہ سلطان کسی شخص کی خدمات سے خوش ہو کر لونڈی اس کے سپرد کر دیتا یا پھر سلطان کو جب کسی ناپسندیدہ شخص سے چھٹکارا پانا ہوتا تو لونڈی انعام واکرام کے ساتھ دیتا۔ وہی لونڈی اپنے نئے آقا کو قتل کر ڈالتی اور اس ''خدمت'' کے صلے وہ زروسیم کے علاوہ آزادی کی نعمت سے بھی نوازی جاتی۔

ایمی حالات سے سمجھوتہ کر کے خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے لگی اور اس نے خواجہ سرا کلذر آغا سے بھی خوشگوار تعلقات قائم کر لیے جو پہلے ہی دن سے اس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا۔ جس کی دوسری اور سب سے بڑی وجہ ایمی کا مہذب اور پڑھی لکھی ہونا تھا۔ جبکہ عام طور پر اس کا سابقہ یونان جارجیا' رومانیہ اور افریقہ کی اجڈ اور گنوار لڑکیوں سے پڑا کرتا اور وہ ان سے سختی کرنے پر مجبور ہوتا۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ وہ انتہائی معقول' سلجھا ہوا اور شریف الطبع انسان تھا۔ نیز اسے درباریوں کے طاقتور گروپ کی تائید وحمایت بھی حاصل تھی جن میں ترکی کا مفتی ورلی زیدی' سلیم اور اس کی ماں بھی شامل تھی۔ شہزادہ سلیم سلطان کا معتمد اور جانشین بھی تھا۔ یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ عام مشرقی ممالک کی طرح ترکی میں بھی تخت نشینی اور وراثت پر عموماً خون خرابہ ہی ہوا کرتا تھا۔ بادشاہت براہِ راست باپ سے بڑے بیٹے کو منتقل ہونے پر عموماً چھوٹے بھائی بغاوت کر دیتے۔ امراء اور وزراء کی طرح فوج بھی دو گروپوں میں تقسیم ہو جاتی اور کشت وخون کے بعد طاقتور شخصیت تخت پر قابض ہو جاتی۔ اس وقت ترکی کے حالات بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔ شہزادہ

مصطفیٰ کی ماں اپنے بیٹے کو سلطان بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی تا کہ خود بھی اقتدار میں حصہ دار بن سکے۔ ایسے حالات میں چونکہ تخت کے وارث کو ہر وقت جان کا خطرہ رہتا۔ اس لیے سلطان اپنے نامزد جانشین کو بیویلین میں رکھا کرتے اور پوری حفاظت کی جاتی۔ سلطان عبدالحمید کو بھی پینتالیس سال تک اس بیویلین میں قیدی کی طرح رہنا پڑا تھا۔ اس نے اپنے تلخ تجربے کی وجہ ہی سے شہزادہ سلیم کو مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ اسی لیے شہزادے کے نظریات میں گھٹن نہیں تھی اور اسے انقلابی اور جدید جمہوری نظریات کا حامل ہونے کے سبب کلذر آغا اور اس کے ترقی پسند گروپ کی حمایت اور تعاون حاصل تھا۔ اس کے برعکس شہزادہ مصطفیٰ کے ساتھ سلطان کا باڈی گارڈ دستہ اور فوج تھی جسے ''جانثار'' کہا جاتا تھا۔ جانثار فوج کا اصل مقصد شہزادہ مصطفیٰ کو استعمال کر کے پس پردہ رہتے ہوئے اقتدار پر قابض ہو کر حکومت کرنا تھا۔

یہ جانثار فوج ان پیشہ ور سپاہیوں پر مشتمل ہوتی جنہیں بچپن ہی سے فوجی تربیت دی جاتی تھی اور یہ سب غلام ہوا کرتے تھے اور مقامی آبادی سے متعلق نہ ہونے کے باعث حاکم وقت سے اندھی عقیدت اور وفاداری رکھتے تھے۔ یہی جانثار بعد میں حکمرانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رفتہ رفتہ طاقتور بنتے چلے گئے اور نہ صرف عوام ان سے خوفزدہ رہنے لگے تھے بلکہ شاہِ وقت بھی ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہی گروپ شہزادہ سلیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ ایمی نے کلذر آغا سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ وہ مایوس ہو چلی تھی کہ اچانک ایک دن اسے سلطان کے خلوت کدہ میں پہنچنے کا بلاوا آ گیا۔ کلذر آغا کے حکم پر متعدد لونڈیاں اس کا بناؤ سنگار کرنے کے لیے آ گئیں مگر اس نے ترکی لباس پہننے اور ترک عورتوں کی سی زیبائش کرنے سے انکار کر دیا۔ کلذر آغا سے بھی

سختی سے پیش آئی کہ وہ بھیڑ بکری نہیں بلکہ مہذب قوم سے تعلق رکھتی ہے- وہ اپنی پسند کا لباس پہنے گی اور اپنی مرضی کے مطابق سنگار کرے گی- ایمی کو سلطان کے خلوت کدہ میں پہنچانے کے بعد بھی کلذر آغا سخت پریشان اور خوفزدہ رہا کہ ایمی کو مغربی لباس میں دیکھ کر خدا جانے سلطان اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرے اور کتنی کڑی سزا دے لیکن سلطان تو ایمی کو دیکھتے ہی سب کچھ بھول گیا اور ہمیشہ کے لیے اس کی سنہری زلفوں کا اسیر ہو کر رہ گیا-

ایک سال بعد ۱۷۸۵ء میں ایمی کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا- تاریخ میں سلطان محمود کے نام سے مشہور ہے- محمود کی ولادت سے پہلے سلطان عبدالحمید کی پانچ سولونڈیوں، تین بیویوں کے بطن سے صرف ایک ہی نرینہ اولاد مصطفیٰ زندہ تھا- اب دوسرے بیٹے کی ولادت کی بے پایاں خوشی میں ملک بھر میں جشن منایا گیا- غرباء اور مساکین کو کھانا کھلانے کے علاوہ خیرات بھی کی اور ایمی کو "اقبال" کے خطاب سے نواز کر بیوی بنا لیا گیا- ایمی کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا- اب وہ محض ایک لونڈی نہیں رہی تھی جس کا کام سلطان کے بستر پر مسلے ہوئے پھول کی طرح پڑے رہنا ہو بلکہ بیوی ہونے کی حیثیت میں تمام تر مراعات بھی حاصل ہو گئیں جو ملکہ کو ہوا کرتی ہیں- اپنی خوش اخلاقی اور جمہوری نظریات کی بدولت اسے کلذر آغا اور اس کے ترقی پسند گروپ کی حمایت بھی حاصل ہوگئی جس کا روح رواں تاج و تخت کا وارث شہزادہ سلیم تھا- اس کے بعد ایمی نے خود کو ترکی کے ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ کرنے کے لیے اسلام بھی قبول کر لیا اور ملک فرانس کے جدید جمہوری رجحانات اور نظریات کی ترویج کا کام بھی کرنے لگی- اس نے اپنے بیٹے محمود کی تعلیم و تربیت خالص فرانسیسی انداز میں کی- اس کے لیے فرانسیسی استانیاں مقرر کیں- شہزادہ سلیم جو ایمی کا ہم عمر ہی تھا اس سے بے حد متاثر ہونے کی وجہ سے ہر معاملے میں صلاح لیتا اور مشورہ کرتا تاکہ اپنے ملک میں بھی اس طرح کی اصلاحات نافذ کر سکے- اس نے اچھے برتاؤ، حسن سلوک اور شریفانہ طور

طریقوں کی وجہ سے بہت جلد ہر ایک کے دل میں گھر کر لیا- دوسری جانب اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کو دیکھ کر شہزادہ مصطفیٰ اور اس کی بدطینت ماں جلنے لگے اور گزند پہنچانے کے لیے تاک میں رہے-

۱۷۸۹ء میں سلطان عبدالحمید کی موت پر شہزادہ سلیم کے تخت نشین ہوتے ہی محلاتی سازشیں شروع ہو گئیں- دوسری جانب ترکی کی سرحد پر روسی افواج نے تباہی مچا دی اور اندرونِ ملک جانثار فوج کی ریشہ دوانیاں باعث تکلیف ثابت ہونے لگیں- سلطان سلیم کے لیے جانثار فوج کا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا اور وہ اسے من مانی کرنے کی اجازت بھی نہیں دینا چاہتا تھا- آخر اس نے ایمی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے حکومت فرانس کے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کیے اور جانثار فوج کی قوت کو توڑنے کے لیے نئی فوج فرانسیسی فوج کی طرز پر قائم کی اور تربیت کے لیے فرانسیسی فوجی افسروں کی خدمات حاصل کیں- توپ خانہ اور بحریہ کی بھی نئے سرے سے تنظیم کر کے مستحکم کیا-

شہزادہ مصطفیٰ اور اس کی ماں بھی سازشیں کرنے میں مصروف رہے- ان کی پشت پناہی کے باعث جانثار فوج موقع ملتے ہی سلطان سلیم کے کسی نہ کسی معتمد ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دیتی- سلطان سلیم نے اپنے خلاف کی جانے والی سازشوں اور سازشیوں سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود شہزادہ مصطفیٰ اور اس کی ماں سے فیاضانہ سلوک روا رکھا- حالانکہ ایمی نے تمام مخالفین کو سختی سے کچل دینے کا بار بار مشورہ بھی دیا- سلطان سلیم کی رحم دلی کو کمزوری پر محمول کرتے ہوئے مخالفین نے ترکی دشمنوں برطانیہ اور روس کی حکومتوں کے ساتھ ساز باز کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں برطانیہ کا بحری بیڑہ مشرق کی طرف سے اور روسی افواج نے جنوب کی جانب سے بڑھنا شروع کر دیا- نپولین نے خطرے کو محسوس کرتے ہوئے جنگی امور کے ماہر سبطین کو فوراً سلطان سلیم کے دربار میں بھیجا- اس نے قسطنطنیہ پہنچتے

ہی حالات کا جائزہ لینے کے بعد بحری اور بری فوج کو دارالحکومت کی حفاظت پر مامور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر کو آہنی قلعہ میں تبدیل کر دیا۔ سبطین کی قسطنطنیہ میں موجودگی اور کام کو دیکھ کر برطانوی سفیر نے کھلم کھلا سلطان کے مخالفین کی حمایت کرنا شروع کر دی لیکن برطانوی فوج کے ترکی پہنچنے تک قسطنطنیہ ناقابل تسخیر قلعہ بن چکا تھا۔

ایمی نے سلطان کو انگریزوں کے خلاف ڈٹ جانے کا مشورہ دیا اور کہا کہ اس وقت تک بات چیت کرنے سے انکار کر دے جب تک برطانوی فوج ترکی کی حدود سے باہر نہیں نکل جاتیں۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ سبطین نے شہر کی حفاظت کے لیے فوج کو اس ترتیب سے منظم کیا تھا کہ برطانوی ایڈمرل بھی فتح کرنے سے مایوس ہو گیا۔ سلطان کی اس ناقابل یقین کامیابی نے جانثار فوج کو اس کے خلاف کر دیا اور فرانسیسی ماہرین کی واپسی کے فوراً بعد کھلم کھلا بغاوت کر کے اسے شہزادہ مصطفیٰ کے حق میں تخت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔

مصطفیٰ نے تخت نشین ہوتے ہی معزول سلطان سلیم، شہزادہ محمود اور اس کی ماں ایمی کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور جانثار فوج کو خوش کرنے کے لیے سلیم نے اپنے دور حکومت میں جو اصلاحات کی تھیں منسوخ کر کے سابقہ رجعت پسندانہ طرز حکومت کو اپنا لیا۔ جب اس کی حمایتی جانثار فوج کے سرکردہ لوگوں سے یہ فاش غلطی ہو گئی کہ ان میں سے کسی کو سلیم کے سب سے طاقتور اور مضبوط حلیف بر کیکتار کی طرف توجہ دینے کا خیال ہی نہیں آیا جو بلغاریہ کے صوبے دینوب کا پاشا تھا۔ وہ سلطان سلیم کے زوال اور گرفتاری کی خبر ملتے ہی اٹھارہ ہزار بہترین تربیت یافتہ افراد پر مشتمل فوج کے ساتھ دارالحکومت کی طرف روانہ ہو گیا اور سلطان مصطفیٰ کی فوج کو شکست پر شکست دیتا ہوا قسطنطنیہ آ پہنچا۔ مصطفیٰ کی ماں نے جیتی ہوئی بازی کو ہار میں تبدیل ہوتے دیکھ کر معزول سلطان سلیم اور شہزادہ سلیم کو قتل کر دینے کی دھمکی دی تا کہ ان دونوں کے بعد تخت کا وارث اور دعویدار نہ ہونے کی صورت میں خود ہی معاملات

درست ہو جائیں۔مگر سلیم نے آخری وقت تک اپنے قتل پر مامور آدمیوں کے خلاف تلوار اٹھا کر مقابلہ شروع کر دیا اور اس وقت تک ڈٹا رہا جب تک کہ شہزادہ محمود بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب نہیں ہو گیا۔لیکن وہ چار آدمیوں کے خلاف اکیلا کب تک لڑ سکتا تھا۔ بر کیکتار کی فوج نے پیش قدمی جاری رکھی اور محل کا محاصرہ کر کے معزول سلطان سلیم، شہزادہ محمود اور اس کی ماں کی رہائی کا مطالبہ کیا جس کے جواب میں سلیم کی لاش کو دیوار پر سے اچھال کر محل سے باہر پھینک دیا گیا۔ بر کیکتار اپنے محسن کی لاش کو دیکھ کر غصے میں آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے اپنی فوج کو محل پر حملہ کر کے قبضہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس آخری خونریز معرکے میں جانثار فوج کی اکثریت ماری گئی۔سلطان مصطفیٰ اور اس کی فتنہ انگیز ماں کو گرفتار کر کے قید میں ڈالا گیا اور محمود کو تلاش کر کے تخت پر بٹھایا گیا۔ کیونکہ شاہی خاندان میں سے وہی ایک زندہ بچہ تھا۔

سلطان محمود اپنے پیشرو مقتول سلطان سلیم سے بھی بہتر منتظم اور حکمران ثابت ہوا۔ اس نے سابقہ اصلاحات کے علاوہ مزید اصلاحات نافذ کیں۔ شفا خانے اور سکول کھولے۔ ذرائع آمدورفت کی طرف خاص توجہ دی اور عوام کو جمہوری حقوق دے کر انہیں بلاوجہ خوف و ہراس سے نجات دلائی۔ان اصلاحات سے جب استحصالی طبقہ کے مفادات مجروح ہوئے تو انہوں نے ملاؤں کے ساتھ مل کر اسلام اور قرآنی احکامات کی خلاف ورزی ہونے کا جھوٹا پراپیگنڈا کرنا شروع کر دیا جس سے عوام مشتعل ہو گئے۔اس کے ساتھ ہی بچی کھچی جانثار فوج نے بھی آنکھیں دکھانا شروع کر دیں۔ ان حالات میں سلطان محمود کے لیے صرف دو ہی راستے رہ گئے۔ ایک یہ کہ نافذ کردہ اصلاحات کو منسوخ کر دے اور آئندہ ملک اور قوم کی بھلائی اور بہبود کے لیے کچھ نہ کرے۔ دوم مخالفین کو سختی سے کچلنے کے لیے جانثار فوج سے ٹکر لینے کا خطرہ مول لے۔اس نے ملک کی روایات پر عمل کرتے ہوئے سختی کرنے کا راستہ منتخب

کیا اور عوام کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا کرنے کی خاطر سب سے پہلے کام یہ کیا کہ حرم سرا میں موجود مصطفیٰ سے حاملہ ہونے والی لونڈیوں کے ہاتھ اور پاؤں باندھ کر عام لوگوں کی موجودگی میں سمندر میں پھنکوا دیا۔ اس کی اس ظالمانہ کارروائی کو دیکھ کر مخالفین خوفزدہ ہو گئے اور جانثار فوج بھی سمجھ گئی کہ سلطان محمود سے ٹکر لینا آسان کام نہیں۔ اس طرح وقتی طور پر حالات پر قابو پا لیا گیا لیکن اسے معلوم تھا کہ جانثار کسی بھی وقت اس کا تختہ الٹنے کی کوشش کر سکتی ہے۔ لہٰذا اس وقت کے آنے سے پہلے ہی جانثار فوج کو ختم کر دینا ضروری تھا۔ ۱۸۲۶ء میں اس نے انتہائی سختی سے کام لیتے ہوئے بڑی بے رحمی سے اسے کچل ڈالا اور اس کے بعد پوری دل جمعی اور یکسوئی سے ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس کی نافذ کردہ اصلاحات اور فلاحی کاموں ہی کی وجہ سے تاریخ میں اسے ''محمود مصلح'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ایمی کی زندگی کا آخری دور اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ محمود کے سلطان بننے کے بعد حکومت کی تمام تر قوت اور اقتدار اسی کے ہاتھوں میں تھا لیکن با اختیار ہونے کے باوجود اس نے کبھی بھی اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ بلکہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے بیٹے کو مشورے دیتی رہی اور ملک میں جتنی بھی اصلاحات ہوئیں یا مخالفین کو کچلنے کے لیے انتہائی سنگدلانہ اور ظالمانہ پالیسی اختیار کی گئی ان کی حقیقی محرک وہی تھی۔

اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے زیورات، ہیرے اور زرق برق ملبوسات سے دیوانگی کی حد تک انس تھا حتیٰ کہ بالوں اور لباس میں بھی ہیرے جواہرات ٹانکے رہتی۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر سب سے حیرت انگیز اور ناقابل یقین حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے آخری لمحات میں اس نے اپنے بیٹے سلطان محمود سے اپنے آباؤ اجداد کے مذہب میں رہتے ہوئے مرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلطان محمود نے اپنی ماں کی اس آخری

خواہش کو پورا کرنے کے لیے پادری کو خفیہ راستے سے محل میں لانے کا انتظام کیا۔

یہ ایک ایسی خوبصورت عورت کی داستان حیات ہے جو ترکی کے سلطان کے بستر کے راستے گزر کر ملکہ بنی اور ترکی کے سلطان کی ماں بن کر اپنے خالق حقیقی سے جاملی۔

قلوپطرہ

مغرب کی ایک دوشیزہ جس کا سحر طراز حسن اور ادائے کافرانہ جرنیلوں کو سرنگوں کر دیتا تھا

جیسے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ قلوپطرہ اپنے دور کی سب سے زیادہ حسین و جمیل عورت تھی اسی طرح یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ قلوپطرہ حسن و عشق کی گھاتوں' خداداد ذہانت' تدبر اور ہمت اور جرأت میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ وہ دسمبر کی پہلی تاریخ تھی اور قبل مسیح کا پچاسواں سال ختم ہو رہا تھا۔ صبح کے دس بجے تھے۔ شہر میں معمول کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ ایسے وقت میں روم کے پہاڑی دارالسلطنت پر رومن سینٹ کا ایک اہم اجلاس ہو رہا تھا۔ سینٹ ہاؤس کے باہر لوگوں کا ہجوم تھا کیونکہ وہ سینٹ کا فیصلہ سننے کے لیے بے تاب تھے۔ اس اجلاس میں دو جرنیلوں کی ملازمت میں توسیع کا معاملہ زیر بحث تھا۔ جنرل سیزر اور اس کا داماد پومپئی۔

سیزر اس وقت روم سے بہت دور فرانس کے شہر ریوانہ میں خیمہ زن تھا۔ جنرل پومپئی روم میں موجود تھا۔ اس کی افواج زیادہ تر اسپین کی چھاؤنیوں میں تھیں۔ تاہم اس کی فوج کا ایک دستہ سینٹ ہاؤس کی ملحقہ عمارت میں عوام کی نظروں سے اوجھل' تیار کھڑا تھا۔

روم کا شہر ۷۵۰ قبل مسیح میں بسا تھا۔ تقریباً ایک سو سال تک مطلق العنان بادشاہ اس پر حکومت کرتے رہے۔ ۶۰۰ ق۔م کے قریب ایک شوریدہ سر انسان نے شہر میں مطلق العنان بادشاہت کے خلاف کامیاب تحریک چلا کر انقلاب برپا کر دیا۔ اس انقلاب میں بہت خون خرابہ ہوا۔ پھر اس خونریزی نے بادشاہت کو جمہوریت میں بدل دیا۔ چنانچہ شہر کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کے لیے تین سو شہریوں کو چن کر ایک ایوان کی بنا رکھی گئی اور اسے سینٹ کا

نام دیا گیا- اس سینٹ نے شہر کے لیے ایک مختصر سا آئین بھی مرتب کیا- اس آئین کی رو سے کونسلروں میں سے دو آدمیوں کو ''پروکونسل'' منتخب کیا جاتا- بادشاہت کو روکنے کے لیے یہ اعلان کیا گیا-

''دونوں پروکونسلروں کا ہر معاملے میں اتفاق ضروری ہے''

پس تقریباً پانچ سو سال تک یہ اسمبلی سکھ سے کام کرتی رہی- اس کے بعد جرنیلوں کا زمانہ آ گیا اور حالات بدل گئے- تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک حسین عورت کے لیے بے شمار انسانی جانوں کی قربانی دینی پڑی- سیتا اور دروپدی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں- رامائن اور مہابھارت کے واقعات کو کون بھول سکتا ہے- ہم جانتے ہیں کہ خوبصورت ''ہیلن'' کی وجہ سے ''ٹرائے'' کی جنگ اٹھارہ سال تک ہوتی رہی لیکن ان حسیناؤں میں سے مصر کی ''قلوپطرہ'' کو ایک منفرد اور نمایاں مقام حاصل ہے- قلوپطرہ کی رومانی داستان جولیس سیزر سے شروع ہو کر مارک انطونی کے عبرت ناک انجام تک پہنچتی ہے-

اس کافرادا حسینہ کی شخصیت اس اعتبار سے بھی ایک خاص مقام رکھتی ہے کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کی ملکہ ہوتے ہوئے بھی داشتہ بنی- قلوپطرہ ہی شاید وہ واحد حسینہ ہے جس کے بارے میں سیکڑوں ڈرامے' سوانح عمریاں' فلمیں اور مضامین لکھے گئے ہیں اور شاید قیامت تک لکھے جاتے رہیں گے-

قلوپطرہ کا جد امجد بطیموس اول ایک یونانی سردار تھا- اس نے مصر میں اپنی حکومت قائم کی اور اسکندریہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا- اس بطیموس نے اسکندریہ کی مشہور عالم لائبریری قائم کی تھی- قلوپطرہ کا خاندان زمانے کے مدوجزر سے گزرتا ہوا مصر پر صدیوں حاکم رہا- باپ نے بیٹے کو قتل کیا- بھائی نے بہن کو موت کی نیند سلایا اور بیوی نے میاں کو ٹھکانے لگایا مگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس تمام فساد' خونریزی' قتل و غارت گری' ظلم وستم اور محلاتی

سازشوں کا اصل سبب صرف ''تاج وتخت'' تھا۔

اس دور میں لوگ اپنی نسلی برتری قائم رکھنے کی خاطر بھائی اور بہن کی شادی کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کی نسل بڑھتی اور اقتدار کی مرکزیت قائم رہتی تھی۔ قلوپطرہ کا باپ بطلیموس سیزدہم بہت کمزور حکمراں ثابت ہوا۔ اسے شراب خوری اور موسیقی کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ مصری اسے ''بانسری بجانے والا بادشاہ'' کے نام سے پکارتے تھے۔ اس کی حکومت رومن شہنشاہ کی تائید اور حمایت ہی سے قائم تھی جبکہ اسکندریہ کے باشندے جو مصری کم اور رومن النسل زیادہ تھے، ملک کی مکمل آزادی اور خودمختاری کے خواہاں ہونے کے باعث اس کی کمزور پالیسیوں کے سخت مخالف ہو گئے۔ چنانچہ بطلیموس نے لوگوں کی کھلم کھلا تنقید اور مخالفت کی وجہ سے اپنے اقتدار کو خطرے میں دیکھ کر رومن جنرل پومپئی اعظم کو اسکندریہ آنے کی دعوت دی لیکن جنرل موصوف اپنی مصروفیت کی وجہ سے خود تو نہ آسکا مگر اپنے بیٹے کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ اسکندریہ بھیج دیا۔

اس دوران بطلیموس کے چھوٹے بھائی ''کنایوسن'' نے بغاوت کر کے قبرص میں اپنی حکومت قائم کر لی اور بطلیموس کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے مصریوں کو بھڑکانے میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ رومن افواج نے اسے شکست دے کر قبرص کو رومن ایمپائر میں شامل کر دیا اور اس طرح یہ فتنہ ختم ہو گیا۔ حالات کچھ دن تو پرسکون رہے مگر جلد ہی صورت حال بدل گئی کیونکہ اسکندریہ کے باشندے قبرص کی آزادی کا مطالبہ کرنے لگے۔ اس سے اس کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی۔

ایک طرف تو وہ عوام سے خوفزدہ تھا دوسری طرف رومن کی عظیم طاقت سے ٹکر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ آخر وہ مجبور ہو کر رومن حکومت کی مدد حاصل کرنے روم چلا گیا مگر اسے وہاں بھی کچھ کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اسکندریہ کے باشندوں نے خود ہی اسے اقتدار

سے محروم کر کے ملک بدر کر دیا۔

مصر چونکہ ذرخیز ملک تھا اور رومن اس سے دست بردار نہیں ہونا چاہتے تھے لہٰذا اب سوال یہ تھا کہ مصر پر بطلیموس کا اقتدار بحال کرانے کس جنرل کی کمان میں فوج بھیجی جائے۔ جولیس سیزر، پومپئی یا کراسس۔ اس جھگڑے میں تین سال گزر گئے تب جا کر یہ فیصلہ ہوا کہ تینوں نامور جنرل مل کر عظیم رومن ایمپائر پر حکومت کریں گے اور اس فیصلے کے بعد نوجوان ''مارک انطونی'' کی کمان میں فوج مصر بھیجی گئی۔

بطلیموس ایک طویل عرصہ سے ملک سے باہر تھا چنانچہ سکندریہ کے منہ زور لوگوں نے اس کی بڑی بیٹی برنائیک کو ملکہ بنا کر اس کی شادی ایک شخص سے کر دی۔ برنائیک بہت زیادہ مغرور اور عیاش تھی۔ اس لیے اس کا شوہر سے نباہ نہ ہو سکا اور اس نے شوہر کو قتل کرا کے اپنی پسند کے مرد سے شادی کر لی لیکن چھ ماہ بعد ہی اس کا باپ بطلیموس رومن فوج کے ساتھ اسکندریہ میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھتے ہی بیٹی اور داماد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بطلیموس نے اقتدار بحال ہونے پر رومنوں کو خوش کرنے اور فوجی اخراجات کے لیے رعایا پر بے تحاشہ ٹیکس لگائے اور وصولی کرنے کے لیے سختی کی جس کی وجہ سے ہر شخص اس کا مخالف ہو گیا۔ ممکن ہے کہ حالات بگڑ جاتے مگر وہ اکیاون (۵۱) ق۔م میں ملک کو مقروض چھوڑ کر مر گیا۔ اپنی موت سے چند دن پہلے اس نے ایک وصیت لکھی اور اس کی ایک نقل روم روانہ کی۔ اس وصیت میں اس نے ملکہ مصر کے لیے قلوپطرہ کو نامزد کیا۔ رومن حکومت اس کی نامزد کردہ ملکہ قلوپطرہ کی سرپرستی میں اطمینان اور سکون سے برسر اقتدار رہی۔ قلوپطرہ ۱۷ سال کی عمر میں مصر کے تخت پر بیٹھی اور مرحوم باپ کی وصیت کے مطابق اس کی شادی اس کے گیارہ سالہ بھائی بطلیموس چہاردہم سے ہو گئی۔ قلوپطرہ کے بارے میں پلوتارخ لکھتا ہے

''وہ ایک تعلیم یافتہ، ذہین اور خوبصورت عورت تھی۔ قلوپطرہ کو کئی چند باتوں پر عبور

حاصل تھا۔ اسے حسن و خوبصورتی میں لاثانی نہیں کہا جا سکتا مگر بے مثال نہ ہونے کے باوجود وہ ایک ناقابل فہم کشش کی مالک تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کی آواز حد درجہ سریلی تھی۔ وہ بولتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔"

قلوپطرہ اور اس کا چھوٹا بھائی اور شوہر اپنے باپ کی وصیت کے مطابق رومنوں کی زیر سرپرستی تخت نشین ہو گئے لیکن ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے سبب دربار سازشوں کا اکھاڑہ بن گیا۔ قلوپطرہ کسی کی سرپرستی میں رہنے کی بجائے خود مختار حیثیت میں ملک پر حکومت کرنا چاہتی تھی جس کی وجہ سے اس کے خاوند کا خواجہ سرا پوتھینس سے اختلاف ہو گیا اور اس نے شاہی باڈی گارڈ فورس کے کمانڈر اچیلاس اور اتالیق تھیوڈوٹس سے مل کر سازش کی اور تینوں عملاً سیاہ و سفید کے مالک بن گئے اور قلوپطرہ بس نام کی حکمران رہ گئی۔

اسی دوران روم میں جولیس سیزر اور عظیم رومن جنرل پومپئی میں ٹھن گئی۔ پومپئی نے اپنی فوجی طاقت کو مستحکم کرنے کے لیے اپنے بیٹے کنایوس کو اناج اور جہاز حاصل کرنے کے لیے مصر بھیجا جہاں قلوپطرہ نے اسے خوش آمدید کہتے ہوئے غلے سے بھرے ہوئے پچاس جہاز اور تربیت یافتہ پانچ سو مسلح سپاہی فراہم کیے۔

کنایوس کی واپسی کے بعد آئندہ تین سال میں جو واقعات پیش آئے اور وہ شام کیوں بھاگ گئی اس بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے۔ اس نے شام میں فوج تیار کی اور مصر پر حملہ کر کے تاج و تخت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ اس بات سے باخبر تھی کہ شہزادہ بطلیموس کے مقابلہ میں وہ بہت کمزور ہے۔ اسے خوش قسمتی کہنا چاہیے کہ عین اس وقت جولیس سیزر اور پومپئی میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی اور پومپئی، فارسیلیا کی جنگ میں شکست کھا کر باقی ماندہ فوج ساتھ لیے اور نئی فوج تیار کرنے کے لیے فرار ہو کر مصر آ پہنچا۔ اب مصر کے حکمرانوں کو پیچیدہ صورت حال کے پیش نظر یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ شکست خوردہ پومپئی کی مدد

کریں یا تعاقب میں آنے والے فتح مند جولیس سیزر کا ساتھ دیں۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد تھیوڈ ڑئس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے پومپئی کو خوش آمدید کہا گیا پھر اسے دھوکے سے قتل کر کے سیزر کی خوشنودی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

ایک ہفتہ بعد ہی سیزر تعاقب کرتا ہوا اسکندریہ پہنچا اور اسے دشمن پومپئی کے قتل کا علم ہوا۔ اسے یہاں یہ مشکل پیش آئی کہ قوم پرست باشندوں نے بغاوت کر کے متعدد سپاہی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ یہ بغاوت اس قدر منظم تھی کہ سیزر کے لیے اس پر قابو پانا ممکن نہ تھا۔ اس کے ساتھ صرف چار ہزار فوج تھی جبکہ اسکندریہ کی بیس ہزار مسلح آبادی اس کے خلاف برسر پیکار ہوگئی تھی۔ اس نے بغاوت پر قابو پانے کے لیے روم سے فوجی مدد طلب کی اور اس دوران باغیوں سے گفت وشنید کر کے جنگ کو ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔

اس نے شہزادہ بطلیموس اور قلوپطرہ میں صلح کرانے کے لیے دونوں کو طلب کیا۔ اس کی طلبی پر سب سے پہلے شہزادے کا اتالیق تھیوڈوٹس، رومن جنرل پومپئی کا خون آلود سر طشتری میں لے کر حاضر ہوا اور اس وفاداری کے ثبوت میں مقتول کی انگوٹھی بھی پیش کی۔ کہتے ہیں کہ جولیس سیزر اپنے دشمن کا خون آلود سر دیکھ کر جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور دنیا کی بے مروتی پر منہ پھیر کر بے اختیار رو دیا۔ تھیوڈوٹس کے بعد شہزادہ بطلیموس اور مصری افواج کا کمانڈر امیپلاس نے حاضر ہو کر اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

قلوپطرہ اس وقت تک حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی کہ اقتدار کی بحالی کے لیے جولیس سیزر کی تائید اور حمایت ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی ہے۔ وہ سیزر کی اس کمزوری سے بھی واقف تھی کہ تین چار شادیاں کرنے کے بعد بھی وہ خوبصورت عورتوں کا شیدائی تھا۔ اس کے پاس بے شمار داشتائیں تھیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے لاتعداد عورتوں سے تعلقات تھے۔

نیز شاہ نکوڈیس کے ساتھ گندے تعلقات کا اسکینڈل بھی عام ہو چکا تھا۔ وہ عیاش ہونے کے ساتھ تعیش کی زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیشہ قرضدار رہتا تھا اور قرضوں کی ادائیگی کے لیے وہ مقدس عبادت گاہوں تک میں لوٹ مار کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔

ان تمام حالات پر غور کرنے کے باوجود اس نے سیزر کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ شہزادی قلوپطرہ اس کا راستہ روکے ہوئے تھی اور اسے پکڑے جانے کا بھی ڈر تھا۔ ان خطرات کے باوجود اس ہمت ور عورت نے جہاز میں بیٹھ کر اسکندریہ جانے کا فیصلہ کیا اور وہ اسکندریہ روانہ ہوگئی۔

قلوپطرہ شہر کے کچھ فاصلے پر جہاز سے اتری اور کشتی پر سوار ہوگئی۔ اس کے ساتھ ایک جاں نثار غلام تھا جو اسے اسکندریہ تک لے گیا۔ وہ اس طرح کہ غلام نے قلوپطرہ کو ایک قالین میں لپیٹا اور کندھے پر ڈال لیا۔ اس طرح وہ دونوں جولیس سیزر کے پاس پہنچے اور یوں وہ اپنے سفر میں کامیاب ہوئی۔

اس وقت جولیس سیزر کی عمر باون سال تھی جبکہ قلوپطرہ کی بھرپور جوانی اکیسویں سال سے گزر رہی تھی۔ اس حسن کی دیوی اور نازک اندام پری کو دیکھ کر سیزر کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور عورتوں کا یہ بڑا شکاری خود شکار ہو گیا۔ رات گزری تو قلوپطرہ کا سحر انگیز حسن جادو جگا چکا تھا۔ چنانچہ اس نے شہزادے کو اپنی بیوی سے صلح کرنے کے لیے بلایا۔ شہزادہ حالات سے بے خبر تھا جب وہ سیزر کے سامنے پہنچا تو وہاں قلوپطرہ کو دیکھ کر اس قدر مشتعل ہوا کہ سر سے تاج اتار کر فرش پر دے مارا اور چیختا چلاتا محل سے نکل آیا۔ باہر لوگ کھڑے رومنوں کے خلاف نعرہ بازی کر رہے تھے اور رومن فوج انہیں محل میں داخل ہونے سے روکے ہوئی تھی۔

جولیس سیزر نے حالات کی نزاکت کو بھانپ کر مصریوں کے سامنے آ کر بڑی ہمت اور مردانگی سے تقریر کی۔ اس نے شہزادہ بطلیموس اور اس کے ساتھیوں کو مرحوم شاہ بطلیموس

سیزر دہم کی وصیت یاد دلائی جس کی رو سے دونوں بہن بھائی یا میاں بیوی (قلوپطرہ اور بطلیموس) دونوں جانشین تسلیم کیے گئے تھے- اس طرح وقتی طور پر امن وامان ہو گیا-

جولیس سیزر نے اگرچہ سیاسی فراست سے کام لے کر حالات پر قابو پا لیا لیکن شہزادہ بطلیموس اور اس کا سازشی گروہ تاک میں لگا رہا- تھیوڈوٹس کے لیے یہ صورت حال کسی صورت قابل قبول نہ تھی- چنانچہ اس نے ملکہ قلوپطرہ کو سیزر کی داشتہ ہو جانے کا پروپیگنڈہ کر کے عوام کو مشتعل کرنا شروع کر دیا- سیزر کے لیے سب سے زیادہ پریشانی کا باعث اچیلاس ثابت ہوا- اس نے بغاوت کر کے اسکندریہ کا محاصرہ کر لیا-

سیزر روم سے کمک پہنچنے تک مختلف حیلوں بہانوں سے جنگ کو ٹالتا رہا- چنانچہ سیزر نے مجبور ہو کر اچیلاس کے پاس دو رومن ایلچی بھیجے جنہیں قتل کر دیا گیا- پھر اچیلاس نے فوج کو شہر میں داخل ہو کر رومنوں کے قتل عام کا حکم دیا- سیزر نے شہزادے کو یرغمال بنا کر ایک بار پھر جنگ روکنے کی کوشش کی- اچیلاس بھی سیزر کی مجبوری اور کمزوری سے بے خبر نہ تھا- وہ کمک پہنچنے سے پہلے ہی رومن فوج کو شکست دے کر مصر کو آزاد کرا لینا چاہتا تھا-

ان حالات میں سیزر کو مجبوراً مدافعتی جنگ لڑنا پڑی- وہ خود ایک اعلیٰ درجے کا جرنل اور عظیم سیاست دان تھا- اس طرح اس کی فوج، مصری فوج کے مقابلے میں کہیں زیادہ منظم، تجربہ کار اور تربیت یافتہ تھی- اس کے باوجود بھی اچیلاس کا پلہ بھاری تھا- نیز اسے سمندر کے راستے تازہ دم رضا کاروں کی کمک بھی پہنچ رہی تھی- ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر مصری، رومنوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں شریک ہونا مقدس فرض سمجھتا تھا-

رومن بھی بڑی بے جگری سے لڑ رہے تھے- ان کے کچھ آدمی کسی نہ کسی طرح لڑتے مرتے ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور انہوں نے مصری جہازوں کو آگ لگا دی- دیکھتے ہی دیکھتے پورا مصری بیڑہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا اور تیز ہوا کی وجہ سے شہر میں بھی

آگ لگ گئی- اس آگ سے اسکندریہ کی عظیم لائبریری بھی اپنے چار لاکھ ملفوظات کے ساتھ جل کر خاکستر ہوگئی- اس ہولناک تباہی اور ساحل پر رومنوں کے قبضے سے سمندر کے راستے امداد پہنچنا بند ہوگئی لیکن شہر کے باشندوں کی حمایت اور تعاون کی وجہ سے اچیلاس کی پوزیشن سیزر کے مقابلے میں اب بھی بہت بہتر اور مستحکم تھی-

سیزر کی خوش قسمتی دیکھیے کہ شام سے یہودی فوج اس کی مدد کو پہنچ گئی- یہ فوج اس نے مصر آتے ہوئے شام روانہ کر دی تھی اور وہ خود صرف چار ہزار کی مختصر جمعیت کے ساتھ اسکندریہ میں رک گیا تھا- اس فوج کو جب مصریوں کی بغاوت اور اسکندریہ کے محاصرے کا علم ہوا تو وہ سیزر کی مدد کے لیے اسکندریہ کی طرف روانہ ہوگئی- اب مصری فوج کو دو محاذوں پر بہترین تربیت یافتہ افواج کے خلاف جنگ کرنا ممکن نہ رہا- سیزر کی کمان میں محصور فوج کے حوصلے بھی کمک پہنچنے سے بلند ہوگئے- پس اس نے مصری فوج کی پٹائی شروع کر دی اور شام سے آنے والی فوج نے عقب سے حملہ کر کے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا- اس دوران ہی کیتی میڈس فرار ہوتے ہوئے کشتی سمیت دریائے نیل میں ڈوب مرا- ارسینو اور شہزادہ بطلیموس گرفتار ہوگئے-

اس پانچ ماہ کی خونریز جنگ میں سیزر بہت تھک چکا تھا- اس کا ارادہ چند دن قلوپطرہ کی زلفوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ستانے کے بعد ایشیائے کوچک کو فتح کرنے کا تھا مگر قلوپطرہ نے اسے اپنی زلفوں کے جال میں ایسا پھانسا کہ وہ تمام مہمات کو بھول گیا حتیٰ کہ اٹلی میں عظیم رومن سلطنت کے خلاف رونما ہونے والے واقعات سے بھی بے نیاز ہوگیا- یوں لگتا تھا جیسے وہ قلوپطرہ کے حسن و جمال سے آگے سوچنا نہیں چاہتا اور قلوپطرہ اسے دانستہ طور پر مزید کچھ عرصہ تک مصر میں ٹھہرا کر اپنے تمام مخالفین کا خاتمہ کرا دینا چاہتی تھی تاکہ سیزر کی واپسی کے بعد وہ اطمینان اور سکون سے حکومت کر سکے-

اپنے اس مقصد کے حصول کی خاطر اس نے دیودار کی لکڑی کا ایک دومنزلہ بجرا تیار
کرایا- یہ تین سوفٹ لمبا' ساٹھ فٹ اونچا اور پینتالیس فٹ چوڑا تھا- اس میں کھانے کا کمرہ
خوابگاہیں اور پائیں باغ موجود تھا- ایک چیمبر تھی جس میں ساٹھ آدمیوں کے بیٹھنے کا
انتظام تھا- عبادت کے لیے ''معبد زہرہ'' بھی تعمیر کرایا گیا- اس بجرے کو مصری طرز پر آراستہ
کیا گیا- مختلف شوخ و شنگ رنگوں کے پھول سجائے اور جابجا ہاتھی دانت اور سونے کے
پتروں سے مینا کاری کی گئی تھی- اسے بجرے کے بجائے پانی پر تیرتا ہوا شاہی محل کہا جائے
زیادہ صحیح ہوگا- اس سفر میں بجرے کے پیچھے چارسو کشتیوں میں فوج اور سامان رسد موجود تھا
بظاہر یہ ''عظیم رومن ایمپائر'' کے مقبوضات کا معائنہ تھا جبکہ حقیقت میں اسے جولیس سیزر اور
قلوپطرہ کا سرکاری ہنی مون کہنا چاہیے-

اس ہنی مون سے اسکندریہ واپسی پر قلوپطرہ نے سیزر کے بیٹے کو جنم دیا- اس سے پہلے
چونکہ سیزر اولاد نرینہ سے محروم تھا اس لیے وہ بیٹے کی پیدائش پر پھولے نہ سماتا تھا- قلوپطرہ
نے اپنی سیاہ کاری پر پردہ ڈالنے کے لیے معبدوں کو اپنے ساتھ ملا کر یہ مشہور کرا دیا کہ یہ بچہ
''عیمون دیوتا'' کے ارضی مظہر جولیس سیزر اور قلوپطرہ کے مقدس سنجوگ کا پھل ہے- لطف کی
بات یہ ہے کہ مصر کے لوگوں نے معبدوں کی اس غلط گوئی کو بالکل صحیح مان لیا- چنانچہ اس بچے
کا نام ''سیزر بن'' رکھا گیا-

اب سیزر روم روانہ ہوا جہاں اس نے مصر' گال' نومیڈیا اور پونٹیا س کی فتوحات کا عظیم
الشان جشن منایا- وہاں گال کے بہادر حکمراں ٹوریکس اور قلوپطرہ کی چھوٹی بہن آرسینو کو دیگر
مفتوح حکمرانوں کو جولیس سیزر کے پیچھے پھرایا گیا- رومن ان کا مذاق اڑاتے اور آوازے
کستے تھے- جشن کے اختتام پر تمام قیدی حکمرانوں کو سرعام قتل کیا گیا- قلوپطرہ کی بہن آرسینو
سزا سے بچ گئی- پھر سپین کو دوبارہ فتح کر کے جشن منایا گیا- اس جشن میں قلوپطرہ اپنے کمسن

شوہر بطلیموس کو بھی اپنے ساتھ روم لے آئی تا کہ مصر میں اس کے خلاف کوئی سازش نہ ہو- قلوپطرہ کے حسن کے چرچے وہاں پہنچ چکے تھے اور ہر ایک حسن کی اس دیوی کو دیکھنے کا آرزومند تھا- قلوپطرہ کے قیمتی لباس میں ہیرے جواہرات ٹکے ہوئے تھے- اس جشن میں بے شمار غلام اور حسین خواصیں شامل تھیں- رومنوں نے اس سے پہلے کسی بادشاہ اور ملکہ کے ایسے ٹھاٹ باٹ نہ دیکھے تھے-

روم ہی کے قیام کے دوران قلوپطرہ نے خاوند بطلیموس چہارم کو زہر دے کر ختم کر دیا- اب قلوپطرہ مصر کے تخت وتاج کی واحد وارث بن گئی- سیزر نے قلوپطرہ کے لیے وہاں ایک عالی شان محل بنوا رکھا تھا جہاں اس نے شاہی دربار لگانا شروع کر دیا- رومنوں کے لیے اب دربار کی شان وشوکت اور آن بان ایک انوکھی بات تھی- اس دربار کو دیکھنے کے لیے خواص و عوام دونوں آتے تھے اور دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جاتے تھے-

قلوپطرہ اپنے بیٹے سیزر بن کو اپنے ساتھ روم لے آئی تھی- لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سیزر سے باقاعدہ شادی کر کے روم کی سلطنت کی ملکہ بنے گی اور سیزر بن کو سیزر کا واحد وارث قرار دلوائے گی- ادھر سیزر نے پومپئی کے خلاف فارسیلیا کی جنگ کے موقع پر منت مانی تھی کہ جنگ میں فتح حاصل کرنے پر وینس (زہرہ دیوی) کا مندر تعمیر کرالے گا-

پس سیزر نے اس منت کو پورا کیا اور وینس کا مندر تعمیر ہوا جس میں زہرہ دیوی کے ساتھ سیزر نے اپنی محبوبہ قلوپطرہ کی مورتی بھی رکھوادی- یہ بات اہل روم کو بہت شاق گزری لیکن وہ اس وقت اپنی نفرت اور غصہ کو ضبط کر گئے- اس طرح وینس کے مندر میں زہرہ دیوی کے ساتھ ساتھ قلوپطرہ کی بھی پرستش شروع ہوگئی اور یہ سلسلہ سیزر کے قتل ہونے تک چلتا رہا- سیزر کے قتل پر اہل روم نے زہرہ دیوی کے مندر سے قلوپطرہ کا مجسمہ نکال کر اسے توڑ پھوڑ ڈالا- پھر قلوپطرہ کی تمام امیدیں اس وقت خاک میں مل گئیں جب اسے معلوم ہوا کہ

سیزر نے قلوپطرہ اور سیزر بن دونوں ہی کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

جولیس سیزر کی موت رومنوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان ثابت ہوا کیونکہ اقتد
کے لیے خانہ جنگی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ سیزر نے اپنی وصیت میں اکیٹوین کو روم کا ت
وتاج بخشا تھا۔ مگر دوسری طرف مارک انطونی بھی عوام میں مقبول تھا اور اپنی ہر دلعزیزی کی
پر اقتدار پر قابض ہونا چاہتا تھا۔ ان دو کے علاوہ ایک اور بھی اقتدار کا دعویدار تھا۔ اس کا
لیسپیڈس تھا۔ جب صورت حال زیادہ بگڑی اور لشکر ایک دوسرے کے مقابل جمع ہونے لگے
روم کی سینٹ نے یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ ''رومن ایمپائر پر اکیٹولیس' لیسپیڈس اور مارک انطو
تینوں مل کر حکومت کریں۔''

چونکہ قلوپطرہ کا کہیں کوئی ذکر نہ تھا پھر وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے بیٹے سیزر بن کے
حالات ناسازگار اور انتہائی مخدوش ہیں اس لیے اس نے مصر واپس جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ
مصر کا تخت وتاج اب تک خالی پڑا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ بلاتاخیر اسکندریہ روانہ ہوگئی۔ اب
قلوپطرہ کی بدقسمتی تھی کہ اسکندریہ پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ ملک قحط کا شکار ہو رہا ہے۔

چنانچہ قلوپطرہ کی ذہانت اس موقع پر کام آئی۔ اس نے شاہی خزانے پر قبضہ کرتے
اس کا منہ بھوکوں مرتے عوام کے لیے کھول دیا۔ اس طرح قلوپطرہ نے اس موقعہ سے پورا
فائدہ اٹھایا۔ شاہی خزانے کو پوری طرح ملک میں قحط کی مصیبتوں کے لیے خرچ کرنے کا
حکم دے دیا۔ اس سے قلوپطرہ کی عوام میں بے حد عزت وتوقیر ہوگئی اور اسے اس حکمت ع
کی بنا پر حکومت پر قابض ہونے اور اسے چلانے کا پورا پورا موقع مل گیا۔

قلوپطرہ نے اگرچہ قحط سے عوام کو بچالیا تھا مگر وہ ابھی حکومت کرتے دو ہی سال گز
سکی تھی کہ مارک انطونی ایک لشکر جرار لے کر ایشیائے کوچک کے ممالک کو روندتا اور فتح
پھریرے اڑاتا ہوا ایران کی حدود میں داخل ہوگیا۔ لوگوں کا عام خیال تھا کہ انطونی ایران

کرنے کے بعد ہندوستان کو بھی رومن ایمپائر کا تابع بنائے گا لیکن نہ معلوم کن وجوہات ک بنا پر اس نے پیش قدمی روک دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ملکہ قلوپطرہ کو جواب طلبی کے لیے اپنے حضور طلب کر لیا۔

ذہین اور شاطر قلوپطرہ کی نظریں رفتار زمانہ پر تھیں۔ اس نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ روم کا مستقبل مارک انطونی کے سپرد ہونے والا ہے۔ انطونی اگرچہ سیزر کی طرح فہم وفراست سے خالی تھا مگر اقتدار بے وقوف سے بے وقوف کو بھی باخبر اور عقلمند بنا دیتا ہے۔ قلوپطرہ کو یہ بھی علم تھا کہ مارک انطونی صرف نفسانی خواہشات کا تابع اور غلام ہے پس اسے قلوپطرہ کے لیے قابو میں کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

اس صورت حال میں قلوپطرہ نے انطونی کو اپنے حسن و رعنائی اور ناز و ادا سے شکار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ وہ اپنی طلبی پر شاہی بجرے میں سوار ہوئی۔ اس وقت قلوپطرہ کی آرائش وزیبائش دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے ہمراہ بے شمار غلام، حسین وجمیل خواصیں اور خادمائیں بھی بجرے پر چمکتی مٹکتی دکھائی دیتی تھیں۔ یوں قلوپطرہ کی آمد کا نظارہ کرنے کے لیے پورا شہر امڈ آیا۔ جب شاہی بجرہ شہر طارصص پہنچا تو اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے شہر کی پوری آبادی ساحل کے کنارے قطاریں باندھ کر کھڑی ہو گئی۔

مارک انطونی اس حسینۂ عالم یعنی قلوپطرہ کو دیکھنے اور ملنے کے لیے بے چین و بے تاب تھا مگر قلوپطرہ نے انتظار بسیار کے بعد بھی قدم ساحل پر نہ رکھے۔ چنانچہ مارک انطونی نے قلوپطرہ کو کھانے کی دعوت دی۔ قلوپطرہ اس کی دعوت میں گئی مگر واپسی پر اس نے بھی مارک انطونی کو رات کے کھانے کی دعوت دی اور اس کی شرکت پر زور دیا۔

مارک انطونی اس دعوت میں بڑے طمطراق سے آیا مگر فتنہ گر اور ذہین قلوپطرہ نے اسے اس معاملے میں بھی شکست سے دوچار کیا۔ اس دعوت کے تمام برتن اور جام مینا تک نقرئی

تھے مگر کوئی خامی نہ تھی۔ قلوپطرہ نے اس میں جدت یہ پیدا کی کہ اس نے ملازمین کو حکم دیا کہ جس امیر اور حاکم نے جو برتن اور جام و مینا استعمال کیے ہیں انہیں وہ تمام سامان محفوظ طریقے سے پیک کر کے ان کے ساتھ کر دیا جائے۔ قلوپطرہ کی مہمان نوازی کا ایک انداز یہ بھی تھ جسے دیکھ کر اور سمجھ کر لوگ اس کی ذہانت اور سلیقے پر عش عش کر اٹھے۔

مگر قلوپطرہ کا یہ نرالا اور دلچسپ عمل' حکمت اور دانائی سے خالی نہ تھا۔ اس نے اپنی فیاضی کے اس مظاہرے سے دو نشانے لگائے اور اس میں کامیاب ہوئی۔ اس کا پہلا نشانہ تو رومن امرا تھے جو قلوپطرہ کے اس حسن سلوک سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ سب کے سب اس کے مداح ہو گئے۔ اس کا دوسرا نشانہ مارک انطونی تھا۔ قلوپطرہ نے اسے اپنی زلفوں کا اسیر کر کے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اگرچہ انطونی کی دعوت میں اس نے وہی تمام حربے استعمال کیے جو اس سے پہلے وہ جولیس سیزر کی دعوت میں آزما چکی تھی۔

قلوپطرہ کے حسن و جمال اور ناز و ادا میں اب دولت کی نمائش بھی شامل ہو گئی تھی جس نے پورا پورا کام کیا اور ان دونوں کے درمیان اگر اجنبیت کی کوئی دیوار تھی تو وہ بھی دھڑام سے گر گئی۔ انطونی کو تو یہ یاد ہی نہ رہا کہ اس نے قلوپطرہ کو ''جواب طلبی'' کے لیے بلایا تھا۔ وہ تو قلوپطرہ کے حسن کے دربار میں ایک غلام کی طرح پیش ہوا تھا۔

پھر جب قلوپطرہ کی گرفت مارک انطونی پر مضبوط ہوئی تو اس نے سب سے پہلے اپنی چھوٹی بہن آرسینو کو اپنے راستے سے ہٹایا۔ مارک انطونی نے آرسینو کا قتل قلوپطرہ کے کہنے پر کرایا تھا۔ اس طرح قلوپطرہ نے اپنے بیٹے سیزر بن کے راستے سے ایک بڑا پتھر ہٹا دیا تھا۔

کیا لطف کی بات ہے کہ ایک طرف تو مارک انطونی' قلوپطرہ کی زلفوں میں الجھا ہوا دادِ عیش دے رہا تھا اور دوسری طرف ''روم'' میں اس کا سب سے بڑا دشمن اکیٹوین اقتدار پر قابض ہونے کے لیے طاقت جمع کر رہا تھا۔ جب مارک انطونی کو اس ابھرتے ہوئے فتنے کی

خبر ملی تو مجبور ہو کر روم گیا۔ مگر روم کی پوری کی پوری فضا اس کی مخالف تھی اور جنگ کی صورت میں اس کی شکست یقینی تھی۔

چنانچہ مارک انطونی نے نہایت عقلمندی کا ثبوت دیا۔ اس نے جنگ کے خیال کو ایک طرف ڈال دیا اور دشمنی کو دوستی میں تبدیل کرنے کے لیے اکیسٹوین کی انتہائی خوبصورت بیوہ بہن سے جس کا نام ''اکیٹویا'' تھا' شادی رچالی مگر وائے ناکامی کہ دلوں کی گرہ اس حکمت عملی سے بھی نہ کھل سکی مگر فی الحال دونوں ہی نے جنگ سے گریز کیا اور بہتر وقت کا انتظار کرنے لگے۔

مارک انطونی اس جھگڑے سے نکلنے کے بعد مشرق کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے ایران کی طرف چلا اور درمیان میں آنے والے تمام اہم مقامات پر قابض ہو گیا۔ اس کی کامیابی کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور اکیٹوین کی شخصیت روز بروز گہناتے ہوئے چاند کی طرح مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ انطونی یہی چاہتا تھا کہ اپنی مقبولیت میں اور سے اور اضافہ کرے۔

لیکن جب مارک انطونی شام پہنچا تو اسے قلوپطرہ کی یاد نے حد درجہ بے چین کر دیا اور اس کے دل میں دبی ہوئی محبت نے ایک شعلے کی صورت اختیار کر لی۔ اکیٹویا سے شادی کرنے کی وجہ سے قلوپطرہ کو اس سے شدید شکایت تھی مگر بگاڑ پیدا کرنے کا مطلب چونکہ تخت و تاج کو خطرے میں ڈالنا تھا اس لیے وہ دل سے نہ چاہتے ہوئے بھی انطونی کے طلب کرنے پر اس کے پاس پہنچ گئی۔ اسے اپنے قیامت خیز حسن اور سحر انگیز خوش کلامی پر پورا بھروسہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے اپنی ذات پر بھی مکمل اعتماد تھا۔ چنانچہ ساڑھے تین سال کی جدائی کے بعد اس نے اپنی اداؤں سے انطونی کو گھائل کر کے ایک نیا معاہدہ عشق کیا جس کی شرائط کچھ اس طرح تھیں۔

۱- ان کی شادی مصری رسم و رواج کے مطابق ہو گی لیکن انطونی مصر کا بادشاہ نہیں کہلائے گا-

۲- شاہ کا خطاب سیزر بن کے لیے مخصوص ہو گا-

۳- مصر کی حدود سلطنت کو فرعونوں کے زمانے کی حدود کے مطابق وسعت دی جائے گی-

ان کڑی شرائط کے مقابلہ پر قلوپطرہ نے صرف یہ وعدہ کیا کہ وہ انطونی کی آئندہ مہمات میں مدد کرے گی-

انطونی اس کے عشق میں اس قدر اندھا ہو گیا تھا کہ وہ یہ تک بھول گیا کہ فاتح ہونے کی حیثیت میں مصر کے تمام وسائل تو پہلے ہی اس کے قبضے میں ہیں اور وہ ان سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے-

اس طرح انطونی پورے ایک سال تک قلوپطرہ کے ساتھ داد عیش دیتا رہا- پھر اس نے قلوپطرہ کے کہنے پر پارتھیا پر چڑھائی کی مگر اسے ذلت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا- اس نے اپنی اس شکست کا انتقام آرمینیا سے لیا- اس نے پورے ملک کو تاخت و تاراج کر کے مندروں تک کی دولت لوٹ لی اور بادشاہ کو گرفتار کر کے فتح کا جشن منانے اسکندریہ آیا- پہلا موقع تھا کہ رومن جنرل نے اپنے ملک سے باہر جشن منایا-

انطونی کی اس سیاسی غلطی سے اسے بہت نقصان پہنچا اور روم کے لوگ اس کے مخالف ہو گئے- یہی نہیں بلکہ انطونی نے دوسری غلطی یہ کی کہ اس نے قلوپطرہ کو ''ملکہ عالم'' کا خطاب دیا اور سیزر بن کو میڈیا اور آرمینیا کا بادشاہ بنا دیا- اس نے اپنی ان غلطیوں کی وجہ سے اپنے دشمن آکٹیوین کے لیے اقتدار پر قبضے کا راستہ خود ہی کھول دیا- لیکن اہل روم کی حمایت کے بغیر آکٹیوین، انطونی سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا-

انطونی کے راگ و رنگ اور قلوپطرہ کے ساتھ عشق کی داستانیں برابر روم پہنچ رہی تھیں- ان خبروں میں جب قلوپطرہ کو "ملکہ عالم" اور سیزر بن کو بادشاہ میڈیا اور آرمینیا بنانے کی خبریں بھی شامل ہو گئیں تو آکٹیوین نے رائے عامہ اور سینٹ کے اراکین کو اپنے حق میں کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ اپنی بہن آکٹیویا کو اس کے خاوند انطونی کے پاس روانہ کیا- قلوپطرہ کو جب آکٹیویا کی روانگی کا علم ہوا تو اس نے خطرے کو بھانپ کر انطونی سے بیوی کو روم واپس چلے جانے پر زور دیا- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آکٹوین کو اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل گیا اور ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے دونوں طرف سے زور شور سے تیاریاں شروع ہو گئیں-

قلوپطرہ تو ایک مدت سے اس وقت کا انتظار کر رہی تھی- اس نے دو جنگی جہازوں کا بیڑہ تیار کیا- غلہ، کپڑا، ہتھیار اور دیگر ساز و سامان کے علاوہ اس نے چالیس لاکھ پونڈ کی رقم بھی ساتھ لی- انطونی کے پاس بھی کئی سو جنگی جہازوں کا بیڑہ اور اعلیٰ تربیت یافتہ فوج موجود تھی- اس کے علاوہ اس کے ماتحت جتنے چھوٹے بڑے بادشاہ تھے وہ بھی اپنی فوجیں لے کر اس کی مدد کو پہنچ گئے- اہل ایتھنز قلوپطرہ کے ہم وطن تھے- انہوں نے اس کا سونے کا بت بنا کر اپنے مندروں میں نصب کر دیا- تمام تیاریوں کے ساتھ انطونی نے آکٹیوین کے خلاف میدان جنگ میں آتے وقت "جمہوریت" کی بحالی کا نعرہ لگایا- اس سے اہل روم کی اکثریت اس کی ہم نوا ہو گئی اور سینٹ کے چار سو اراکین بھاگ کر انطونی کے کیمپ میں آ گئے جس سے اس کی پوزیشن اور زیادہ مستحکم ہو گئی-

آکٹیوین نے اس کا یہ توڑ نکالا کہ اس نے فوراً اعلان عام کرا دیا جس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے-

"میں اپنے ہم وطن مارک انطونی کے خلاف نہیں لڑ رہا ہوں بلکہ میں

مصری مخنثوں کی افواج اور مصر کی جادوگرنی ملکہ کے خلاف لڑنے جا رہا ہوں جس نے روم کے عظیم سپوت، جرنیل اور ہیرو انطونی کو الو کا گوشت کھلا کر بے وقوف اور احمق بنا رکھا ہے۔"

اس طرح دونوں لشکروں میں جنگ ہوئی اور پہلے ہی حملے میں آکٹیوین کے ہلکے پھلکے جہازوں نے انطونی اور قلوپطرہ کے بھاری بھرکم اور دیوہیکل جہازوں کو گھیرے میں لے کر ان کی فوجوں کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ سمندر خون سے سرخ ہو گیا اور لاتعداد لاشیں پانی پر تیرنے لگیں۔ قلوپطرہ نے آکٹیوین کی فوج کا پلہ بھاری دیکھ کر اپنے جہازوں سمیت راہِ فرار اختیار کی اور تیزی سے اسکندریہ پہنچی تا کہ اہل مصر کو شکست کی خبر ہونے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن مضبوط کر لے۔

انطونی کو جب قلوپطرہ کے فرار کا علم ہوا تو وہ اپنی فوجوں کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا حالانکہ اس کی فوج نے بعد میں بھی کئی روز تک آکٹیوین کی فوج کے خلاف جنگ جاری رکھی جس میں پانچ ہزار آدمی مارے گئے اور ان گنت سپاہی زخمی ہوئے۔ یوں انطونی کے تمام جہازوں پر آکٹیوین کی فوج کا قبضہ ہو گیا۔

اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد آکٹیوین نے ایتھنز کا رخ کیا اور اہل ایتھنز کو انطونی اور قلوپطرہ کی حمایت اور مدد کرنے پر سخت سزا دی۔ عام لوٹ مار کی اجازت دی گئی اور بستیوں کی بستیاں اجڑ کر رہ گئیں۔ مندروں کو مسمار کر کے لوٹ لیا گیا۔ دشمن فوج کے وحشیانہ انتقام سے بچے اور خواتین بھی نہ بچ سکے۔ اب وہ جس شہر کا رخ کرتا وہاں کے باشندے اسے خوش آمدید کہتے۔ تحائف پیش کرتے اور ان پر خطابات کی بارش کر کے اپنی جانیں بچاتے۔

اس فتح کی خوشی میں آکٹیوین نے روم واپس آ کر ایک عظیم الشان جشن منایا۔ اس

طرح انطونی کا رہا سہا اثر بھی ختم ہو گیا لیکن اسے بھی ڈر تھا کہ انطونی کسی وقت بھی قلوپطرہ کی مدد اور تعاون سے اس کے لیے خطرہ پیدا کر سکتا ہے اس لیے اس نے مصر پر حملہ کر کے قلوپطرہ کی حکومت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

مگر قلوپطرہ بھی آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھی۔ اس نے بھی اپنے بچاؤ کی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں۔ اس نے پڑوس ممالک سے تعلقات پیدا کر کے ان سے اتحاد کر لیا اور اپنی فوج میں بھی کافی اضافہ کیا مگر اس شکست کا انطونی پر بڑا ناخوشگوار اثر ہوا۔ وہ اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ گوشہ نشین ہو گیا اور جام و مینا سے دل بہلانے لگا۔ قلوپطرہ کے رویہ میں بھی فرق آ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ شراب و کباب میں مصروف رہنے لگا۔

آخر تین سال گزر جانے کے بعد آکٹیوین نے مصر پر حملہ کر ہی دیا۔ وہ تاخت و تاراج کرتا ہوا اسکندریہ تک آ پہنچا۔ انطونی کو جب اس حملے کا علم ہوا تو جام و ساغر کو چھوڑ کر ہتھیار سجا کر میدان میں نکلا۔ اس کے پاس مصر کی صرف ایک مختصر سی فوج تھی۔ اس نے اتنی سی فوج کے ساتھ آکٹیوین پر حملہ کر دیا۔ یہ جنگ جاری تھی کہ مصر کی فوج نے بزدلی دکھائی اور انطونی کو چھوڑ کر آکٹیوین سے جا ملی۔ آکٹیوین کو شبہ ہوا کہ قلوپطرہ نے اسے دھوکہ دیا ہے اس لیے وہ چیختا چلاتا زخموں سے چور اور بلند آواز سے "غدار غدار" چیختا ہوا قلوپطرہ کی طرف چلا۔ قلوپطرہ کو اس کے اس طرح محل کی طرف آنے کا علم ہوا تو وہ خوفزدہ ہو کر مقبرے میں جا چھپی۔ حالانکہ مصری فوج کی غداری سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ تو آکٹیوین کے متوقع حملے کے پیش نظر گزشتہ تین برسوں سے تیاریوں میں مصروف تھی۔

انطونی محل میں داخل ہوتے ہی گھوڑے سے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ پھر جب اسے ہوش آیا تو کسی نے قلوپطرہ کے خودکشی کرنے کی اطلاع دی۔ یہ سنتے ہی وہ اٹھا اور ایک باوقار رومن کی طرح تلوار اپنے سینے میں اتار لی۔ پھر یمن سے اسی لمحے تازہ اطلاع ملی کہ قلوپطرہ کی

خودکشی کرنے کی خبر بالکل غلط ہے۔

انطونی جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا اس نے اپنے جاں نثار ساتھیوں سے کہا

''مجھے اس وقت قلوپطرہ کے پاس پہنچایا جائے''

اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے انطونی کو ڈولی میں ڈال کر مقبرے پر لے جایا گیا جہاں لوگوں کا جم غفیر موجود تھا۔ دوسری طرف قلوپطرہ کو ڈر تھا کہ دروازہ کھولنے کی صورت میں کوئی غدار اسے پکڑ کر آکٹیوین کے حوالے نہ کر دے۔ اس نے اپنی کنیزوں سے کہا۔

''انطونی کو بالائی منزل کی کھڑکی کے راستے' رستوں کے ذریعے اوپر کھینچ لو۔''

انطونی کی حالت جو پہلے سے بہت خراب ہو رہی تھی اس کھینچا تانی میں وہ اور زیادہ ابتر ہو گئی۔ اس نے شراب مانگی' اسے شراب دی گئی جس سے اس کی حالت کچھ سنبھلی۔

پھر انطونی نے بڑے پیار سے قلوپطرہ کو مشورہ دیا۔

''قلوپطرہ! میں تم سے ایک آخری درخواست کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم اسے مان لو گی۔''

قلوپطرہ کو یقین ہو گیا کہ یہ انطونی کا آخری وقت ہے۔ چنانچہ اس نے بڑی فراخدلی سے کہا۔ ''ضرور کہو۔ میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں۔''

''دیکھو قلوپطرہ'' انطونی نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم آکٹیوین سے صلح کر لو۔''

یہ کہہ کر انطونی نے قلوپطرہ کے زانوں پر سر ڈال دیا اور اس عالم میں اس نے دم توڑ دیا۔

کہا جاتا ہے کہ قلوپطرہ انطونی کی لاش سے چمٹی ہوئی رو رہی تھی کہ کہ آکٹیوین نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا اور اس کے چند سپاہی زینہ لگا کر مقبرے میں داخل ہونے میں کامیاب

ہو گئے- اس طرح قلوپطرہ کو گرفتار کر لیا گیا- لیکن آکٹیوین نے انتہائی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کی خواہش کے احترام میں انطونی کی لاش اس کے پاس رہنے دی- لیکن اس کی اس فراخ دلی اور اچھے سلوک کا مقصد قلوپطرہ کے توسط سے سیزر بن کو اسکندریہ بلانا تھا تاکہ اسے قتل کر کے اور قلوپطرہ کو روم لے جا کر اس کی تذلیل کی جائے-

پس قلوپطرہ نے اس کی چکنی چپڑی باتوں کا یقین کر لیا اور وہ اپنے بیٹے سیزر بن کو بلانے پر تیار بھی ہو گئی لیکن کارنیٹس نامی ایک رومن افسر نے قلوپطرہ کو آکٹیوین کے ارادوں سے باخبر کر دیا- ان غیر معمولی اور ناموافق حالات میں قلوپطرہ نے انطونی کی قبر پر جانے کی اجازت مانگی- آکٹیوین نے اسے اجازت دے دی- چنانچہ قلوپطرہ نے نہا دھو کر ہیرے جواہرات سے مرصع لباس پہنا- بناؤ سنگار کیا اور انطونی کی قبر پر جا کر دیر تک قبر سے لپٹ کر روتی رہی- وہاں سے واپس آنے کے بعد اس نے ایک خط لکھ کر آکٹیوین کو بھجوایا-

آکٹیوین خط پڑھ کر مقبرے کی طرف بھاگا اور جب کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ قلوپطرہ بستر پر مردہ پڑی تھی اور دو کنیزیں جانکنی کے عالم میں فرش پر تڑپ رہی تھیں- تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک دہقان انجیروں کی ایک ٹوکری لے کر آیا تھا جس میں انجیروں کے نیچے اس نے سانپ چھپا رکھا تھا- اس سانپ سے قلوپطرہ نے خود کو ڈسوا کر جان دی تھی-

دوسری طرف آکٹیوین نے قلوپطرہ کو اپنے ساتھ روم لے جا کر جشن منانے اور اور اسے پابہ زنجیر روم کی گلیوں میں گشت کرا کر ذلیل کرنے کے منصوبے تیار کر رکھے تھے وہ تمام کے تمام ختم ہو گئے-

ایوا براؤن

محبوبۂ ہٹلر جس نے وفا کے نام پر جان کی بازی لگا دی

ہٹلر کا پہلا معاشقہ ہر اعتبار سے قابل نفرت ہی نہیں بلکہ ایک ایسا ذلت آمیز فعل تھا جس نے پچھلی صدی کے آمر اور جابر ایڈولف ہٹلر کی شخصیت کو گہنا کے رکھ دیا تھا۔ اس کے اس معاشقہ نے اخلاقی اقدار کی کھلم کھلا نفی کی کیونکہ اس کا یہ معاشقہ اس کی اپنی بھانجی گیلی رابن سے تھا جو عمر کے لحاظ سے ہٹلر سے بیس سال سے بھی زیادہ چھوٹی تھی لیکن اس کے اس عشق میں اس قدر شدت تھی کہ جسے ہٹلر زندگی بھر نہ بھلا سکا۔

ہٹلر اور گیلی رابن کی عمروں میں اتنا زیادہ فرق تھا کہ ہٹلر ہر وقت گیلی کے بہک جانے کے تصور سے پریشان رہتا تھا۔ چنانچہ وہ گیلی کی کڑی نگرانی کرتا اور ہٹلر کی اس جابرانہ اجارہ داری سے گیلی کی نہ صرف نجی زندگی کی لذت ختم ہو گئی تھی بلکہ اس کی شخصیت بھی مسخ ہو کے رہ گئی تھی۔

گیلی جوانی اور دوشیزگی کا ایک بھڑکتا ہوا شعلہ تھی جبکہ ہٹلر چمن زارِ جوانی کی حدود پار کر کے بڑھاپے کی دہلیز پر سر رکھے ہوئے تھا۔ چنانچہ گیلی اپنی جوانی کی اس شدت کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے ہٹلر کے ڈرائیور کی جوان بانہوں میں پناہ ڈھونڈ لی۔ بات آخر کھل گئی اور

ہٹلر کی گیلی پر نگرانی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا کیونکہ وہ گیلی کی جوانی کو اپنے تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔

گیلی کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ویانا میں رہنے والے ایک خوبرو جوان سے محبت کرتی تھی مگر اس محبت کے درمیان ہٹلر حائل تھا۔ چنانچہ پہلے تو گیلی نے ہٹلر سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ہٹلر کی بندشوں سے اسے نجات نہ مل سکی اور آخر کار تنگ آ کر اس بے چاری نے ۱۹۳۱ء میں خودکشی کر لی۔

ایڈولف ہٹلر، معصوم گیلی کی خودکشی سے کانپ اٹھا اور وہ کئی دنوں تک اس صدمے سے دوچار رہا۔ اس کے دوستوں کو یہ شبہ پیدا ہوگیا کہ ہٹلر کہیں گیلی کی محبت میں خود بھی خودکشی نہ کر بیٹھے۔ اس لیے انہوں نے ہٹلر کی سختی سے نگرانی شروع کر دی۔ آخر وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ ہٹلر کو بھی آتے آتے صبر آ گیا۔ ہٹلر کو گیلی سے جس قدر محبت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے گیلی کے کمرے کو بالکل اس کی اصلی حالت میں رہنے دیا جانے کا حکم دیا۔ مزید یہ کہ باقاعدگی سے گیلی کے یوم پیدائش اور وفات پر اس کی تصویر پر پھول چڑھاتا تھا۔

دراصل ہٹلر کو اس پہلے معاشقے نے کچھ ایسا سبق دیا کہ وہ بعد میں اپنے دوسرے معاشقے یعنی ایوا براؤن سے عشق کے معاملے میں کافی محتاط ہوگیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کے رویے میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوگئی۔ ایوا براؤن نے کمرشل اسکول میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہنری ہافمین کی فوٹوگرافی کی دکان پر ملازمت اختیار کر لی تھی۔

یہ فوٹوگرافر، ہٹلر کا ایک عزیز دوست تھا اور ہافمین اس کا ذاتی فوٹوگرافر بھی تھا۔ ہٹلر کا اس دکان پر آنا جانا تھا۔ چنانچہ ہٹلر اور ایوا براؤن میں اس دکان پر پہلی ملاقات ہوئی جو بڑھ کر دوستی اور محبت میں تبدیل ہوگئی۔ گیلی کی خودکشی کے بعد ہٹلر کی خلوتیں ویران تو نہیں رہیں

کیونکہ اس کے تعلقات متعدد عورتوں سے تھے لیکن ان میں سے کسی کی جوانی اچھوتی نہیں تھی۔ ہٹلر کا گیلی میں دلچسپی لینے کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک بھولی بھالی اور سادہ طبیعت لڑکی تھی۔ ہٹلر کبھی کبھی ایوا کے لیے گلدستہ بھی لے جاتا اور کبھی کبھار اسے کھانے کی دعوت بھی دیتا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ ہٹلر نے ایوا کو کبھی دل سے نہیں چاہا اور اسے ایک خوبصورت کھلونے سے زیادہ وقعت نہ دی۔ اس کے برعکس ایوا کی نظروں میں ہٹلر ایک دیوتا سے کم نہ تھا۔

ایوا کی ہٹلر کے ساتھ محبت کا سبب یہ نہ تھا کہ ہٹلر کوئی خوبصورت اور البیلا جوان تھا بلکہ ہٹلر کے ساتھ اس کی محبت کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہٹلر اس وقت ایک لیڈر بلکہ مقبول ترین لیڈر تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہٹلر، جرمنی کا سب سے زیادہ طاقتور اور مقبول لیڈر تھا اور آنے والے انتخابات میں اس کا چانسلر منتخب ہو جانا یقینی نظر آتا تھا۔

پھر جس وقت ہٹلر چانسلر منتخب ہوا تو ایوا کی عمر اس وقت صرف اکیس سال تھی اور اس کی جوانی کی رعنائیاں نکھری ہوئی تھیں۔ ایوا اس وقت ایک دبلی پتلی اور حسن و جوانی کا ایک شاہکار دکھائی دیتی تھی۔ اس کا گول چہرہ، نیلگوں شفاف آنکھیں، متناسب گداز بدن اور ریشمی سنہرے بال دیکھنے والے پر غضب ڈھاتے تھے۔ ہٹلر کے ساتھ اس کی دوستی اور تعلقات کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ پھر یہ کہ ایوا اس قدر بھولی اور سادہ تھی کہ وہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ ہٹلر بھی اس سے محبت کرتا ہے اور اس نے تو اپنی ہم جولیوں سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہٹلر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ہٹلر نے ایوا کے بارے میں کبھی ایسا نہ سوچا تھا۔ ہٹلر تو ان لوگوں میں سے تھا جو شادی کے جھگڑوں میں پڑنے کے بجائے عورت کے ساتھ صرف اپنی جنسی بھوک کی تسکین کے لیے تعلقات استوار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ تو اس قول کے پابند ہوتے ہیں کہ جب دودھ حسب ضرورت میسر آ جائے تو گائے کے پالنے کے جھگڑے میں کیوں پڑا

جائے۔ ایوا کو بھی جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ ہٹلر اسے محض ایک کھلونا سمجھ نے کھیل رہا ہے۔ جب ایوا کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا تو وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ اس نے بھی گیلی کی طرح خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ایک دن ایوا نے خودکشی کی ناکام کوشش کی۔ ہٹلر کو اس کی خبر ملی تو وہ بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا۔ اس نے چالاک مردوں کی طرح ایوا کو جھوٹی تسلیاں دینا شروع کیں۔ یہ ضرور ہوا کہ اب وہ ایوا کو پہلے کی نسبت زیادہ وقت دینے لگا۔ ایوا نے بھی صحت یاب ہونے کے بعد ہٹلر کے گھر کے نزدیک ہی ایک مکان کرایہ پر حاصل کیا وہاں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہائش اختیار کی تاکہ ہٹلر کو اس کے پاس آنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ کچھ دن یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ اس کے بعد ایوا نے یہ فاصلہ بھی ختم کر دیا اور اپنی ماں کو ساتھ لے کر ہٹلر ہی کے مکان میں جا کے رہنے لگی۔ چنانچہ فرائیڈ نے خوب کہا ہے۔

''عام طور سے ہم لوگ جسے محبت کہتے اور سمجھتے ہیں۔ دراصل وہ نوے فیصد فریقین کے خوشگوار تعلقات، قربت اور میل و ملاپ پر مبنی ہوتا ہے۔''

ہٹلر اس وقت شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں سے بھی بلند ہو رہا تھا۔ جرمن اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو الہام کا درجہ دیتے تھے۔ ان حالات میں کوئی اور کسی طرح کا بھی اسکینڈل اس کی سیاست کی موت ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایوا نے اپنے محبوب کی خاطر خود اپنے اوپر پابندیاں عائد کر لیں۔ اب وہ کبھی کبھی ہٹلر کے ساتھ تقاریب میں شرکت کرتی۔ چنانچہ جرمن اور میونخ میں ایوا شاذ و نادر ہی ہٹلر کے ساتھ نظر آتی۔ یہاں تک کہ گھر میں نازی پارٹی کی کوئی میٹنگ یا تقریب ہوتی تو ایوا اس میں بھی شرکت کرنے سے گریز کرتی اور اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔

پھر کچھ عرصہ بعد ایوا کی بہن فرایو کی شادی فیجی لین سے ہو گئی۔ جو کہ ہٹلر کا سیکرٹری تھا۔ ایوا اپنی بہن کے رشتے کی آڑ میں کبھی کبھار ان تقاریب میں شرکت کرنے لگی۔ ورنہ وہ ہٹلر

کے گاؤں ''برگ ہاف'' والے مکان میں رہتی جہاں گیلی کی ماں کا قبضہ اور حکمرانی تھی- ابتدا میں ایوا کو گیلی کی ماں کی وجہ سے بہت پریشانی ہوئی- ظاہر ہے کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں- پس ایوا کی آمد کو فرائو نے اپنے لیے چیلنج سمجھا اور دونوں میں ٹھن گئی- ہٹلر کو گھریلو اور خواتین کے معاملات سے فطری طور پر ہی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی- لیکن بعض اوقات اسے مجبوراً مداخلت کرنا پڑتی- دراصل وہ اپنی مرحوم محبوبہ گیلی کی ماں کو جو اس کی بہن بھی تھی، کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اور ایوا بھی اب اس کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی اس لیے اس کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا- آخر نوبت بہ ایں جارسید کہ گیلی کی ماں نے خود کو کمزور پا کر شکست قبول کرتے ہوئے گھر سے چلے جانے کا فیصلہ کیا- اس طرح ایوا کے لیے راستہ صاف ہو گیا- اس کے چلے جانے سے ایوا کو گھر چلانے میں بڑی دشواری پیش آئی کہ وہ گھر چلانے کے فن سے بالکل ہی ناواقف تھی لیکن مارتن بوریلین نے اس کی ہر ممکن مدد کر کے اس کی یہ پریشانی اور مشکل دور کر دی-

ایوا براؤ کی ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اس میں عزت و اختیار اور روپیہ پیسے حاصل ہونے کے باوجود ذرا بھی تبدیلی نہ آئی- اس کی زندگی کی خواہشات محدود رہیں- اسے شوخ و شنگ زندگی سے نفرت تھی- وہ عام اور سادہ لباس پسند کرتی تھی- وہ اپنی نجی زندگی میں بھی ہنگامہ ہاؤ ہو سے دور تھی- البتہ اسے فلم بینی کا بے حد شوق تھا یا پھر وہ عام رومانی ناول پڑھتی تھی-

ایوا کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اور مقصد ہٹلر سے شادی کرنا تھا جبکہ ہٹلر اس کے بارے میں نہایت اچھے جذبات رکھنے کے باوجود شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے سے گریزاں تھا- اس کی خلوتوں میں مبینہ ان گنت حسین و جمیل عورتوں کے نقرئی قہقہے گونجتے رہتے لیکن یورپ کے سیاسی حالات بگڑنے کی وجہ سے ہٹلر کو دن رات کام کرنے میں

مصروف رہنا پڑا اور وہ یونیٹی کو زیادہ وقت نہ دے سکا۔

اسی دوران برطانیہ اور جرمنی کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور لارڈ ریڈمیڈل کو اپنے اہل و عیال کے ساتھ جرمنی چھوڑ کر اپنے وطن انگلینڈ جانا پڑا۔ اس طرح ایوا کی یہ نئی پریشانی خود بخود ختم ہو گئی۔ ایوا کی مستقل رفاقت' خلوص اور وفاداری کی وجہ سے ہٹلر بھی اس سے محبت کرنے لگا تھا اور شادی کے علاوہ اس نے ایوا کی کسی بات کو کبھی رد نہ کیا۔ ایوا بھی اپنے محبوب کے جذبات اور خواہشات کا اس قدر احترام کرتی تھی کہ سگریٹ نوشی کی بہت زیادہ عادی ہونے کے باوجود اس نے کبھی ہٹلر کی موجودگی میں سگریٹ کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ جنگ کے آخری دنوں میں جب ہر شخص ہٹلر کا ساتھ چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا ایسے کڑے وقت میں ایوا نے اس کا ساتھ دیا۔

چنانچہ ہٹلر نے اس کی بے لوث وفاداری سے متاثر ہو کر کہا۔

''ایک میرا کتا بلولڈی اور دوم ایوا کی ذات ہی دنیا میں ایسی ہستیاں ہیں جنہوں نے زندگی کے آخری لمحات تک مجھ سے وفاداری قائم رکھی۔''

چنانچہ ہٹلر کی مستقل رفاقت کے باعث ایوا کو بھی بالآخر خواب وخیال کی حسین چمن زار سے نکل کر حقیقت کی سنگلاخ وادی میں قدم رکھنا پڑا۔ اب ان کی رفاقت میں باہمی اعتماد بھی پیدا ہو چکا تھا۔ ہٹلر اپنا ذہنی بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ایوا سے سیاسی معاملات و واقعات اور فوجی کارروائیوں پر گفتگو کرتا۔ ایوا حد درجہ دلچسپی سے اس کی باتیں سنا کرتی اور کبھی کبھار دبے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کر دیا کرتی۔ ایوا ہٹلر کی خاطر نازی پارٹی کی ممبر بھی بن گئی لیکن سیاست میں اس نے کبھی پرجوش حصہ نہ لیا۔ وہ اگر چاہتی تو قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ وہ ملکی معاملات میں دخل اندازی کر کے بڑے سے بڑے عہدیدار کو اپنی مرضی پر کام کرنے کے لیے مجبور کر سکتی تھی۔ وہ جو فائدہ چاہتی اٹھا سکتی تھی مگر

اس نے کبھی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور اپنی تمام تر خواہشات کو ہٹلر تک ہی محدود رکھا۔

اس کا سب سے بڑا فائدہ ایوا کو یہ ہوا کہ ہر شخص اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ فلم سازی کے بعد ان میں اپنی رائے کا اظہار کیا جس کی بنا پر گوئبلز کو کہنا پڑا۔

"میرے دوست! میرے نزدیک اس بیوقوف لڑکی کی رائے اور تنقید کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔"

گوئبلز کا یہ خیال تلخ ہونے کے باوجود حقیقت پر مبنی تھا۔ اگر ایوا کوئی دوسری عورت ہوتی تو گوئبلز کو لینے کے دینے پڑ جاتے لیکن وہ زیر لب مسکرا کر چپ ہو رہی اور آئندہ کے لیے اس نے اس میدان میں بھی دخل اندازی سے گریز کیا۔ وہ واجبی سی پڑھی لکھی لڑکی تھی اور ذہانت میں بھی اسے اوسط درجے میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ البتہ اچھا وقت میسر آنے کے باعث ایوا آداب محفل سے واقف ہو گئی تھی اور ہر طرح کی تقریبات میں اپنے فرائض بخوبی اور احسن طریقے سے انجام دیتی تھی۔

جنگ کے آخری ایام میں جرمنی افواج کی ہر محاذ پر ذلت آمیز شکست نے ہٹلر کو چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ بعض اوقات معمولی سی بات پر بگڑ جاتا اور غصے میں آ کر جو منہ میں آتا وہ بک ڈالتا۔ اس آزمائش کی گھڑی میں بھی ایوا نے پوری طرح اس کا ساتھ دیا۔ ان حالات میں ہٹلر کے ساتھی، فوج اور سول کے اعلیٰ حکام اپنی جانیں بچانے کی خاطر ایک ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اس وقت بھی ایوا کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی اور صرف وہی ایک ایسی ہستی تھی جس نے آخری سانس تک ہٹلر کا ساتھ دیا۔

پھر ۴۴-۱۹۴۳ میں جب روسی فوج جرمنوں کو شکست دیتیں آگے بڑھتی چلی آ رہی

تھیں- افریقہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور فرانس والے ڈی ڈے کے حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے- ہٹلر کی ذہنی کیفیت کچھ یوں ہو گئی تھی کہ وہ دن رات اپنے دفتر میں بیٹھا نقشوں پر نظریں جمائے جنگی حکمت عملی پر غور کرتا' اتحادیوں اور روسیوں کو برا بھلا کہتا اور اپنے جرنیلوں کو کوسنے دیتا- اس دوران گوئیبلز نے اسے خواب وخیال کی دنیا سے باہر آ کر حقیقت سے باخبر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر بورمین نے اس کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا اور ہٹلر کی خوش فہمی کا طلسم اس وقت ٹوٹا جب روسی فوجیں پولینڈ پر قابض ہونے کے بعد آگے بڑھتی ہوئی جرمنی کی حدود میں داخل ہو گئیں- تین ماہ بعد برطانوی اور امریکن افواج نے بھی دریائے رائن کو عبور کیا اور تیزی سے برلن کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں اور آنے والے چند ہفتوں میں ہٹلر کی عظیم سلطنت کا خواب بکھر گیا اور اس کی حکومت صرف سو میل کی لمبی پٹی تک محدود ہو کر رہ گئی-

یہ اتنا کٹھن وقت تھا کہ ہر شخص کو اپنی جان بچانے کی فکر دامن گیر تھی مگر ایوا گھر کے سکھ چین کو چھوڑ کر اپنے محبوب کے پاس برلن چلی آئی- ہٹلر نے اسے واپس بھیجنا چاہا مگر ایوا نے زندگی میں پہلی اور آخری بار ہٹلر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور آخری سانس تک اس کا ساتھ دیا-

پھر جب ہافمین نے اسے سمجھا بجھا کر واپس جانے کا مشورہ دیا تو اس نے متانت سے جواب دیا-

''تم میرے اور ہٹلر کے تعلقات کو دوسرے لوگوں سے زیادہ سمجھتے ہو پھر بھی چاہتے ہو کہ لوگ مجھے بے وفا ہونے کا طعنہ دیں- مجھ پر ہنسیں اور تمسخر اڑائیں کہ اچھے وقت میں تو ہٹلر کے ساتھ رہی اور جب برا وقت آیا تو اسے چھوڑ کر چلی گئی- میں ایسا کبھی نہیں کروں گی- میں سمجھتی ہوں کہ ہٹلر کو اس وقت میری ضرورت ہے- حالات خواہ کتنے ہی کیوں نہ بگڑ جائیں-

یں آخری سانس تک اس کا ساتھ دوں گی۔''

ایوا کا یہ بہادرانہ جواب سن کر ہا فمین شرمندہ ہو گیا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایوا ایک داشتہ ہونے کے باوجود اپنی جان کی بازی بھی لگا سکتی ہے۔ گو معاشرے اور مذاہب کی نظر میں وہ ایک فاحشہ تھی اور سنگسار کرنے کے لائق تھی لیکن وفاداری میں وہ نپولین کی بیوی ملکہ میری سے ہر اعتبار سے مختلف اور باعث صد تحسین ثابت ہوئی۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ہٹلر کی حکومت صرف سو میل کی پٹی تک محدود ہو چکی تھی۔ سول ور فوجی دفاتر وہاں سے منتقل ہو چکے تھے اور برلن میں صرف ہٹلر کا دفتر رہ گیا تھا۔ ہٹلر کو بھی برلن چھوڑنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔ آخر اپنے ساتھیوں کے بے حد اصرار اور حالات کی مجبوری کے تحت اس نے بھی ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو چھپن برس کی عمر پہنچنے پر اپنی سالگرہ سے فارغ ہونے کے بعد برلن چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔

اس کی سالگرہ کی تقریب یا سیاسی کانفرنس میں تمام چوٹی کے نازی رہنما مثلاً رابن راپ، گوئیبلز، بورین، سپیئر، گورنگ اور تمام محکموں کے سربراہ شریک ہوئے۔ وہ سب ان یوس کن حالات میں بھی اس بات پر متفق تھے اور اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ ہٹلر کے بویریا منتقل ہونے کے بعد روس اور اتحادیوں کے خلاف کامیاب جنگ لڑی جا سکتی ہے۔

لیکن دوسرے دن ہٹلر نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ اس نے تمام تجاویز کو مسترد اور فیصلوں کو منسوخ کر کے روسی فوجوں کے خلاف عام حملہ کرنے کا حکم دیا اور جرنیلوں کو صاف الفاظ میں دھمکی دی کہ جو بھی حکم عدولی کرے گا اس کا کورٹ مارشل ہوگا۔

مگر حالات کسی اور نہج پر چل پڑے تھے۔ ابھی نازی افواج ہٹلر کے حکم پر عمل کرنے کی تیاریاں ہی کر رہی تھیں کہ برلن کے شمالی حصہ میں روسی فوجیں داخل ہو گئیں۔

ایڈولف ہٹلر نے فوری طور پر یعنی ۲۲ اپریل کو ہنگامی اجلاس طلب کیا جو تین گھنٹے جا
رہا۔ اس تاریخی اجلاس میں ہٹلر خوب گرجا برسا اور آخر میں انتہائی جوشیلے الفاظ میں ا
برلن میں رہنے کا اعلان کرتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا کہ جو لوگ اپنی جان بچانا چا
ہیں انہیں برلن چھوڑنے کی پوری آزادی اور اختیار ہے۔ اس اجلاس کے بعد ہٹلر ا
دوست گوئیبلز کو ساتھ لے کر بنکر میں چلا گیا۔ وہاں اس نے تمام ضروری اور اہم دستاویزات
نذر آتش کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ سکیں۔

اس تاریخی بنکر کے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ اسے زمین سے پچاس فٹ نیچے تعمیر
گیا تھا۔ جس کے اوپر چانسلر کی عظیم الشان عمارت کھڑی تھی۔ اس بنکر کے لیے یہ کہنا غلط
ہوگا کہ صرف جرمنی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں اس جیسی محفوظ ترین کوئی اور جگہ نہ تھی۔ اس
نہ تو توپوں کی گولہ باری اثر کرسکتی تھی اور نہ اسے ہوائی حملے میں کسی قسم کا خطرہ تھا۔

اس بنکر میں ایوا براؤن کے پاس تین کمرے تھے جبکہ ہٹلر کے پاس صرف دو تھے۔ ا
طرح ہٹلر کے معالج کو بھی وہاں دو کمرے دیے گئے تھے۔ اوپر کی منزل میں گوئیبلز اپنے بی
بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

ہٹلر سطح زمین سے پچاس فٹ نیچے کئی مہینوں تک خوف و دہشت اور غصے کے عالم
پیچ و تاب کھاتا رہا اور آخری چند دنوں کے دوران تو اس کی حالت نیم پاگلوں جیسی ہوگئی تھ
اس نے اس دوران کئی ہنگامی اجلاس بھی طلب کیے مگر طویل بحث و مباحثہ کے بعد بھی ک
نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور حالات لمحہ بہ لمحہ بدتر صورت اخت
کرتے جارہے تھے۔

ایک دن نہ جانے ہٹلر کو کیا سوجھی کہ اس نے گوئرنگ کے بجائے گریم کو ہوائی فو
کمانڈر مقرر کرنے کے احکامات جاری کرتے ہوئے اسے برلن طلب کیا۔ اس میں شک

کہ یہ گریم کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا- چنانچہ وہ حکم ملتے ہی متعدد جنگی طیاروں کی حفاظت میں برلن روانہ ہوا- گریم جس طیارے میں سفر کر رہا تھا اس کی پائیلٹ حنا تھی- برلن تک اس سفر میں کئی جرمن جنگی طیاروں کو اتحادیوں نے مار گرایا- گریم خود بھی زخمی ہوا مگر وہ برلن پہنچنے میں کامیاب ہو گیا- ہٹلر نے حنا کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اسے زہر کا کیپسول دیا تاکہ دشمن کے ہاتھوں گرفتاری سے بچنے کے لیے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے- یہ الگ بات ہے کہ حنا کو اپنی زندگی عزیز تھی اس لیے اس نے موت کی بجائے گرفتار ہونے کو ترجیح دی-

ان حالات میں جب ہٹلر بھی مایوس ہو چکا تھا- اس وقت بھی ایوا براؤن کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی اور نہ وہ خوفزدہ ہوئی بلکہ وہ ہٹلر کی پریشانیوں کا ازالہ کرنے کی خاطر ہر وقت خوش وخرم رہتی اور ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی تھی-

۲۶ اپریل ۱۹۴۵ء کو برلن کے گلی کوچوں میں جنگ شروع ہو گئی- ہر گھر مورچے میں تبدیل ہو گیا اور جرمن اپنی جانیں مادر وطن پر قربان کرنے لگے- ہٹلر اپنے ہم وطنوں کی ہمت اور قربانیوں کو دیکھ کر پرامید ہو جاتا لیکن جب حالات کی سنگینی پر غور کرتا تو چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتیں اور وہ غصے کے عالم میں پاگل پن کی حد تک جا پہنچتا مگر اس کے برعکس ایوا براؤن بہت پرسکون تھی- جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتی ہے-

دو دن بعد حالات مزید خراب ہو گئے- فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں- جرمن فوجیں مرکٹ کر ختم ہو رہی تھیں یا پھر شکست کھا کر ہتھیار ڈال رہی تھیں- ان حالات میں ہٹلر نے ہوائی فوج کے نئے کمانڈر گریم کو حنا کے ساتھ برلن سے فرار ہونے کا حکم دیا-

ان تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایوا کو اس کی بے لوث محبت، خلوص اور

وفاداری کا انعام دینے کے لیے آیا- ایوا براؤن نے اپنی زندگی کی بازی بھی محض اس انعام اور ایک خواہش کی تکمیل کے لیے لگائی تھی- یہی اس کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش بھی تھی- اس نے اپنا سکھ چین، انا، وقار اور عزت و ناموس غرضیکہ سب کچھ اسی زبردست خواہش کی تکمیل کے لیے ہٹلر کے قدموں پر نچھاور کر دیے تھے-

ہٹلر کے حکم پر گوئیبلز نے فوراً ہی ایک میونسپل کونسلر کا انتظام کیا جس کے پاس شادی کرانے کا لائسنس تھا- ایوا اور ہٹلر کی شادی کے گواہوں کے فرائض گوئیبلز اور اس کی بیوی بورمین نے ادا کیے- شادی کی اس رسمی کارروائی کے بعد گوئیبلز، اس کی بیوی بورمین، ہٹلر کے دونوں پرسنل سیکرٹری، خانساماں اور ایڈ جوئنٹ سب کے سب ایوا کی نشستگاہ میں گئے جہاں ہٹلر نے اپنے مہمانوں کی شراب سے تواضع کی- اس وقت وہ انتہائی خوش دکھائی دے رہے تھے اور انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے ہولناک انجام سے خوفزدہ نہیں-

بیتے دنوں کی باتیں ہو رہی تھیں- قہقہے لگ رہے تھے- تھوڑی دیر بعد ہٹلر اپنے ایک سیکرٹری کو لے کر اپنی خوابگاہ میں گیا- اپنی وصیت لکھائی جس میں اس نے اپنے سیاسی نظریات اور مقاصد پر مفصل روشنی ڈالنے کے بعد اپنی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ لکھ دیا- اس وصیت میں ایوا کی بہت تعریف و توصیف کرتے ہوئے اس نے لکھا-

> ''اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے میرا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ میں خوشگوار عائلی زندگی گزارنے کا اہل نہیں ہوں- اب میں نے اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں ختم کرنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک ایسی عورت سے شادی کی ہے جو سالہا سال میری مونس و غمخوار اور وفادار رہی ہے- اس نے کسی لالچ اور خوف کے بغیر میرے ساتھ اپنی زندگی کو ختم

کرنے کا اہم فیصلہ کیا ہے- ہم دونوں اپنے ملک اور قوم کی خدمت
کرنے کے درمیان جس خوشی سے محروم رہے ہیں میرے خیال میں
ہماری زندگیوں کی یہ قربانی ہمارے ان دکھوں اور محرومیوں کا مداوا
ثابت ہوگی-''

اپنی وصیت لکھوانے کے بعد وہ اطمینان سے سو گیا جبکہ گوئبلز اس وقت اپنی وصیت لکھوانے میں مصروف تھا- گوئبلز کی یہ تحریر وصیت نہیں بلکہ اسے سیاسی منشور کہنا زیادہ صحیح ہوگا-

دوسرے دن صبح اٹھتے ہی اپنی اور گوئبلز کی وصیتوں کو سربمہر کر کے کمانڈ ہیڈ کوارٹر بھجوا دیا گیا- تاکہ اتحادی افواج کی پیش قدمی اور خونریز جنگ میں ضائع ہونے سے محفوظ رہے- بہت ممکن تھا کہ گوئبلز اپنی خودکشی کرنے کا ارادہ ترک کر دیتا لیکن موسولینی اور اس کی داشتہ کلدرا کی عبرت ناک موت اور لاشوں کی تحقیر و تذلیل کی اطلاع ملنے پر اس نے پختہ ارادہ کر لیا-

موسولینی اور کلدرا کو گولی مار کر ہلاک کرنے کے بعد دونوں کی لاشیں دارالحکومت کے چوراہے پر الٹی لٹکا دی گئی تھیں جن پر ہر راہ گیر تھوکتا' جوتے مارتا اور بعض نازیبا حرکتیں بھی کی گئیں-

تیس اپریل کو صبح ہٹلر نے اپنی بیوی ایوا براؤن کے ساتھ بڑے اطمینان اور سکون سے حسب معمول ناشتہ کیا اور پھر تمام اسٹاف کو بلا کر ہر ایک سے مصافحہ کیا- ان کی خیریت معلوم کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا- ہر شخص خوفزدہ اور پریشان تھا جبکہ ہٹلر انتہائی پرسکون' بے خوف اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا-

روسی افواج آگے بڑھتی ہوئی چانسلری کی عظیم الشان عمارت سے دو بلاک کے فاصلے

تک پہنچ چکی تھیں اورتوپوں کے گولے پھٹنے کی آوازیں بنکر میں بھی سنائی دے رہی تھیں-

اب دوپہر ہوگئی- ہٹلر نے دوپہر کا کھانا اپنے باورچی' سیکرٹریوں اوراپنی بیوی ایوا کے ساتھ ایک ہی میز پر کھایا اورایک بار پھر سارے اسٹاف سے ملاقات کی اور خدا حافظ کہہ کر ایوا کا ہاتھ پکڑے نشستگاہ میں چلا گیا- چند ہی لمحے گزرے تھے کہ گولی چلنے کی آواز سنائی دی اوراسٹاف بھاگ کر کمرے میں داخل ہوا تو ہٹلر کی لاش خون میں لتھڑی ہوئی پڑی تھی- ایوا براؤن بھی اپنے نامور خاوند کے پہلو میں صوفے پر بے جان پڑی تھی اور ہٹلر کا کتا بلونڈی بھی مردہ پڑا تھا- ایوابراؤن نے زہر کا کیپسول نگل کر جان دی تھی-

ہٹلر نے کیپسول کھانے کے ساتھ پستول کی نال منہ میں رکھ کر گولی چلائی تا کہ اس کے زندہ بچنے کا ہر امکان ختم ہوجائے-

اس کی وصیت کے مطابق دونوں میاں بیوی کی لاشوں کو پٹرول چھڑک کر جلا دیا گیا تا کہ دشمن کے ہاتھ ان کی لاشوں کو بھی نہ لگنے پائیں-

میری ویلوسکی

نپولین کی محبوبہ، حسن و جمال کا پیکر جس کی حب الوطنی فقید المثال تھی

انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں پولینڈ سیاسی اعتبار سے یورپ کے نقشے پر موجود نہیں تھا۔ پرشیا، روس اور آسٹریا نے فرانس کے اندرونی خلفشار سے فائدہ اٹھا کر اس چھوٹے سے ملک کو آپس میں تقسیم کرلیا۔ پولینڈ کے حریت پسند باشندے بے پناہ جانی قربانیاں دینے کے باوجود آزادی حاصل نہ کرسکے اور اب وہ حالات کی کروٹ لینے کا انتظار کر رہے تھے۔

نپولین نے نہ صرف فرانس کے اندرونی خلفشار کو ختم کر کے مستحکم حکومت قائم کرلی بلکہ یورپ کے تمام طاقتور ممالک کے لیے خطرہ بن گیا۔ اس نے ۱۸۰۱ء میں آسٹریا کو شکست دی اور پانچ سال بعد فاتح کی حیثیت میں برلن میں داخل ہونے کے بعد مشرق کی جانب دریائے ویسٹولا کا رخ کیا جہاں پرشیا اور روس کی متحدہ افواج اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ پولینڈ کے باشندوں نے حالات کی یہ کروٹ بدلتے دیکھ کر در پردہ نپولین کی مدد کرنا شروع کردی۔ جس سے دشمن طاقتوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا اور ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

پولینڈ کے باشندوں کی ہمیشہ سے یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہاں کے مرد ہی سیاست میں عملی حصہ نہیں لیتے بلکہ عورتیں ان سے بھی دو قدم آگے رہتی ہیں۔ ان محب وطن خواتین

میں ایک انتہائی خوبصورت لڑکی میری ویلوسکی کا نام پولینڈ کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا
جس نے وطن کی قربان گاہ پر اپنی عصمت وعفت تک بھینٹ چڑھا دی لیکن صلے میں اسے و
سے رسوائی' ذلت' بدنامی اور خانماں بربادی ملی-

میری کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے پیشتر اس کی ابتدائی زندگی کے حالات سے
واقف ہونا بہت ضروری ہے-ایک وقت تھا جب اس کے آباؤ اجداد کا شمار ملک کے بڑے
زمینداروں میں ہوتا تھا مگر امتداد زمانہ کے ہاتھوں مالی حالات بگڑتے چلے گئے اور نوبت
فاقوں تک آ پہنچی- ان مالی پریشانیوں اور افلاس سے تنگ آ کر آخر ایک دن میری کا باپ
میتھیو گھربار' بیوی اور چھ بچوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلا اور ایسا غائب ہوا کہ پھر کسی نے اس کا نام
تک نہیں سنا- میتھیو کا بڑا بیٹا نپولین کی فوج میں بھرتی ہو گیا کہ ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں
کی کفالت کر سکے لیکن ہوا یہ کہ ملازمت ملتے ہی قرض خواہوں نے پریشان کرنا شروع کر دیا
اور کنبے کے حالات مزید بگڑ گئے-

اسی فاقہ مستی اور نکبت میں میری کا بچپن گزرا اور وہ جوان ہو گئی- حسن و جمال کا ایسا
شاہکار جسے دست قدرت نے خود تراشا ہو- جو کوئی بھی دیکھتا دل مسوس کر رہ جاتا- جوان
لڑکوں کی تو بات چھوڑیے- بوڑھے عشاق کی بھی کمی نہیں تھی جو زندگی کے آخری سفر پر جانے
سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے اس کی سنہری زلفوں کے ٹھنڈے سائے میں ستا لینا چاہتے
تھے- ان چاہنے والوں میں وارسا کا ستر سالہ بوڑھا گورنر کاؤنٹ اٹانس ویلوسکی بھی شامل
تھا- جس کی سب سے چھوٹی پوتی بھی سترہ سالہ میری سے عمر میں دس سال بڑی تھی-

میری ابھی عمر کے اس دور میں تھی جس میں لڑکے اور لڑکیاں رومان کی تصوراتی دنیا
سجائے ہوتے ہیں- جذبات میں خلوص اور احساسات میں سادگی ہوتی ہے میری نے بھی
اپنے رومانی جذبات کی تسکین کے لیے پیرس میں اپنی سہیلی الزبتھ کے پاس جانے کا پروگرام

بنایا لیکن اس کی ماں اور بھائی ٹیوڈر نے یہ سوچ کر کہ کہیں سونے کی چڑیا ہاتھ سے نہ نکل جائے' انہوں نے اسے کاؤنٹ ویلوسکی کو آگے بڑھایا- میری بھی ایسی نادان نہیں تھی کہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی گود میں گر پڑتی- اسے علم تھا کہ کاؤنٹ ویلوسکی کا بڑھاپا اس کی انگارے کی طرح دہکی ہوئی جوانی کے بوجھ تلے دب کر ٹوٹ جائے گا- نیز وہ اسے باپ کی شفقت تو دے سکتا ہے لیکن جوانی کے بھڑکے ہوئے الاؤ کو جس محبت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس متاع کو لٹا چکا ہے-

میری کو رام کرنے کے لیے کاؤنٹ ویلوسکی نے کاؤنٹیس ڈی وایو بان کو آگے بڑھایا جو بڑی چالاک' ہوشیار' انتہائی مکار اور جہاندیدہ عورت تھی اور خود بھی شاہ پولینڈ کے بھتیجے کی داشتہ رہ چکی تھی اور اس کی تمام جائیداد کی وارث بھی وہی تھی- اس نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد خود کاؤنٹ ویلوسکی کو پھانسنے کے لیے ڈورے ڈالنا شروع کر دیے تھے-

ویلوسکی بھی گرگ باراں دیدہ تھی- اس نے جلد ہی میڈم وایو بان سے چھٹکارا پالیا اور میری کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے خود کوشش کرنے کا فیصلہ کیا- اس نے میری کی سیاست میں دلچسپی جاننے کے لیے خود بھی سیاسی چال چلی اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا قومی وملکی سیاست پر باتیں کیا کرتا- میری بھی پرجوش انداز میں اس سے بحث کرتی مگر جب وہ گھما پھرا کر اپنے مطلب کی بات شروع کرتا تو میری مسکرا کر موضوع بدل دیتی- اس طرح مہینے گزر گئے- بوڑھا ویلوسکی مایوس ہو گیا مگر میری کی ماں نے اس کی ہمت بڑھائی- بیٹی کو سمجھایا اور پھر دباؤ ڈالنا شروع کیا- حتیٰ کہ میری کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ شدید بیمار پڑ گئی-

انہی دنوں میری کی عزیز ترین سہیلی الزبتھ کی اپنے خاوند سے ناچاقی ہو گئی اور وہ طلاق لے کر پیرس سے وارسا چلی آئی- اس نے اپنی سہیلی کی دلجوئی کی اور ہمت بندھائی- اس کی

تیمارداری اور ہمدردی کے باعث میری کی صحت سنبھلنے لگی لیکن وہ اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ ڈاکٹروں نے چند ماہ کے لیے کسی نسبتاً گرم مقام پر بھیجنے کا مشورہ دیا- بصورت دیگر کسی بھی وقت ڈبل نمونیہ کا شکار ہونے سے زندگی سے ہاتھ دھونے کا خطرہ تھا- میری کی ماں تو ایک مدت سے ایسے موقع کی تاک میں تھی- اس نے بیٹی کو سمجھایا اگر وہ کاؤنٹ سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے تو وہ نہ صرف اس کے علاج معالجے کے تمام اخراجات برداشت کرنے کے لیے تیار ہے بلکہ کنبے کی مالی مشکلات بھی ختم ہو جائیں گی-

دونوں میں بات بڑھ کر تلخ کلامی تک جا پہنچی- ''تم اتنی بے حس ہو کہ خاندان کی عزت و ناموس فروخت کر دینا چاہتی ہو-'' میری نے روتے ہوئے کہا-

''عزت و ناموس اور وہ بھی غریب کی!'' ماں نے قہقہہ لگا کر جواب دیا-

''یہ خوبصورت اور دلکش الفاظ کتابوں ہی میں اچھے لگتے ہیں- بیٹی تم نے ابھی دنیا میں قدم رکھا ہے- بہت جلد سمجھ جاؤ گی کہ عزت و ناموس کی عیاشی کا متحمل کوئی بھی غریب شخص نہیں ہو سکتا-''

ماں کی یہ بات سن کر وہ کانپ گئی- وہ غربت کی ذلت اور افلاس کی اذیت سے بے خبر نہیں تھی- اسے تصورات کی رومانی دنیا سے نکل کر حقیقت کی تلخیوں کو تسلیم کرنا ہی پڑا-

اور فروری ۱۸۰۵ء میں سترہ سال کی عمر میں اس کی شادی ستر سالہ بوڑھے مگر انتہائی مالدار کاؤنٹ ویلوسکی سے کیہ ونورزیا کے گرجے میں خاموشی اور سادگی سے انجام پا گئی یا یہ کہہ لیجیے کہ دولت نے غربت پہ فتح پالی- میری کی رازدار سہیلی الزبتھ جس نے ایک دن اس کو گھر سے فرار ہونے میں ہر ممکن مدد دینے کا وعدہ کیا تھا- اسے بھی میڈم وایوبان کے ساتھ شادی میں شریک ہو کر سہیلی کو مبارکباد دینا پڑی - حالانکہ اسے اس انمیل اور بے جوڑ شادی کے بہت جلد ناکام ہو جانے کا یقین تھا-

میری اپنے بوڑھے خاوند کے ساتھ ہنی مون منانے کے لیے روم چلی گئی- جہاں کی خوشگوار آب وہوا اور ہر طرح کے آرام وآسائش کی وجہ سے وہ پوری طرح صحت یاب ہوگئی اور پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت دکھائی دینے لگی- شب وصال کے بعد شباب کی رعنائیاں نکھرنے سے اس کا حسن قیامت خیز لگنے لگا-

کاؤنٹ ویلوسکی نے حسب وعدہ اس سودے کی پائی پائی چکا دی- میری کے کنبے کی مالی حالت سدھر گئی تمام قرضے ادا ہو گئے- بنجر زمین آبادی میں تبدیل ہوگئی اور سالہا سال کے اجڑے بچڑے گھر میں خوشحالی کا دوردورہ ہو گیا-

ایک سال بعد وہ بیٹے کی ماں بھی بن گئی گویا اسے زندگی کی ہر نعمت میسر تھی- مہربان خاوند' خوبصورت بیٹا' دولت اور عزت' اسے اب کسی چیز کی حاجت نہیں تھی- نوجوانی کے رومانی تصورات سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ اپنی موجودہ زندگی سے پوری طرح خوش اور مطمئن تھی-

کہتے ہیں جب انسان کا پیٹ خالی ہو تو اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی- پیٹ کی آگ بجھ جائے تو چونچلوں کی سوجھتی ہے- میری کی بھی یہی حالت تھی- اب اس نے ہر طرف سے بے فکر ہو کر سیاسی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا تھا- اپنی رازدار سہیلی الزبتھ کے تعاون اور مشورے سے ایک سیاسی تنظیم بنالی تھی- نپولین کے حق میں پراپیگنڈہ کرنے لگی تھی- اس کا خیال تھا کہ نپولین ہی اس کے دشمنوں کی متحدہ طاقت کو شکست دے کر پولینڈ کو ان کے دست استبداد سے نجات دلا سکتا ہے- اسی دوران اسے اطلاع ملی کہ نپولین نے وارسا آنے کا اعلان کیا ہے- لیکن اس سے پیشتر سیاسی رہنماؤں سے معاملات طے کر لینے کے لیے وہ سوچتا ہے وارسا میں داخل ہوتے وقت کسی قسم کی مخالفت اور مزاحمت نہ ہو اور خون خرابے سے بچا جا سکے-

ان دنوں پولینڈ کے باشندے عجب ذہنی الجھاؤ کا شکار ہو رہے تھے۔ ان میں سے انتہا پسند مکمل آزادی حاصل کرنے کے خواہاں تھے جبکہ دوسرا گروپ روس کے ساتھ الحاق کا حامی تھا اور اعتدال پسند نپولین کے طرفدار ہونے کے ساتھ اپنا قومی تشخص بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان تمام حالات سے باخبر ہونے کی وجہ سے نپولین نے سیاسی فہم وفراست سے کام لیتے ہوئے پولینڈ کے تمام سیاسی رہنماؤں سے بات چیت کر کے عبوری حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ ہی انتہائی تیزی سے پرشیا اور روس کی متحدہ فوجوں کے خلاف کارروائی کر کے شکست دی اور انہیں پولینڈ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

نپولین کی اس تمام کارروائی سے میری کو خوشی کے ساتھ اس بات پر شدید رنج بھی ہوا کہ نئی قومی حکومت کی تشکیل کرتے وقت اس کے نامور خاوند کاؤنٹ ویلوسکی کو کوئی عہدہ نہیں دیا گیا تھا۔ بلاشبہ اسے میری کی خودغرضی ہی کہا جائے گا لیکن کاؤنٹ کی سیاسی بصیرت، تجربہ اور خاندانی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس وقت کے حالات میں یہ بات یقیناً اس کے لیے باعث تکلیف تھی۔

نپولین ان تمام ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا حالات کا جائزہ لینے لگا اور چند دن بعد یکم فروری ۱۸۰۷ء کو پولینڈ کے دارالحکومت وارسا میں جانے کا اعلان کیا۔ وارسا کے باشندے، اعلیٰ حکام اور سیاسی رہنما اس کے شایان شان استقبال کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے جبکہ میری نے الزبتھ کے ساتھ مشورہ کر کے نپولین کو خوش آمدید کہنے کے لیے برونی جانے کا پروگرام بنایا۔ دونوں سہیلیاں یکم فروری کی صبح کو اپنی ایک نوکرانی کے گھر اکٹھی ہوئیں اور اس کے کپڑے عاریتاً لے کر پہننے کے بعد برونی روانہ ہو گئیں۔ جہاں نپولین کی بگھی کے گھوڑے تبدیل کیے جانا تھے۔

بیرونی اور قرب و جوار کے دیہاتی بھی نپولین کی آمد کا سن کر اکٹھے ہو گئے اور فرط

مسرت سے نعرے لگا رہے تھے مگر نپولین تمام باتوں سے بے نیاز بگھی میں بیٹھا ہوا تھا اور گرانڈ مارشل ڈیوراگ بگھی کے دروازے کے ساتھ کھڑا لوگوں کے نعرہ ہائے تحسین پر خوش دکھائی دے رہا تھا- میری بھی الزبتھ کے ساتھ ہجوم میں گھری ہوئی دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو ہٹا کر آگے بڑھنے کے لیے زور لگا رہی تھی- جب اسے آگے بڑھنے کا راستہ نہ ملا تو پریشان ہو کر ڈیوراک سے مدد کی خواستگار ہوئی- اس نے آگے بڑھ کر ہجوم کو پیچھے ہٹایا اور میری کا نرم ونازک ہاتھ پکڑے شاہی بگھی کے پاس لے آیا- اس کا خیال تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی نپولین کو نزدیک سے ایک نظر دیکھنا چاہتی ہے مگر وہ بڑے ادب سے نپولین کے سامنے جھکی اور پر جوش انداز میں تقریر کرنا شروع کر دی- نپولین کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پولینڈ کے عوام اس طرح والہانہ انداز میں اس کا استقبال کریں گے- اس نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر خوبصورت میری کی طرف دیکھا اور وہ نپولین کو اپنی طرف متوجہ پا کر پہلے سے یاد کی ہوئی تقریر بھول گئی اور تعریف وتوصیف میں بے ربط فقرے کہنے لگی- اس کی گھبراہٹ، سادگی، حسن اور بے ربط فقروں کو سن کر نپولین بے ساختہ ہنس دیا-

✓ تھوڑی دیر برونی میں رکنے کے بعد نپولین وہاں سے روانہ ہو کر فاتحانہ طمطراق اور ن ان سے وارسا میں داخل ہوا- شہزادہ پونیا ٹووسکی نے آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا اور نائدین سلطنت شہر کی آبادی نے بھی پولینڈ کے نجات دہندہ کا شاندار استقبال کیا اور جلوس لی شکل میں شاہی محل لے جایا گیا-

دوسرے دن باتوں ہی باتوں میں گرانڈ مارشل ڈیوراک نے شہزادہ پونیا ٹووسکی سے .وتی میں استقبال کرنے والے دیہاتیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نپولین ان دو لڑکیوں ں سے تقریر کرنے والی خوبصورت لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے- شہزادہ خود بھی .لین اعظم کو خوش کرنے کے لیے موقع تلاش کر رہا تھا- ڈیوراک کا مقصد اور اشارہ سمجھ کر

اس نے متعدد آدمیوں کولڑکیوں کا کھوج لگانے کا حکم دیا۔ انہوں نے دوسرے ہی دن الزبتھ کو ڈھونڈ نکالا بس پھر کیا تھا برونی میں تقریر کرنے والی خوبصورت میری ویلوسکی کا علم ہوتے ہی شہزادے نے نپولین کے اعزاز میں مے نوشی کی پارٹی کا اہتمام کیا جس میں معززین شہر، عمائدین سلطنت بڑے تاجروں کے علاوہ کاؤنٹ ویلوسکی اوراس کی بیوی میری ویلوسکی کو بھی مدعوکیا۔

یہ دعوت نامہ ملتے ہی میری کو اپنی حماقت کا احساس ہوگیا مگراب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا لیکن اس نے اپنے خاوند کی نیک نامی کو داغدار ہونے سے بچانے کی خاطر دعوت نامہ مسترد کرتے ہوئے دعوت میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ شہزادے نے نپولین کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع ہاتھ سے جاتے دیکھ کرفوراً میڈم وایوبان اورالزبتھ کو میری کے پاس بھیجا تا کہ اسے پارٹی میں شریک ہونے کے لیے رضامند کریں۔ ان دونوں کے اصرار پرمیری نے پارٹی میں شرکت تو کر لی لیکن نپولین کی نظروں سے بچنے کے لیے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔ شہزادہ پونیاٹووسکی نے تو صرف اسی کے لیے پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ وہ بھلا میری کو کیسے سب سے الگ تھلگ چھپ کر بیٹھے رہنے دیتا۔ اس نے تمام مہمانوں کا نپولین سے تعارف کرایا۔ میری بھی ان میں شامل تھی۔ نپولین نے ایک نظر حسن وجمال کے شاہکار کو دیکھا اور غصے میں کہنے لگا کہ وہ عام دیہاتی لڑکی کا بھیس بدل کر برونی کیوں گئی تھی اور یہ ناٹک رچانے کا مقصد کیا تھا؟

نپولین کے اس اچانک حملے سے میری ڈر گئی اورکوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہاں پرموجود ہر شخص مبہوت کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ خدا جانے نپولین اب میری ویلوسکی کی قسمت کیا فیصلہ سناتا ہے مگر خلاف توقع نپولین نے دوسرے ہی لمحے اپنے رویے میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر کے پیار بھرے لہجے میں دوسرے دن ملاقات کرنے کا فیصلہ سناتے ہوئے ڈیورا ک

حکم دیا کہ وہ میری کو شاہی بگھی میں اس کے گھر پہنچا دے۔

دوسرے دن صبح جب میری کی آنکھ کھلی تو میڈم وایوبان اور الزبتھ کو اپنی خوابگاہ میں موجود پا کر سمجھ گئی کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے اور دونوں کو خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے نپولین کی طرف سے بھیجا ہوا گلدستہ اور خوشبو میں مہکا ہوا خط میری کو دیا جس میں لکھا تھا:

''میری بے چین آنکھیں تمہاری دید کی مشاق ہیں۔ دنیا میں تم ہی ایسی ہستی ہو جس سے مجھے محبت ہے۔''

اس محبت نامے کو پڑھ کر وہ غصے میں آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے میڈم وایوبان اور الزبتھ کو بے نقطہ سناتے ہوئے آئندہ کے لیے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ غصے میں اتنی مشتعل تھی کہ نپولین کو بھی نہیں بخشا اور جو منہ آیا کہہ دیا اور نپولین کا بے ہودہ خط اپنے خاوند کو دکھانے اور سارے ملک میں اس کی تشہیر کرنے کی دھمکی دی۔ اس کی دھمکی سے وہ دونوں ہی نہیں شہزادہ بھی گھبرا گیا اور متعدد بلند مرتبت دوستوں کو لے کر میری کے پاس گیا۔ منت خوشامد کر کے اسے اپنے ارادے سے باز رکھنے پر راضی کیا اور جاتے وقت نپولین کی طرف سے رات کے کھانے کی دعوت دی۔ دعوت میں چونکہ کاؤنٹ ویلوسکی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا اس لیے میری نے شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ مگر اس موقع پر اس کے خاوند نے کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے تنہا ہی دعوت میں شریک ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس دعوت کا سب سے مضحکہ خیز پہلو یہ تھا کہ دعوت کا اہتمام شہزادے کی بہن نے کیا تھا۔ گویا ہمہ خانہ آفتاب است۔ بھائی تو بے غیرت تھا ہی بہن دو قدم اس سے آگے نکلی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہر شخص ذاتی مفاد کی خاطر ذلیل ترین حرکت کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اسے اپنے خلاف ہونے والی سازش میں شریک ہر شخصیت کا اصلی روپ نظر آ گیا۔ اس

نے تہیہ کرلیا کہ آئندہ نہ تو سیاست میں حصہ لے گی اور نہ ہی اعلیٰ خاندانوں کے فرد سے کوئی تعلق رکھے گی۔

وہ ابھی بہت بھولی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ نپولین نے اس دعوت کے دوران اس کی طرف توجہ کیوں نہیں دی اور پروٹوکول کے آداب کو پوری طرح سے کیوں ملحوظ رکھا ہے۔

دوسرے دن پھر اسے نپولین کا خط ملا۔

''میری! کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟ تمہاری بے رخی نے میرے جذبہء شوق کو تیز تر کر دیا ہے اور میں تم سے محبت کرنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔''

اسے نپولین کی ڈھٹائی پر غصہ تو بہت آیا لیکن خود کو کمزور اور بے بس پا کر خاموش رہی۔

نپولین کے لیے بھی زندگی میں یہ پہلا تلخ تجربہ تھا کہ کسی عورت نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھتے ہوئے ٹھکرا دیا تھا۔ جبکہ شاہی خاندانوں کی خواتین بھی اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خود مواقع فراہم کرتی رہی تھیں۔ میری کی بے رخی اور متکبرانہ رویے سے شہزادہ پونیا ٹوسکی کو سب سے زیادہ پریشانی تھی۔ اس نے خوبصورت میری کو استعمال کر کے فائدہ اٹھانے کے لیے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ مگر اب بنا بنایا کھیل بگڑ رہا تھا۔ اس نے مجبور ہو کر چند قابل اعتماد دوستوں سے مشورہ کر کے میری کو کھانے کی دعوت دی اور خوشامد اور چاپلوسی کا ہر حربہ استعمال کرتے ہوئے اسے ''شریفانہ قربانی'' دینے کی استدعا کی اور سمجھایا کہ جس طرح ملک کی آزادی کے لیے قوم کے سپوت میدان جنگ میں اپنی جانیں قربان کرتے ہیں اسی طرح وہ اپنی عصمت کی قربانی دے کر ملک اور قوم کی خدمت سرانجام دے سکتی ہے۔

اس طرح میری پر ہر طرف سے دباؤ بڑھتا گیا۔ وہ حیران اور پریشان تھی کہ کیا کرے

ور کدھر جائے کس سے مدد طلب کرے- اس کا حسن ہی تباہی و بربادی کا سبب بن رہا تھا-
سے پیشتر اس کی ماں اور بھائی نے اسے بوڑھے کاؤنٹ کے ہاتھ فروخت کر کے منہ
نگے دام وصول کیے تھے اور اس کی قوم کے قابل صد احترام رہنما اس کے حسن و جوانی کا
سودا کرنے کے درپے ہو گئے تھے- وہ ابھی کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ نپولین کا تازہ خط
وصول ہوا جس میں لکھا تھا-

''تمہاری نظر التفات کے بعد مجھے تمہاری قوم اور ملک سے بھی محبت ہو جائے گی-''

اس جملے کو پڑھ کر میری کانپ اٹھی- کیا اس کی قوم اتنی بے غیرت ہو چکی ہے کہ اپنی
ں سے عصمت کی قربانی کی طلبگار ہے- اس کے ہم وطن ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر چکے
ں کہ اپنی عزت کو برسر عام نیلام کر دیں- یہ باتیں سوچ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے-
ے سب سے زیادہ غصہ شہزادہ پونیاٹوسکی پر آ رہا تھا- جو اس کے خلاف سازش کرنے والے
روہ کا سرغنہ اور مرکزی کردار تھا- وہ جتنا بھی سوچتی اتنا ہی زیادہ پریشان ہوتی- اس کی سمجھ
ں نہیں آ رہا تھا کہ وہ قوم اور ملک کے ان نام نہاد غم خواروں، محسنوں، سیاست دانوں، مذہب
ے جانثاروں، قابل احترام ہستیوں اور برتر خاندانوں کے اعلیٰ و ارفع افراد سے کیونکر نجات
ئے جو قوم کی بیٹی کو جنسی بھیڑیے کے سامنے پھینکنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے
ں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور ہر شخص ذلت کا یہ سہرا اپنے سر باندھنے کے لیے
طرب و بے چین ہو رہا ہے-

ایک ہفتہ گزر گیا- میری نے نپولین کے کسی ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا اور گھر میں
بیٹھی رہی جبکہ نپولین ماہی بے آب کی طرح تڑپتا رہا اور میری کی فرقت میں اس کی یہ
ت ہو گئی تھی کہ چند انتہائی اہم نوعیت کے قومی و سیاسی معاملات کے علاوہ اس نے کوئی
م نہیں کیا- اس دوران بارہا اپنے افسروں پر بھی اس نے غصہ اتارا لیکن چین نہ آیا-

آخر شہزادہ اور اس کے ساتھی اپنی ذلیل کوششوں میں کامیاب ہو گئے- انہوں میری کو گھیر گھار کر نپولین کی خوابگاہ میں پہنچا ہی دیا- وہ روتی رہی مگر قوم کے غم خوا ہمدردوں اور قابل صد احترام ہستیوں کو رحم نہ آیا- ان کی قومی حمیت ختم ہو چکی تھی- ضمیر تھے اور غیرت کو مفاد پرستی دیمک کی طرح چاٹ چکی تھی- البتہ نپولین کا دل پسیج گیا اور کو روتے دیکھ کر اس کی آواز بھی بھرا چکی گئی- ایسا شخص جس کے نام سے سارا یورپ کانپ تھا وہ ایک بے بس اور مجبور لڑکی کے سامنے خود کو انتہائی کمزور انسان محسوس کر رہا تھا- اس تین گھنٹے کی ملاقات کے دوران سارا وقت اپنی روتی ہوئی محبوبہ کو دلاسہ دینے اور دلج کرنے میں گزار دیا مگر وہ جس طرح روتی ہوئی اس کے خلوت کدہ میں داخل ہوئی تھی طرح دبی دبی سسکیوں اور ہچکیوں میں لپٹی لپٹائی دوسری ملاقات میں پولینڈ کے معاملات گفتگو کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی- نہ اپنے گھاؤ دکھلائے اور نہ نپولین کے دل کی با سنی-

اس کے لیے یہ بڑا ہی کٹھن وقت تھا- کوئی ہمدرد اور غمخوار نہ تھا جس کو اپنے دکھڑ سناتی- آخر ہر طرف سے مایوس ہو کر اس نے گھر ہی سے نہیں ملک سے بھاگ جانے کا فیۂ کیا- فرانس ہی اس کے لیے بہترین جائے پناہ ہو سکتا تھا- جہاں وہ گمنامی کی زندگی اطمینٔ سے گزار سکتی تھی- اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے تمام زیورات' ہیر جواہرات' نقدی اور چند جوڑے کپڑوں کے لیے اور رات کی خاموشی میں گھر سے نکل کھ ہوئی-

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ اس نے دیکھا ایک بچہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبہ بھوک سے نڈھال سڑک کے کنارے پڑی ہوئی گندگی میں سے کھانے کی چیزیں اٹھا کر رہا تھا- بچے کی یہ حالت دیکھ کر وہ کانپ گئی- اس کی قوم ننگی ہی نہیں بھوکی بھی ہے- اسے ا

ستم رسیدہ ننگی اور بھوکی قوم کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ پولینڈ کو اس کی ضرورت ہے۔ ننگی اور بھوکی قوم اس سے قربانی کی طلبگار ہے۔ مگر عزت وعصمت کی قربانی؟ اسے یہ قربانی دینا ہی پڑے گی۔

اس ذہنی اور جذباتی کشمکش میں وہ اپنے گھر لوٹ کر جانے کی بجائے شاہی محل میں جا پہنچی۔ نپولین گزشتہ دو گھنٹوں سے اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ وہ میری کو دیکھ کر بہت خوش ہوا مگر ایک نظر التفات کے لیے وہ پولینڈ کا سودا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے میری کو سمجھایا کہ پولینڈ اپنی آزادی کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہ اس کی آزادی کو پامال کر کے دوبارہ قبضہ کر لیں گے۔ اس موضوع پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ میری ناتجربہ کار اور ناپختہ ذہن کی لڑکی تھی۔ اس کے پاس نپولین کی مدلل گفتگو اور اعتراضات کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ وہ مادر وطن سے جذباتی وابستگی کی بنیاد پر آزادی کی خواہاں تھی۔ آخر نپولین نے اس کی کج بحثی سے تنگ آ کر جھنجھلاہٹ میں کہا۔

> ''ہر شخص مجھ سے کچھ نہ کچھ طلب کر رہا ہے جبکہ کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو مجھ کو کچھ دینے کے لیے تیار ہو حتیٰ کہ تم بھی مجھ سے غیروں کا سلوک روا رکھے ہوئے ہو۔''

میری نے بالآخر شکست قبول کر کے اپنی عزیز ترین متاع کو مادر وطن کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔

اب وہ شہنشاہ معظم کے ساتھ محل میں رہنے لگی۔ اس کی حالت ایسے مردے کی سی تھی جسے اطلس وکمخواب کا کفن پہنا دیا جائے یا تابوت میں سونے کی کیلیں گاڑ دی جائیں۔ وہ خود کو دنیا کی سب سے زیادہ مظلوم اور حرماں نصیب عورت سمجھتی تھی۔ جس کا کوئی بھی مونس وغم

خوار نہ تھا- اس نے اپنی داستان الم ماں کو لکھتے ہوئے کہا کہ آئندہ میڈم ڈی وایوبان اور الزبتھ سے قطع تعلق کر لے- اس کے ہم وطنوں کو بھی آگاہ کر دے کہ ملک وقوم کے رہنماؤں اور قابل احترام ہستیوں نے اپنے اقتدار کی خاطر ایک اجنبی فاتح شہنشاہ کے حضور قوم کی عصمت کا خراج پیش کیا ہے- چونکہ وہ بد دیانت اور بے وفا نہیں تھی اس لیے اس نے ماں کو یہ بھی تاکید کی کہ وہ اس کے خاوند کو حقیقت سے باخبر کر دے- نپولین کے عشق کی پیاس ابھی نہیں بجھی تھی کہ اسے روس کے بالٹک پر حملہ کرنے کی اطلاع ملی اور مجبوراً دشمن کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے اسے پولینڈ سے جانا پڑا- میری سے رخصت ہوتے وقت اس نے شہزادہ پونیاٹووسکی اور گرانڈ مارشل ڈیوراک کو اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھنے کی خاص طور پر ہدایات دیں-

کاؤنٹ ویلوسکی کو شہزادے کی یہ حرکات سخت ناگوار گزریں لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو رہا- میری کو طلاق دینے میں بھی اس کی رسوائی اور بدنامی تھی- لہٰذا حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر علیحدگی اختیار کرنے ہی میں عافیت جانی-

ان تباہ کن حالات میں نپولین پولینڈ سے جانے کے بعد میری کے لیے ماں کے گھر کے علاوہ سر چھپانے کی بھی کوئی اور جگہ نہیں تھی- کچھ دن ماں کے ساتھ رہنے کے بعد دونوں ماں بیٹی سیر و تفریح کے لیے روم چلی گئیں- وہیں انہوں نے روسی فوج کی عبرتناک شکست کی خبر سنی اور نپولین کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیزی سے وارسا پہنچیں- نپولین ابھی اپنی مہم سے نہیں لوٹا تھا- اس لیے وہ ماں کے ہمراہ اپنی جاگیر پر کیرونوریا چلی گئیں- میری نپولین کی واپسی تک وہیں آرام کرنا چاہتی تھی لیکن اسے وہاں بھی سکون نصیب نہ ہوا- دوسرے ہی دن الزبتھ اپنی روٹھی ہوئی سہیلی کو منانے اور تعلقات کی تجدید کرنے کے لیے جنرل زاین چیک کو ساتھ لے کر آن دھمکی- اس نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے لاکھ جواز پیش کیے، ہزار

منتیں کیں لیکن میری نے اس کی کوئی بھی بات سننے سے انکار کر دیا- جنرل چیک نے جب اپنی داشتہ کی حمایت میں صفائی پیش کرنا چاہی تو میری نے بڑی سختی سے اسے ڈانٹ دیا- میری کو بخوبی علم تھا کہ اس کے خلاف سازش میں سب سے زیادہ حصہ الزبتھ ہی نے لیا تھا اور اسے نپولین کی آغوش محبت میں پہنچانے والی بھی وہی تھی-

آخر میں جنرل چیک نے میری سے استدعا کی کہ وہ نپولین سے سفارش کر کے اسے اپنی چھ ہزار فوج کے ساتھ دشمن کے خلاف لڑنے کی اجازت دلوا دے- جنرل نے میری کو قائل کر دیا کہ روس کی یہ شکست عارضی ہے اور وہ بہت جلد تیاری کر کے میدان جنگ گرم کرے گا-

میری کو جنرل چیک اور ملکی سیاست سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ وہ جنرل کی سفارش کرنا چاہتی تھی- لیکن نپولین کے پاس جانے کا معقول بہانہ اس کے پاس آ گیا اور وہ پرشیا روانہ ہو گئی- نپولین کو اور کیا چاہیے تھا- وہ دن بھر کام میں مصروف رہنے کے بعد سر شام ہی میری کے کمرے میں آ جاتا دونوں اکٹھے کھانا کھاتے اور وہ رات بھی اسی کے پاس رہتا- اس کی زندگی میں داخل ہونے والی میری پہلی عورت تھی جس نے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی تھی- وہ نپولین سے صرف پولینڈ کی آزادی کی بھیک مانگتی- اس کی اس خوبی اور بے لوث محبت کی وجہ سے نپولین اسے دل و جان سے چاہنے لگا تھا اور بہت زیادہ احترام کرتا تھا-

عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے- نپولین کی بیوی جوزفین کو بھی اپنے نامور خاوند کے تازہ معاشقے کا علم ہو گیا تھا اور وہ ہر خط میں نپولین کے پاس آنے کی اجازت طلب کرتی تھی- نپولین اسے مختلف حیلوں بہانوں سے ٹالتا رہا کیونکہ وہ ان دنوں بڑی سنجیدگی سے جوزفین کو طلاق دے کر نئی شادی کرنے پر غور کر رہا تھا- جوزفین کا قصور محض یہ تھا کہ وہ نپولین کے ایک بھی بچے کی ماں نہیں بن سکتی تھی- جبکہ پہلے خاوند سے اس کی دو بیٹیاں تھیں-

ابتدا میں تو نپولین کے بارے میں افواہیں اڑتی رہیں لیکن جب ایک داشتہ کے بطن سے اس کا بیٹا پیدا ہوا تو تمام شکوک از خود ختم ہو گئے اور یہ بات پایہء ثبوت کو پہنچ گئی کہ نپولین ہر طرح سے تندرست اور صحت مند ہے- اسے پریشانی اس بات پر تھی کہ اس کا کوئی وارث نہیں جبکہ داشتہ کے بطن سے پیدا ہونے والا بیٹا وراثت کے تمام حقوق سے محروم تھا- اس نے میری سے شادی کرنے کے متعلق بھی سوچا کہ اگر اس دوران وہ حاملہ ہو گئی تو اس سے شادی کر لے گا مگر اسے میری کی بدقسمتی ہی کہنا چاہیے- وہ ایک مہینے تک نپولین کے ساتھ رہنے کے باوجود حاملہ نہ ہوئی اور اسی دوران نپولین کو ایک مرتبہ پھر روسی فوج کی سرکوبی کے لیے جانا پڑا- مزید برآں نپولین اپنی شادی سے سیاسی فائدہ بھی اٹھانا چاہتا تھا-

میری کیرونوز یا آ کر نپولین کی واپسی کا انتظار کرنے لگی- لیکن وہ نہ تو خود آیا اور نہ ہی اسے اپنے پاس بلایا حتیٰ کہ چھ مہینے بعد روس کے خلاف فوجی مہم سے فارغ ہو کر سیدھا پیرس چلا گیا- اس کے رویے میں نمایاں ہونے والی تبدیلی کو میری نے بھی محسوس کیا لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی- اس کی زندگی اور مستقبل تباہ ہو چکا تھا- کوئی گھر تھا نہ ٹھکانہ- اس کا خاوند کاؤنٹ ویلوسکی اب کسی بھی صورت اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تیار نہ تھا اور نپولین نے اس کے حسن جوانی کی بہاریں لوٹنے کے بعد لاتعلقی اختیار کر لی تھی- اس آڑے وقت میں جب اس کا کوئی پرسان حال نہیں تھا تو فرانسیسی کرنل اورنانو ہی واحد شخص تھا جس نے ہمدردی کا اظہار کیا- میری بھی اس میں دلچسپی لینے لگی لیکن پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی کہ جنوری ۱۸۰۸ء میں وہ پیرس چلی گئی- نپولین کو جب اس کی آمد کا علم ہوا تو رہائش کے لیے اسی محلے اور اسی گلی میں مکان خرید دیا جہاں کسی وقت جوزفین رہائش پذیر تھی اور ان کی پہلی ملاقات بھی ہوئی تھی- میری کہ ہر طرح کا آرام و آسائش میسر تھی لیکن اسے پیرس کی شوخ وشنگ اور ہنگامہ پرور زندگی پسند نہ آئی- وہ اپنا بیشتر وقت گھر پر ہی گزارتی- اسے دیکھ کر نپولین کے دل میں خفتہ

جاگ اٹھی اور اپنی فرصت کے اوقات میری کے پاس گزارنے لگا۔ نپولین کے بارے یہ بات مشہور عام تھی کہ عورت کے معاملے میں وہ انتہائی خودغرض اور بے اصول واقع ہوا اور جوزفین کے علاوہ دنیا کی کوئی عورت اس پر اثر انداز نہ ہوسکی تھی لیکن لوگوں کو اس وقت پنی رائے تبدیل کرنا پڑی جب نپولین نے اپنے تمام جرنیلوں اور سیاسی مشیروں کے شدید ختلاف کے باوجود میری کی خواہش پر پولینڈ میں ایک چھوٹی سی خودمختار ریاست قائم کرنے آمادگی ظاہر کردی۔ یہ ریاست براہ راست حکومت فرانس کے ماتحت رہتے ہوئے اندرونی ور پر مکمل خودمختار اور آزاد ہوتی۔ وہاں کے باشندوں کو تمام شہری حقوق حاصل ہوتے اپنی لیس اور مختصر سی فوج رکھنے کی بھی آزادی ہوتی۔

میری کو اپنی اس کامیابی پر بے حد خوشی تھی لیکن وہ تو سارے پولینڈ کو اپنی آزادی کو قرار رکھنے کی تمنائی تھی۔

اپریل کے مہینے میں نپولین کو ہسپانوی تنازعہ کو حل کرنے کی خاطر شاہ بوربون کو تخت سے اتار کر اپنے بھائی جوزف بوناپارٹ کو اس کی جگہ بٹھانے کے لیے جانا پڑا۔ اس مہم میں چونکہ جوزفین اس کے ہمراہ جا رہی تھی اس لیے مجبوراً میری کو پیرس ہی میں رہنا پڑا اور دو ہفتوں کے بعد وہ بھی وارسا چلی گئی۔

۱۸۰۹ء کے اوائل میں آسٹریا نے پولینڈ پر حملہ کردیا اور اس کی فوجیں وارسا میں داخل ہوگئیں۔ نپولین کو آسٹریا کی سرکوبی کے لیے ایک بار پھر پولینڈ کی آزادی اور شہزادہ پونیا ووسکی کی مدد کو آنا پڑا جو ملک کے جنوبی حصے میں آسٹریا کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ آسٹریا کے لیے بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا مشکل ہوگیا۔ شہزادے نے اپنی مختصر سی فوج کے ساتھ گوریلا جنگ میں کامیابی حاصل کر کے کراکاؤ کی اہم چوکی پر قبضہ کرلیا۔ دوسری جانب نپولین نے ویانا پر قبضہ کر کے شن برن میں ہیڈکوارٹر قائم کیا اور واگرام کی جنگ میں

آسٹریا کو شکست دے کر پولینڈ کو آزاد کرالیا- اس مہم سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی خوبصور داشتہ میری کی گھنیری زلفوں کے سائے میں ستانے کے لیے کیرونوزیا چلا آیا جہاں وہ بڑ بے چینی سے اس کا انتظار کررہی تھی-

تقریباً دو مہینے تک دادِعیش دینے کے بعد وہ پیرس روانہ ہوا- اس وقت جوزفین کو طلاق دے کراس نے روس کی پندرہ سالہ گراؤنڈ ڈچس شہزادی این سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا- اس کا یہ فیصلہ سیاسی مصلحت پر مبنی تھا- تاکہ دونوں ممالک کے درمیان جنگ کے امکانات کو ختم کیا جائے اور امن قائم ہو- میری اس کے ارادوں سے قطعی طور پر بے خبر تھی- اسے سب سے پہلے شہزادہ پونیاٹووسکی نے آگاہ کرتے ہوئے پیرس جانے کا مشورہ دیا تاکہ وہ نپولین کو اس کے ارادوں سے باز رکھے لیکن میری نے شہزادے کی بات یہ کہہ کر مسترد کردی کہ مادروطن کے لیے جو قربانی دی جاسکتی تھی اور جو کچھ اس کے بس میں تھا وہ کرچکی ہے اور مزید کچھ نہیں کرسکتی- درحقیقت اس کے انکار کرنے کی سب سے بڑی وجہ اس کا حاملہ ہونا تھا اور وہ یہ دن خاموشی اور سکون سے گزارنا چاہتی تھی-

اس طرح مزید دو مہینے گزر گئے اور پھر اچانک ایک دن اسے اپنے خاوند کاؤنٹ ویلوسکی کا خط ملا جس میں اسے گھر آکر رہائش اختیار کرنے کی پیشکش کی تھی- ہر طرف سے مایوس ہوکر میری نے دوستوں سے مشورہ کیا اور خاموشی سے گھر بیٹھے رہنے کی بجائے سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا شروع کیا- اس کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور چند ہی دنوں بعد ایک پارٹی میں نپولین سے ملاقات ہوگئی اور اس نے کاؤنٹس ویلوسکی کی حیثیت سے اس کا تعارف اپنی بیوی ملکہ کا میری سے کرایا- ملکہ پہلے ہی سے میری ویلوسکی کے بارے میں سب کچھ جانتی تھی- اس لیے اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی- میری کو اپنی ناقدری پر بہت دکھ ہوا لیکن اس کی حیثیت ہی کیا تھی- نپولین نے اسے نہ کاؤنٹیس ویلوسکی ہی رہنے دیا تھا اور نہ ملکہ بنایا-

اس کا قیامت خیز حسن ہی اس کی تباہی کا سبب بنا تھا-

اس ملاقات کے چند دن گزارنے کے بعد ایک دن اسے نپولین نے اپنے آنے کی اطلاع دی اور پیغام بھیجا کہ اس کی آمد کے دن وہ گھر میں کسی ملازم کو نہ رہنے دے اور تمام ملازمین کو کسی بہانے رخصت دے دے- یہ پہلا موقع تھا جب نپولین نے اپنے دس ماہ کے بیٹے کو پہلی مرتبہ دیکھا- پیار کیا اور تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد چلا گیا- اس کے رویے میں تبدیلی اور روکھے پن سے میری سمجھ گئی کہ آئندہ کے لیے ان کے تعلقات ختم ہو گئے ہیں- دو ہفتے بعد نپولین دوسری مرتبہ اس سے ملنے کے لیے آیا اور لگی لپٹی کے بغیر تعلقات ختم کرنے کا کہہ دیا- میری وارسا جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ نپولین نے شہنشاہ فرانس کی حیثیت میں اسے طلب کر کے پولینڈ کی سیاسی صورت حال معلوم کی اور مستقبل میں اسے وہاں کے حالات سے باخبر رکھنے کو کہا- میری اس کا اشارہ سمجھ کر فوراً وارسا چلی گئی-

اس پیشکش سے وہ معاملے کی تہہ کو پہنچ گئی کہ کاؤنٹ نے نپولین کے حکم کی تعمیل کی ہے تا کہ بچے کی پیدائش پر لوگوں کو چہ میگوئیاں کرنے کا موقع نہ ملے- میری نے بھی حالات کا جائزہ لینے اور غور کرنے کے بعد اپنے خاوند کی پیشکش قبول کر لی لیکن اپنے ہی گھر آنے سے پیشتر تمام پرانے ملازموں کو برطرف کر کے نئے ملازم رکھے جو اس کے ماضی سے قطعی طور پر بے خبر اور لاعلم تھے- نیز اس نے اپنے گھر آنے کے بعد بھی کسی سے میل ملاپ نہیں رکھا- انہی دنوں روس کے بادشاہ نے نپولین کی درخواست کو حقارت سے مسترد کر کے اس کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا- تمام یورپین ممالک چونکہ فرانس کے خلاف متحد ہو چکے تھے اس لیے نپولین کسی نہ کسی ملک کی حمایت حاصل کرنے کا خواہاں تھا- اس نے روس کی طرف سے مایوس ہو کر آسٹریا سے رجوع کیا اور گرانڈ ڈچس میری سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گیا-

میری ویلوسکی کے مقدر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ نپولین کی شادی کے چند دن بعد چار مئی ۱۸۱۰ء کو اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا اور کاؤنٹ ویلوسکی کو لڑکے کا باپ کہلانا پڑا- اس دوران میری کو ہر روز نپولین کے خط ملتے جن میں وہ اس کی خیریت دریافت کرتا رہا لیکن لڑکے کی پیدائش کے فوراً ہی بعد یک لخت خط و کتابت کا سلسلہ بند ہو گیا جس کی وجہ سے میری سخت پریشان ہوئی اور صحت یاب ہوتے ہی پیرس پہنچ گئی- اس نے نپولین سے ملاقات کرنے کی بہت کوشش کی مگر گرانڈ مارشل ڈیوراک نے ہمیشہ نپولین کی مصروفیات کا بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا-

یہی وہ دن تھے جب نپولین نے آخری مرتبہ روس کے خلاف فوج کشی کی اور یہ جنگ اس کی سیاسی موت اور اقتدار سے محرومی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی- روسی افواج نے ہر محاذ پر فرانسیسی فوج کو شکست دے کر پولینڈ تک پیچھے دھکیل دیا- پولینڈ آتے ہی اس نے کاؤنٹ ویلوسکی کے گھر رات بسر کرنے کی اطلاع بھیجی- اس کا کاؤنٹ کے گھر آنا بظاہر بہت بڑا اعزاز اور عزت افزائی تھی مگر عمائدین سلطنت واقف راز ہونے کی وجہ سے نپولین کے اصل مقصد کو سمجھتے تھے- اس ملاقات میں اپنے بیٹے الگزنڈر کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور میری کو پیرس آنے کو کہا تاکہ الگزنڈر کو کاؤنٹ کا خطاب اور جاگیر دے-

میری اپنے حالات اور اس کی پیشکش پر غور کر کے اس نتیجے پر پہنچی کہ اب وہ پولینڈ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی لہٰذا اسے اپنے بیٹے الگزنڈر اور اپنے مستقبل کی فکر کرنا چاہیے- پولینڈ میں اس کے لیے رکھا ہی کیا ہے- نہ گھر ہے نہ گھاٹ- کاؤنٹ ویلوسکی قانونی اعتبار سے اس کا خاوند ضرور ہے جبکہ حقیقت میں ان کے تعلقات ختم ہو چکے ہیں-

اس مرتبہ پیرس میں آنے کے بعد دربار میں اکثر نپولین سے ملاقات ہو جاتی اور گاہے گاہے ملکہ کے نیاز بھی حاصل ہو جاتے- اس نے ایک دن ملکہ میری کے بطن سے پیدا ہونے

لے نپولین کے بیٹے اور روم کے کم سن بادشاہ کو بھی محل میں کھیلتے دیکھا- نپولین کی اس سے
پناہ محبت کو دیکھ کر میری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے- الگزنڈر بھی تو نپولین کا بیٹا ہے مگر
پ کی محبت اور ہر جائز حق سے محروم-

کربناک حقیقت کے احساس سے میری کو سخت ذہنی اذیت پہنچی اور اس نے اپنی بھٹکی
ئی زندگی کو صحیح ڈگر پر لانے کے لیے اور نانو سے تعلقات بڑھا لیے- یہ وہی اور نانو تھا جو
رسا میں قیام کے دوران کرنل تھا اور میری سے محبت کرنے کے باوجود نپولین کی وجہ سے
بھی اپنے دل کی بات زبان تک نہ لا سکا تھا- جبکہ میری بھی اس کے جذبات واحساسات
سے بے خبر نہیں تھی اور اب کئی سال گزرنے کے بعد وہ جنرل کے عہدے پر ترقی پا چکا تھا-

کچھ ہی عرصے بعد نپولین کو اپنی زندگی کی آخری جنگ لڑنے کے لیے میدان میں کودنا
اجو اس کے لیے مکمل تباہی کا باعث ثابت ہوئی اور اسے تاج وتخت سے بھی محروم ہو کر قید
نا پڑا- اس جنگ میں جب وہ گرفتار ہو کر فونٹین بلیو میں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے
لیے ایلبا میں جہاز کی آمد کا انتظار کر رہا تھا- میری اس سے ملنے کے لیے آئی مگر ساری رات
ں کے کمرے کے باہر بیٹھی رہنے کے بعد بے نیل مرام اور مایوس واپس آنا پڑا- دوسرے
ن جب نپولین کو اس کے لوٹ جانے کی اطلاع ملی تو اس نے دلی افسوس کا اظہار کرتے
ئے خط لکھنے کا وعدہ کیا-

میری نے خط میں اپنی پریشانیوں اور مشکلات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس کا
ڑھا خاوند کاؤنٹ ویلوسکی شدید علیل ہے- اس نے الگزنڈر کو اٹلی میں جو جاگیر دی تھی اس کو
پلز کے بادشاہ نے بحق سرکار ضبط کر لیا ہے اور نہیں معلوم کہ آنے والے دنوں میں اس پر کیا
مصیبت نازل ہونے والی ہے- فرانس کے سابق شہنشاہ نپولین نے جواب میں اس کی
ہوئی کی اور تسلی دی کہ اگر الیگزنڈر اس سے ملنا چاہے تو وہ بڑی بے چینی سے ان کا انتظار کر

رہا ہے۔

اس وقت میری ملاقات کے لیے نہ جا سکی کیونکہ وہ اس گروپ میں شامل ہو کر کا
رہی تھی جو نپولین کی واپسی کے لیے زیر زمین بڑے ہی منظم طریقے سے جدوجہد کر رہا
اس کے علاوہ اپنے بیٹے الیگزنڈر' بھائی بہن اور چند ذاتی ملازموں کے ساتھ قیام کیا۔ ا۔
اس بات پر سخت تعجب ہوا کہ نپولین انتہائی مطمئن اور خوش وخرم دکھائی دے رہا تھا۔ اس۔
نہ تو اپنے شاندار ماضی کو یاد کر کے آہ بھری' نہ حال کو کوسا اور نہ ہی مستقبل کے متعلق کوئی با
کی۔ اس کی ساری گفتگو کا موضوع میری اور الیگزنڈر ہی رہے۔ اس مختصر سے قیام ۔
دوران میری کو نپولین کی مالی مشکلات کا علم ہوا اور اس نے اپنے تمام زیورات اور ہیر۔
جواہرات اس کے سامنے رکھ دیے مگر اس نے کوئی ایک چیز کو بھی لینے سے انکار کرتے ہو۔
میری کو بڑی سختی سے ڈانٹ دیا۔ اس دوران میری کے ساتھ اس کا رویہ بھی انتہائی محتاط
کیونکہ وہ اپنی بیوی ملکہ میری لوئیس اور بیٹے کو اپنے پاس بلانے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی ا
بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کی بیوی کو شکایت اور ناراضگی کا موقع ملتا اور وہ اس ۔
پاس آنے سے انکار کر دیتی۔

میری کو نپولین کے روکھے پن پر بہت دکھ ہوا۔ لیکن اس کی بے لوث محبت اور وفادا
میں ذرا برابر بھی فرق نہیں آیا۔ ایلبا سے واپسی پر اس نے الیگزنڈر کی جاگیر کے لیے
نپولین کی واپسی کے لیے پہلے سے بھی زیادہ جوش' سرگرمی اور مستعدی سے جدوجہد
شروع کر دی اور بہت جلد وہ جاگیر کو بحال کرانے میں کامیاب ہو گئی۔ گیارہ مہینے کی جلاو
کے دن گزارنے کے بعد نپولین بھی فرانس میں آ گیا۔ فرانس کے باشندے اور فوج
حمایت حاصل ہونے پر وہ دوبارہ برسراقتدار آ گیا لیکن سیاسی' فوجی اور انتظامی مصروفیات
بنا پر ملاقات کا وقت نہ نکال سکا۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی اور خطرہ برطانوی حکومت

طرف سے تھا جس نے اس کے فرانس پہنچنے کی اطلاع ملتے ہی کارروائی کر کے ڈیوک آف
وَ ٗ ٠ کی کمان میں فوج بلجیم پہنچا دی جبکہ مدد کے لیے پرشیا کی فوج بھی آ رہی تھی۔ نپولین نے
جنگ سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر برطانوی حکومت اسے مہلت دے کر مستقبل کے لیے
خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

مجبوراً نپولین کو متحدہ دشمن کے خلاف میدان میں آنا پڑا۔ یہ جنگ تاریخ میں وائرلو کی
نگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں نپولین کو شکست ہوئی اور وہ بڑی مشکل سے جان بچا
کر پیرس پہنچا۔ اس مرتبہ میری اپنے بیٹے الیگزنڈر کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے کے
لیے گئی وہ مصروفیت کی وجہ سے زیادہ وقت نہ دے سکا اور ان کی یہ ملاقات چند ہی منٹ میں
تم ہو گئی۔ دوسرے دن نپولین نے اقتدار سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا اور سرکاری
ہائش گاہ سے اپنی مرحوم بیوی جوزفین کے مکان میں منتقل ہو گیا۔

اس کی اقتدار سے دستبرداری کا اعلان سنتے ہی میری اس کے پاس پہنچی۔ اس نے
ری کو بتایا کہ اس نے ہمیشہ کے لیے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی۔ بصورت دیگر فرانس
ا سرزمین خون میں نہا جائے گی اور وہ ذاتی اقتدار کے لیے قوم کے سپوتوں کا خون نہیں بہانا
ہتا۔

اس ملاقات سے چند دن بعد نپولین نے کسی مزاحمت کے بغیر خود کو برطانوی حکومت
ے حوالے کر دیا اور حکومت برطانیہ نے اسے سینٹ ہلنیا کے غیر آباد جزیرے پر جلاوطن کر
بھیج دیا۔

میری کو زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی کم مائیگی اور تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ غیر تو
تھے ہی۔ اپنوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ اس برے اور کٹھن وقت میں جنرل اورنانو
گے بڑھا۔ میری بھی اس کی بے لوث محبت کو نہ ٹھکرا سکی اور اپنی زندگی کے منہدم کھنڈروں پر

نئی عمارت تعمیر کرنے کی خاطر اس سے شادی کر لی۔ جنرل اور نانو اور میری بہت خوش زندگی گزار رہے تھے مگر قسمت سے اس کی خوشی نہ دیکھی گئی۔ شادی کے ایک سال بعد کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا اور وہ شدید بیمار ہوگئی۔ ڈاکٹر ہار گئے اور موت جیت گئی۔ انتیس کی چھوٹی عمر میں وہ جنرل اور نانو کو اپنی محبت کی نشانی دے کر اسے روتا ہوا تنہا چھوڑ گئی اور محبت کی تاریخ کا ایک دلکش باب ختم ہو گیا۔

خانِ خاناں

تیغ و قلم اور علم و دانش کا پیکر
دربارِ اکبری کا جوہرِ قابل

عبدالرحیم خانخاناں

جو دربارِ اکبری کا ایک گوہرِ درخشاں تھا
سیرت و سوانح کے احاطہ میں

نامور محقق و مؤرخ ڈاکٹر احمد نبی خاں
کے قلم سے

تاریخ کے ایک گم شدہ کردار کا تعارف اور برصغیر میں مغلیہ دور کے ایک اہم رُکن کے مقام کا تعین اور تاریخ کی نگاہِ بازگشت

ایک بے حد دلچسپ کردار کی جامع کردار کاری
تاریخ کا حسین ترین نقش
اور
الحق پبلشرز لاہور کا منفرد اندازِ پیشکش

(زیرِ طبع)